بورخیس کہانیاں

# بورخیس کہانیاں

(خورخے لوئیس بورخیس کی کہانیوں کا انتخاب)



انتخاب و ترجمہ:

محمد عاصم بٹ

# فہرست

# پہلی بات

بورخیس سے میری واقفیت شروع دنوں کے مطالعے کے دوران ہوئی۔ تب آغاز کیے گئے ہر کام کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے کے جنون کی اسیری شدید تھی۔

تو انھی دنوں میں بورخیس کی کہانی قرص ہاتھ لگی۔ اسے پڑھا، یہ پسند آئی تو اس کا ترجمہ کر ڈالا۔ پھر جستجو ہوئی اسے مزید پڑھنے اور ترجمہ کرنے کی۔ مختلف لائبریوں سے، جن میں صلاح الدین محمود صاحب کی ذاتی لائبریری بھی شامل تھی، بورخیس کی کہانیوں کی کتابیں حاصل کیں۔ بیس بائیس کہانیاں تب ترجمہ کیں۔ طویل عرصے کے لیے یہ تراجم نظر ثانی کے انتظار میں پڑے رہے۔ اب موقع ملا تو انھیں دیکھا اور مزید تراجم بھی ان میں شامل کیے۔

بورخیس کے سات افسانوی مجموعے پیش نظر رہے۔ فکشنز (1945)، الف (1949)، خوابوں کے شیر، خالق و مالک (1960)، ڈاکٹر برو ڈی کی رپورٹ (1970)، کتاب ریگ (1977)، شیکسپیئر کی یادداشت (1983)۔

بورخیس کی دنیا حیرت سے مملو ہے لیکن یہ اکہری دنیا نہیں ہے۔ اس میں گہرائی اور گھمبیرتا کا احساس ہوتا ہے جو دہشت طاری کرتا ہے۔ بورخیس کے تجسس میں پختگی کی چمک ہے جس سے پڑھنے والی کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ میں اس دنیا کی یاترا سے لوٹا ہوا۔ دل کی دھڑکن ابھی معمول پر نہیں آئی اور سانس کا زیر و بم ہنوز بڑھا ہوا ہے۔

دنیائے ادب میں بورخیس کو بیسویں صدی کے نہایت اہم اور غیر معمولی افسانہ نگار کے طور

پر جانا جاتا ہے۔ خود بورخیس کو اپنی شاعری کو فکشن سے برتر مقام دینا پسند تھا۔ اس نے اپنے ایک انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ وہ خود کو ایک شاعر کے طور پر متعارف کروانے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ ہم اسے ایک کہانی کار کے طور پر جانتے ہیں۔ دنیائے ادب میں اس کی شہرت کی وجہ اس کی کہانی ہی بنی۔

وہ لاطینی امریکی طلسماتی حقیقت نگاری کی روایت میں گبریئل گارسیا مارکیز کے بعد دوسرا اہم نام ہے۔ بہت کسے ہوئے معماتی پلاٹ، غیر معمولی طور پر متنوع اور وسیع تر مطالعے، تاریخ اور فلسفہ کے گہرے شعور، غیر معمولی جودت طبع اور اسطوریاتی معلوم ہونے والے پراسرار کرداروں کے ساتھ بورخیس نے فنتاسیا کی آمیزش سے ایک منفرد اور دلچسپ اسلوب اختراع کیا جس نے افسانے کو ایک یکسر نیا ذائقہ بخشا اور خاص و عام کی توجہ حاصل کی۔ یوں دورِ جدید میں جب کہ دنیا بھر میں افسانہ نگاری کا فن ایک طرح کے دھندلکے میں گم ہوتا معلوم ہو رہا ہے، بورخیس کا نام اس صنف کے اعتبار کا بہت مضبوط اور روشن حوالہ ہے۔

الٰہیات، تاریخ، سرّیت پسندی، جرم، فلسفہ، زمان و مکان کی بھول بھلیاں اور اسطوریات، بورخیس کے محبوب موضوعات ہیں۔ اس نے فرضی کتابوں، فرضی مصنفوں، فرضی مسالک، فرضی سیاروں اور فرضی خطوں پر کہانیاں لکھیں۔ اپنی ذاتی مابعدالطبیعیات اختراع کی۔ جرم اور فلسفہ کی آمیزش سے تہہ دار پلاٹ بنائے اور کرافٹ کے نئے تجربات کیے۔ ہسپانوی کے ساتھ ساتھ متعدد زبانوں میں عبور حاصل کیا۔ چالیس برس کی عمر میں بصارت سے محرومی نے بورخیس کے تخیل کو مزید گہرا کر دیا تو اس نے اپنی کہانیاں لکھوانی شروع کیں۔ اس نے اندھے پن پر بھی طویل مضامین لکھے۔

پچاس سے زائد افسانوں کے تراجم پیشِ نظر انتخاب میں شامل ہیں۔ یہ مختصر انتخاب بورخیس کے فکشن کے حجم کے اعتبار سے ناکافی ہے لیکن پھر بھی امید کی جا سکتی ہے کہ اردو میں اس سے بورخیس جیسے بڑے کہانی کار سے متعارف ہونے کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

ان تراجم کے حوالے سے دو معتبر اور قابل احترام شخصیتوں کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ صلاح الدین محمود نے اپنی لائبریری کے دروازے مجھ پر کھولے اور میں نے بورخیس کی کتابوں تک رسائی پائی۔ محمد سلیم الرحمٰن نے کمال شفقت سے ان میں سے چند کہانیوں کو ملاحظہ فرمایا، نہایت قیمتی مشورے دیے اور ترجمے کے دوران جب بھی کوئی مشکل منزل آئی، اکثر آپ کی رہنمائی نے اسے میرے لیے آسان بنایا۔

محمد عاصم بٹ

چھ اپریل دو ہزار سولہ، لاہور۔ muhammadasimbutt99@gmail.com

# قرص

میں ایک لکڑ ہارا ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرا نام کیا ہے۔ وہ جھونپڑی جہاں میں پیدا ہوا اور جہاں غالباً میں جلد ہی مر جاؤں گا، جنگل کے کنارے ایستادہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ جنگل سمندر تک پھیلا ہوا ہے جو تمام زمین پر محیط ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میرے جھونپڑے جیسے لکڑی کے کتنے ہی جھونپڑے اس سمندر میں تیرتے رہتے ہیں۔ میں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا۔ اس لیے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ ہی میں کبھی جنگل کا پرلا کنارہ دیکھ پایا ہوں۔

بچپن میں میرے بڑے بھائی نے مجھ سے قسم لی تھی کہ ہم دونوں جنگلوں کو کاٹتے رہیں گے حتی کہ ایک درخت بھی باقی نہ بچے۔ میرا بھائی مر گیا۔ میں جو کچھ تلاش کر رہا ہوں یا آئندہ تلاش کرتا رہوں گا، وہ ایک بہت مختلف شے ہے۔ اس طرف جدھر سورج غروب ہوتا ہے، ایک ندی بہتی ہے۔ اس میں اپنے ہاتھوں سے میں مچھلی شکار کرتا ہوں۔ جنگل میں بھیڑیے ہیں۔ لیکن میں بھیڑیوں سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ اپنے کلہاڑے پر مجھے بھروسہ ہے کہ یہ ہمیشہ وقت پر میرے کام آیا۔

میں نے کبھی اپنی عمر کے برسوں کا شمار نہیں کیا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں عمر رسیدہ ہوں۔ مجھے اب مزید دکھائی نہیں دیتا۔ گاؤں میں؛ جہاں اب میں نہیں جاتا مبادہ اپنا راستہ کھو بیٹھوں؛ مجھے سب 'بخیل' سمجھتے ہیں۔ لیکن مجھ جیسے لکڑ ہارے کے پاس بھلا کیا خزانہ ہو سکتا ہے، جسے

میں بچا کر رکھوں گا۔

اپنے گھر کا دروازہ میں ایک پتھر رکھ کر بند رکھتا ہوں تا کہ برف اندر نہ آنے پائے۔ ایک شام مجھے بھاری گھسٹتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک اجنبی اندر داخل ہوا۔ وہ عمر رسیدہ اور دراز قد انسان تھا' اور ایک کٹے پھٹے کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ ایک داغ اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ پیرانہ سالی نے لگتا تھا اسے ضعیف کرنے کے بجائے مزید مستحکم کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ ایک سونٹے کی مدد کے بغیر قدم اٹھانا اس کے لیے مشکل تھا۔ ہم نے چند الفاظ کا تبادلہ کیا جو مجھے اب یاد نہیں ہیں۔

پھر وہ بولا ''میں بے گھر ہوں۔ جہاں جگہ ملتی ہے سو جاتا ہوں۔ میں نے سیکسونز کی سرزمین کا عرضاً بلد اُسفر کیا ہے۔''

ان الفاظ نے اس کی کہن سالی کی تصدیق کی۔ میرا باپ اکثر سیکسون کی سرزمین کا ذکر کرتا تھا جسے اب لوگ انگلستان پکارتے ہیں۔ گھر میں کچھ مچھلی اور روٹی موجود تھی۔ کھانے کے دوران ایک لفظ بھی کسی نے نہیں بولا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔

چند کھالیں بچھا کر میں نے فرش پر، جہاں میرا بھائی مرا تھا، اس کے لیے گدا بنا دیا۔ رات ہوئی تو ہم سو گئے۔

دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا جب ہم جھونپڑے سے روانہ ہوئے۔ بارش تھم گئی تھی اور زمین تازہ برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میرے رفیق کا سونٹا اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تو اس نے مجھے سونٹا اٹھانے کا حکم دیا۔

''میں تمہارا حکم کیوں مانوں؟'' میں نے کہا۔

''کیونکہ میں ایک بادشاہ ہوں'' اس نے جواب دیا۔

مجھے لگا وہ پاگل تھا۔ بہر حال سونٹا اٹھا کر اسے تھما دیا۔ اب وہ بولا تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ''میں سیکجنز کا بادشاہ ہوں۔ کتنی ہی بار جنگوں میں اپنے لوگوں کو فتح سے ہمکنار کیا۔ لیکن ایک نجس

لمحے میں مجھ سے میری بادشاہت چھن گئی۔ میرا نام آئیسرن ہے اور میں اوڈن کی نسل میں سے ہوں۔''

''میں اوڈن کی پوجا نہیں کرتا۔ میں عیسیٰ مسیح کا عبادت گار ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولتا رہا گویا مجھے سنا ہی نہ ہو۔ ''میں نے جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ لیکن میں اب بھی بادشاہ ہوں کیونکہ میرے پاس ایک قرص ہے۔ کیا تم دیکھو گے؟''

اس نے اپنی مٹھی کھولی اور ہڈیالی ہتھیلی دکھائی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاتھ خالی تھا۔ جبھی مجھے یاد آیا کہ وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ بند رکھتا تھا۔

مجھے بغور دیکھتے ہوئے وہ بولا ''تم اسے چھو کر دیکھ سکتے ہو۔''

کچھ شک کے ساتھ میں نے انگلی کی پوروں سے اس کی ہتھیلی کو چھوا۔ مجھے وہاں کچھ سرد شے محسوس ہوئی اور چمک سی دکھائی دی۔ مٹھی فوراً ہی بند ہو گئی۔ میں کچھ نہیں بولا۔ وہ بڑے تحمل سے بات کرتا رہا جیسے کسی بچے سے مخاطب ہو۔

''یہ اوڈن کا قرص ہے''۔ اس نے کہا ''اس کا بس ایک ہی رخ ہے۔ دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کا بس ایک ہی رخ ہو۔ جب تک قرص میری تحویل میں ہے، میں بادشاہ ہوں''۔

''کیا یہ سونے کا ہے'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جانتا۔ یہ اوڈن کا قرص ہے اور اس کا بس ایک ہی رخ ہے''۔

اسی لمحہ اس قرص کو حاصل کرنے کے لالچ نے میرے اندر جنم لیا۔ اگر یہ مجھے مل جائے تو اسے سونے کے ڈلے کے عوض بیچ دوں گا۔ میں بھی بادشاہ بن جاؤں گا۔ میں نے خانہ بدوش سے کہا جس سے میں اب بھی نفرت کرتا ہوں کہ ''میرے جھونپڑے میں سکوں سے بھرا ہوا ایک صندوق مٹی میں دبا ہوا ہے۔ سونے کے سکے، میری کلہاڑی کے پھل کی طرح چمکتے ہوئے۔ اگر تم یہ قرص مجھے دے دو تو بدلے میں تمھیں صندوق دوں گا۔''

اس نے تلخی سے جواب دیا ''مجھے یہ سودا قبول نہیں۔''

''تو پھر اپنا راستہ ناپو۔'' میں نے کہا۔

اس نے میری طرف پیٹھ کی۔ اس کی گردن کی پشت پر کلہاڑی کا ایک وار اسے پچھاڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور گر گیا۔ لیکن جونہی وہ گرا اس کی مٹھی کھل گئی اور مجھے ہوا میں چمک سی لہراتی دکھائی دی۔ میں نے اس جگہ کو اپنی کلہاڑی سے نشان زد کیا اور اس کی لاش گھسیٹ کر ندی تک لایا جو بہت تیز بہہ رہی تھی۔ پھر لاش کو ندی میں پھینک دیا۔

جھونپڑے میں واپس آ کر میں نے قرص تلاش کرنے کی بہت کوشش کی۔ وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ اس بات کو برسوں بیت چکے ہیں۔ میں اسے کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکا۔

# دائروی کھنڈرات

اور اگر وہ تمہارے بارے میں خواب دیکھنا چھوڑ دے تو۔۔۔۔

(آئینے میں دیکھتے ہوئے، VI)

کسی نے اسے ایک معتدل رات میں کشتی سے اترتے نہیں دیکھا۔ نہ کسی نے بانس کی کشتی کو مقدس کیچڑ میں غرق ہوتے دیکھا۔ لیکن چند ہی دنوں میں یہ خبر ہر کسی کو ہوگئی کہ وہ کم سخن انسان جنوب کی طرف سے آیا تھا اور یہ کہ اس کا گاؤں ان لامحدود دیہاتوں میں سے ایک تھا جو دریا کے بالائی حصے میں دشوار گزار پہاڑی علاقے میں واقع تھا جہاں ژند زبان یونانی زبان سے آلودہ نہیں ہوئی تھی اور جہاں جذام کا مرض شاذ ہی پیدا ہوتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ سب سے پہلے اجنبی نے کیچڑ کو چوما۔ پھر (خاردار جھاڑیوں کو پیچھے ہٹائے یا حتیٰ کہ انھیں محسوس کیے بغیر جو اس کے گوشت کو کاٹ رہی تھیں،) کنارے تک اوپر آیا اور متلاتے ہوئے جی اور خون آلودہ جسم کے ساتھ ایک دائروی عمارت میں داخل ہوا جس کے اوپر پتھر سے بنا شیر یا گھوڑا نصب تھا، جس کا رنگ کبھی آگ کی مانند رہا ہوگا لیکن اب محض راکھ جیسا تھا۔ یہ دائروی عمارت ایک مندر تھی جو مدت پہلے آتش زدگی کے باعث تباہ ہوا۔ جنگل میں پھیلی ملیریا کی وبا نے اسے نجس کر دیا اور جس کا دیوتا مدت سے انسانوں کی طرف سے کسی بھینٹ سے محروم تھا۔ اجنبی پیر پھیلا کر مجسمے کے نیچے لیٹ گیا۔

سورج عین سر پر آیا تو وہ بیدار ہوا۔ اس نے کسی حیرت کے احساس کے بغیر اپنے زخموں کو دیکھا جو مندمل ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی زرد آنکھیں موند لیں اور سو گیا، جسمانی نقاہت کے باعث نہیں بلکہ قوت ارادی کے بل پر۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مندر اس کے ناقابل تسخیر مقصد کے عین موافق تھا۔ اسے علم تھا کہ اترائی میں ہر طرف پھیلے درخت دریا میں زیریں علاقے میں ایک اور مقدس مندر کے کھنڈر کو ڈھانپ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، جس کے دیوتا جل کر بھسم ہو چکے اور مر چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی فوری ذمہ داری یہ خوابیدگی ہی تھی۔ آدھی رات کے وقت وہ ایک پرندے کی مضطرب چیخ سے بیدار ہوا۔ ننگے پیروں کے نشانات' انجیر کے چند پھل اور پانی سے بھرا ایک برتن ظاہر کرتے تھے کہ اس کی نیند کے دوران احتیاط سے اس کی جاسوسی کی گئی تھی اور یہ کہ وہ اسکی خوشنودی کے خواہاں یا اس کے جادو سے خوف زدہ تھے۔ اس نے جسم میں خوف کی کپکپی محسوس کی۔ اس نے ایک شکستہ دیوار میں مردے دفن کرنے کا طاق تلاش کیا اور خود کو اجنبی پتوں سے ڈھانپ لیا۔

جو مقصد اسے یہاں کھینچ لایا تھا، وہ غیر ممکن نہیں تھا اگرچہ فوق الفطرت تھا۔ وہ ایک انسان کا خواب دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے معمولی ترین جزئیات کے ساتھ دیکھنا اور پھر اسے حقیقت کا روپ دینا چاہتا تھا۔ اس جادوئی منصوبہ نے اس کی روح کو معمور کر رکھا تھا۔ اگر اس سے اس کے نام یا ماضی سے متعلق کوئی سوال کیا جاتا تو وہ جواب نہ دے پاتا۔ یہ غیر آباد اور شکستہ حال مندر اس کی ضرورت کے موافق تھا۔ یہ مرئی دنیا سے بالکل کٹا ہوا تھا۔ دیہاتیوں کی قربت بھی فائدہ مند تھی کہ وہ اس کی جسمانی احتیاجات کی آسودگی کا اہتمام کریں گے۔ چاول اور پھلوں کی بھینٹ اس کے جسم کی بقا کے لیے کافی تھی جو سونے اور خواب دیکھنے کے واحد وظیفہ کے لیے وقف تھا۔

شروع میں اس کے خواب منتشر تھے۔ پھر وہ جدلیاتی ہیئت اختیار کر گئے۔ اجنبی نے خواب دیکھا کہ وہ ایک دائروی تماشہ گاہ کے مرکز میں موجود تھا جو کسی طور یہی سوختہ مندر تھا۔ خاموش طالب علموں کے جمگھٹ سے سارا میدان بھرا ہوا تھا۔ آخری قطاروں میں بیٹھے ہوؤں کے چہرے

کئی صدیوں کے فاصلوں اور کائناتی بلندیوں پر موجود تھے لیکن اس کے باوجود وہ بالکل صاف اور واضح دکھائی دیتے۔ اس نے انہیں علم الابدان، احوال عالم اور جادو پر لیکچر دیا۔ ان شبیہوں نے گہرے انہماک سے اسے سنا اور پوری تفہیم کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی جیسے انہیں اس آزمائش کی اہمیت کا وجدان ہوگیا ہو جو ان میں سے ایک کو اس کھوکھلی موجودگی کی کیفیت سے نجات دلائے گی اور حقیقت کی دنیا میں لے آئے گی۔ اس نے خواب اور بیداری میں اپنی خیالی شبیہوں کے جوابات پر غور کیا۔ چالبازوں کے فریب میں آنے سے خود کو بچایا اور مخصوص پیچیدگیوں کے درمیان ظاہر ہونے والی ذہانت کا ادراک کیا۔ وہ ایسی روح کا متلاشی تھا جو حقیقی کائنات میں شرکت کے معیار پر پوری اتر سکے۔

نو یا دس راتوں کے بعد اسے اس تلخ حقیقت کا ادراک ہوا کہ ایسے طالب علموں سے اعلی توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتی تھیں جو اس کے نظریات پر اندھا اعتقاد رکھتے تھے۔ سوائے ان کے جنھوں نے کبھی کبھار معقول انداز میں اس سے اختلاف کیا۔ اول الذکر طالب علم ہر چند کہ سعادت مند تھے اور محبت اور شفقت کے مستحق تھے، کبھی فرد کی حیثیت سے نمو نہیں پاسکیں گے۔ جبکہ موخرالذکر جو کبھی کبھار سوال کرتے تھے، ان سے کہیں زیادہ حقیقی تھے۔

ایک سہ پہر کو (اب اس کی سہ پہریں بھی نیند کے لیے وقف تھیں۔ اب وہ علی الصبح فقط چند گھنٹوں کے لیے ہی بیدار ہوتا۔) اس نے کشادہ تخیلاتی مدرسہ کو ہمیشہ کے لیے برخاست کر دیا اور صرف ایک طالب علم کو باقی رہنے دیا۔ وہ ایک خاموش اور زرد رُو لڑکا تھا۔ وہ کبھی کبھار ہٹیلا پن بھی دکھاتا۔ اس کے تیکھے نقوش خواب دیکھنے والے شخص کے نقوش کی یاد دلاتے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے اچانک خاتمے پر مطلق حواس باختہ نہیں ہوا۔ اگلے چند اسباق کے بعد ہی اس کی سیکھنے کی استعداد نے معلم کو ششدر کر دیا۔

ایک روز وہ نیند سے بیدار ہوا تو اسے لگا جیسے کسی دلدلی صحرا سے لوٹا ہو۔ اس نے سہ پہر کی رائیگاں روشنی کو دیکھا (جسے وہ لمحہ بھر کے لیے علی الصبح کا اجالا سمجھا) اور یہی سوچا کہ شاید وہ ہنوز کسی

خواب میں تھا۔ اس رات اور اگلا سارا دن بے خوابی کے ناقابل برداشت بوجھ نے اسے گھٹن کا شکار کیا۔ وہ جنگل میں نکل گیا اس امید میں کہ شاید اس طرح خود کو تھکا پائے۔ ہیملاک کے پودوں کے درمیان وہ بمشکل نیند کے چند جھونکے حاصل کر پایا جو بنیادی نوع کے ہیولوں سے بھرے ہوئے تھے اور بے فائدہ تھے۔ اس نے مدرسہ کے منظر کو از سرِ نو استوار کیا۔ نصیحت کے چند الفاظ کہے ہوں گے کہ وہاں موجود چہرے پہلے مبہم ہوئے، دور ہٹے اور پھر تحلیل ہو گئے۔ اپنی تقریباً مسلسل بے خوابی کی کیفیت میں اس کی بوڑھی آنکھیں غصے کے آنسوؤں سے جلنے لگیں۔

اس نے سمجھ لیا کہ اس بے ربط اور چکر دار مواد کو جس سے خواب بنتے ہیں اپنی منشا کے مطابق ڈھالنا کسی بھی انسان کے لیے انتہائی دشوار کام ہے۔ خواہ وہ اعلیٰ اور کم تر درجوں کے تمام معموں کی تہہ تک پہنچ جائے۔ یہ ریت کی دستی بٹنے یا بے چہرہ ہوا کو چہرہ دینے سے بھی زیادہ دقت طلب کام تھا۔ اسے احساس تھا کہ ابتدائی ناکامی ناگزیر تھی۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ اس غیر معمولی فریب نظر کو، جس نے ابتداء میں اسے مخمصے میں ڈالا، مطلق فراموش کر دے گا۔

اس نے اپنے کام کے لیے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر عمل درآمد شروع کرے، اس نے مہینہ بھر ان قوتوں کو بحال کرنے میں صرف کیا جنھیں اس کے ذہن کی ہیجانی کیفیت نے ضائع کیا تھا۔ اس نے نیند سے پہلے خواب پر غور و فکر یکسر موقوف کر دیا اور دن کا بڑا حصہ سوئے رہنے پر خود کو جلد ہی قادر کر لیا۔ اس دوران اسے چند ایک خواب دکھائی دیے، جن پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اپنے کام کو پھر سے شروع کرنے کی خاطر اس نے چاند کا قرص مکمل ہونے کا انتظار کیا۔ شام کو دریا کے پانی میں نہا کر خود کو مطہر کیا۔ سماوی دیوتاؤں کے حضور سجدہ ریز ہوا۔ اس مقدس نام کے محترم حروف کا جاپ کیا جسے ادا کرنے کی اجازت تھی۔ پھر وہ سو گیا۔ تقریباً فوراً ہی اس نے ایک دھڑکتے ہوئے دل کا خواب دیکھا۔

اس نے خواب میں اسے متحرک، پرحدت، خفیہ دیکھا، ایک مٹھی کے حجم کا، ایک یاقوتی رنگ کی شے جو ایک انسانی جسم کے جزوی سایے میں پنہاں تھی جو بے چہرہ اور بے جنس تھا۔ گہری محبت

کے ساتھ اس نے چودہ شاندار راتیں یہ خواب دیکھا، ہر رات کہیں زیادہ واضح، کہیں زیادہ بین انداز میں۔ اس نے اسے چھوا نہیں۔ غالباً صرف اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا، اسے سنوارا۔ بہت سے زاویوں اور مختلف فاصلوں سے اس کا نظارہ کیا اور اسے بسر کیا۔ چودھویں رات کو اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے پھیپھڑے کو جاتی شریان اور پھر سارے دل کو چھوا، اندر اور باہر سے۔ اس معائنے سے وہ پر اعتماد ہو گیا۔

وہ جان بوجھ کر اگلی رات نہ سویا۔ تب پھر سے اس نے دل کو تھاما۔ ایک سیارے کا نام پکارا اور دیگر اعضائے رئیسہ کے بارے میں تصور کیا۔ ایک سال مکمل ہونے سے پہلے وہ اس کا ڈھانچہ، پلکیں تخلیق کر چکا تھا۔ سر کے بے شمار بال اگانا شاید سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ اس نے گوشت پوست کے انسان، ایک نوعمر انسان کا خواب دیکھا۔ لیکن یہ نوجوان نہ اپنی جگہ سے اٹھ سکتا تھا، نہ بول سکتا اور نہ آنکھیں کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ بے شمار راتیں وہ اسے یونہی سوئے ہوئے دیکھتا رہا۔

قدیم غنا سطی مسیحی فرقے کے نظریہ تخلیق کے مطابق خدا تعالیٰ نے سرخ مٹی گوندھ کر ایک سرخ آدم بنایا جو بغیر سہارے کے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی آدم جیسا مٹی کا ابتدائی نوعیت کا، خام اور ناپختہ آدم ہمارے جادوگر کی راتوں کی مساعی سے خلق ہونے والا انسان تھا۔ ایک سہ پہر اس نے مایوسی سے تمام محنت کو ضائع کر دینا چاہا لیکن خود کو ایسا کرنے سے روکا۔

زمین اور دریا کے دیوتاؤں کے حضور مناجات کرنے کے بعد اس نے خود کو بت کے پیروں میں گرا لیا جو غالباً ایک شیر یا گھوڑا تھا اور اس کی اعانت کے لیے منت سماجت کی۔ اسی شام غروب آفتاب کے موقع پر ایک شبیہ سے اس کے خواب معمور ہو گئے۔ خواب میں وہ ایک زندہ شے تھی، اور مرتعش بھی۔ شیر اور گھوڑے کا وحشیانہ مرکب نہیں بلکہ بیک وقت دونوں تنومند مخلوقات، اور ایک بھینسا، ایک گلاب اور ایک طوفانِ بادوباراں بھی۔ اس کثیر الجہت دیوتا نے اس پر اپنا زمینی نام 'آگ' منکشف کیا اور یہ بھی بتایا کہ دائروی مندر میں (اور ایسے ہی دیگر مندروں میں) لوگ اس کو قربانیوں کی بھینٹ دیتے اور اسے پوجتے تھے، اور یہ کہ وہ جادو کے زور پر خوابیدہ جسم کو زندہ کرنے

کی قدرت رکھتا ہے، ایسے انداز میں کہ سوائے آگ کے، سبھی مخلوقات اور خواب دیکھنے والا بھی اسے گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان تصور کرے۔

دیوتا نے جادوگر کو حکم دیا کہ وہ اپنی مخلوق کو، اپنے مسلک کے مطابق تربیت کرنے کے بعد دوسرے شکستہ مندر میں بھیج دے جس کی ہرم نما عمارت کے کھنڈرات نیچے اترائی میں موجود تھے تا کہ اس گمنام مقام پر بھی دیوتا کی عظمت میں حمد گائی جائے۔ جادوگر کے خواب میں وہ مخلوق بیدار ہوگئی۔

جادوگر نے آگ دیوتا کے احکامات کی تعمیل کی۔ اس نے ایک خاص مدت (جو دو برسوں پر مشتمل تھی) اپنے خواب کی اولاد پر کائنات اور آتش پرستی کے مسلک کی حقیقت عیاں کرنے میں صرف کی۔ اپنے باطن میں اسے لڑکے سے دور رہنے کا دکھ بھی سہنا پڑا۔ معلمانہ ضرورتوں کے بہانے ہر روز وہ اپنے خوابوں کے لیے وقف دورانیہ کو بڑھا دیتا۔ اس نے لڑکے کے داہنی کندھے کو پھر سے درست کیا (جو شاید ناقص تھا)۔ کبھی کبھار وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا کہ جیسے یہ سب کچھ پہلے بھی ہو چکا ہو۔ عموعی طور پر اس کے دن مسرور گزر رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھیں موندھتا اور سوچتا ''اب میں اپنے بیٹے کے پاس جاؤں گا'' یا کبھی سوچتا ''وہ بچہ جسے میں نے تخلیق کیا' میرا انتظار کر رہا ہوگا اور اگر میں اس کے پاس نہ گیا تو وہ فنا ہو جائے گا۔''

بتدریج اس نے لڑکے کو عالم حقیقت سے روشناس کرایا۔ ایک مرتبہ اس نے اسے حکم دیا کہ وہ کپڑے کا ایک پھریرا دور چوٹی پر لگا آئے۔ اگلے روز پھریرا پہاڑی کی چوٹی پر لہرا رہا تھا۔ اس طرح کے مزید کئی تجربات کیے، ہر تجربہ پچھلے سے زیادہ بے باکانہ۔ اس نے یہ بات قدرے ناگواری کے ساتھ جان لی کہ لڑکا ہر طرح سے تیار تھا، شاید اتاؤلا بھی تھا پیدا ہو جانے کے لیے۔

اس رات پہلی بار اس نے اسے چوما پھر دوسرے مندر کی طرف روانہ کر دیا، گھنے جنگلوں اور دلدلوں کے متعدد سلسلوں کے پار، جہاں اترائی میں اس کے کھنڈرات سورج میں بے رنگ معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے (اس لیے کہ وہ کبھی نہ جان سکے کہ وہ محض ایک غیر حقیقی پیکر ہے

اور یہ کہ خود کو دوسروں ہی کی مانند ایک انسان تصور کرے) اس نے اس میں اپنی برسوں کی ریاضت کی یادداشت محو کردی۔

کامیابی اور اطمینان کے احساس نے دنوں کی یکسانیت کی تلخی کو ماند کردیا۔ علی الصبح اور شام جھٹپٹے کے آخری لمحوں میں وہ پتھر کے بت کے آگے سجدہ ریز ہوتا، شاید یہ تصور کرتے ہوئے کہ اسکا غیر حقیقی بچہ دور نیچے بہاؤ کے رخ پر کسی دائروی کھنڈرات میں یہی عبادات کررہا ہوگا۔ رات کو اسے کوئی خواب دکھائی نہ دیتا یا پھر ویسے ہی خواب دکھائی دیتے جیسے ہر انسان دیکھتا ہے۔ وہ کائنات کی ہیئتوں اور آوازوں کا ایک خاص بیرنگی کے ساتھ ادراک کرتا۔ اس کا غیر حاضر بیٹا اسکی روح کی اسی تقلیل سے نمو پارہا تھا۔ اسکی زندگی کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ وہ ایک طرح کی سرمستی میں گم رہتا۔ کچھ مدت کے بعد (جسے اس کہانی کے چند راوی سالوں اور چند قرنوں کو محیط بتاتے ہیں) ایک روز آدھی رات کے وقت دو ملاحوں نے اسے جگایا۔ وہ ان کے چہرے نہ دیکھ سکا۔ انہوں نے اسے ایک جادوگر کے بارے میں بتایا جو شمال میں ایک مندر میں رہائش پذیر تھا، آگ پر چل سکتا تھا اور آگ اسے جلاتی نہیں تھی۔ جادوگر کو دیوتا کے الفاظ یاد آئے۔ اس نے یاد کیا' دنیا کی تمام مخلوقات میں سے صرف آگ ہی وہ مخلوق ہے جو جانتی ہے کہ اس کا بیٹا محض ایک بے حقیقت سایہ ہے۔'

اس یاد نے اسے پرسکون کیا۔ لیکن فوراً ہی یہ اس کی ذہنی اذیت کا باعث بنا۔ اسے یہ سوچ کر خوف محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا اپنی غیر معمولی صورت حال پر غور کرسکتا اور کسی طور یہ جان سکتا تھا کہ وہ محض ایک شبیہ تھا۔ انسان نہ ہونا، کسی دوسرے انسان کے خواب کی ایک توسیع ہونا' کیسی ناقابل بیان ذلت، کس قدر الجھا دینے والی حقیقت تھی۔ سبھی باپ اپنے بچوں میں دلچسپی لیتے ہیں جنہیں انہوں نے الجھاؤ یا مسرت کے تحت تخلیق کیا ہو (یا انھیں وجود میں آنے کی اجازت دی ہو)۔ یہ بالکل فطری بات تھی کہ جادوگر بچے کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہو جس کا ایک ایک عضو، ایک ایک نقش ایک ہزار اور ایک خفیہ راتوں میں تخلیق ہوا۔

اس کے تفکرات کا اختتام اچانک ہوا۔ گو خاص علامات کے ذریعے اس کی پیشین گوئی پہلے

سے ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے (طویل قحط کے بعد) دور پہاڑی پر بادل دکھائی دیے، پرندے کی مانند ہلکے پھلکے۔ جنوب میں آسمان کا تیندوے کے منہ جیسا گلابی رنگ۔ پھر چمکیلی راتوں کو گہن زدہ کرتے ہوئے دھویں کے بادل، اور سب سے آخر میں جانوروں کا دہشت زدہ ہو کر فراٹے بھرنا، یہ علامات ان واقعات سے متعلق تھیں جو صدیوں پہلے ہو چکے اور خود کو دہرا رہے تھے۔ اگنی دیوتا کے مندر کے کھنڈات آگ سے تباہ ہوئے تھے۔ پرندوں سے تہی ایک صبح جادوگر نے دیواروں کے گرد حلقہ در حلقہ شعلے لپکتے دیکھے۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے دریا میں کود کر فرار ہونے کے بارے میں سوچا۔ لیکن پھر جان لیا کہ موت اس کے بڑھاپے کو سرخرو اور اسے اس کی مشقتوں سے آزاد کرنے آن پہنچی تھی۔ وہ چلتا ہوا شعلوں کی دیوار میں داخل ہو گیا۔ لیکن شعلوں نے اس کی چمڑی کو گزند نہیں پہنچائی۔ بلکہ بصد احترام اسے مس کیا، کچھ احتراق یا حدت پیدا کیے بغیر اس کے آر پار ہو گئے۔ کچھ سکون، کچھ اضطراب، کچھ دہشت کے ساتھ اس نے جان لیا کہ وہ خود بھی محض ایک شبیہ تھا، جسے کوئی دوسرا شخص خواب میں دیکھ رہا تھا۔

---

# نئ انجیل

ان واقعات کا تعلق مارچ 1928 کے آخری دنوں اور جونین کے جنوبی علاقے میں
لاس الموس کے جانوروں کے باڑے سے تھا۔ ہیرو بالسٹر ایسپنو ساطب کا طالب علم تھا۔ ہم فی
الوقت اسے بیونیس ایریز کے دوسرے نوجوانوں جیسے ایک نوجوان کے طور پر بیان کرسکتے ہیں کسی
بھی قابل ذکر صفت کے بغیر، سوائے غیر محدود مہربان طبیعت اور خطیبانہ اہلیت کے، جس کی بنیاد پر
اس نے راموس میجا کے انگریزی سکول میں بہت سے انعامات بھی جیتے۔ اسے حجت بازی پسند
نہیں تھی۔ وہ صرف تبھی اسے ترجیح دیتا، اگر وہ خود نہیں بلکہ اس کا کوئی ہم سخن راستی پر ہو۔

اگرچہ کسی کھیل میں اتفاقات کے تغیرات اسے مسحور کرتے، لیکن وہ ایک کمزور کھلاڑی
تھا کیوں کہ اسے جیتنے کی کوئی آرزو نہیں تھی۔ اس کی اعلی ذہانت بے سمت تھی۔ تینتیس برس کی عمر
میں آخری مضمون میں کامیابی اس کی گریجوایشن کی راہ میں رکاوٹ بنی تھی۔ اس کا باپ، اس دور
کے شریف النفس انسانوں کی طرح ایک آزاد خیال انسان، اسے ہربرٹ سپنسر کے خیالات سے
آگاہ کرنے کوشش کرتا تھا لیکن اس کی ماں نے اس کے مونٹیو یڈیو کے لیے روانہ ہونے سے پہلے
وعدہ لیا تھا کہ ہر رات وہ عبادت کرے اور سینے پر صلیب کا نشان بنائے گا۔ ان تمام برسوں میں
اس نے کبھی اس وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔

وہ بزدل نہیں تھا۔ ایک صبح کسی لاتعلقی کی وجہ سے نہیں، بلکہ شدید غصے میں اس نے اپنے
ساتھی طالب علموں کو تابڑ توڑ گھونسوں سے ادھیڑ کر رکھ دیا جو اسے یونیورسٹی کے کسی مظاہرے میں

شریک ہونے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ قابل اعتراض خیالات یا عادات سے نہ چاہتے ہوئے بھی جڑا ہوا تھا۔ اس کے ملک کے لیے یہ بات زیادہ تشویش کا باعث تھی کہ دوسرے علاقوں میں لوگ یقین رکھتے تھے کہ انھیں انڈینز کی طرح پرندوں کے پر پہننے چاہئیں۔ وہ فرانس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا لیکن فرانسیسی زبان سے نفرت کرتا تھا۔ امریکیوں کی اس کی نظر میں کوئی عزت نہیں تھی لیکن بیونس ایریز میں فلک بوس عمارتوں کی موجودگی پر بھی اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ سوچتا کہ میدانی علاقوں کے جنوبی امریکی کاؤ بوائیز پہاڑی علاقوں یا پہاڑی سلسلوں کے گھڑ سواروں کی نسبت زیادہ مشاق ہوتے ہیں۔

اس کے کزن ڈینیئل نے اسے دعوت دی کہ وہ گرمیاں لاس الموس میں گزارے تو اس نے یہ دعوت قبول کرنے میں ذرہ بھی تردد نہ کیا۔ اس لیے نہیں کہ اسے وہ علاقہ پسند تھا بلکہ اپنی قدرتی خوش مزاجی کی وجہ سے اور اس باعث بھی کہ اس کے پاس انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

باڑے میں گھر کشادہ اور کسی حد تک خستہ تھا۔ فورمین، جسے گترے پکارا جاتا تھا، کے کوارٹرز نزدیک ہی واقع تھے۔ گترے تین تھے۔ باپ، بیٹا (جو خاص طور پر گنوار تھا) اور ایک لڑکی جس کی ولدیت مشکوک تھی۔ وہ دراز قد، مضبوط اور ہڈیالے جسم کے تھے، انڈین نقوش والے چہرے اور سرخی میں رنگے ہوئے بال۔ فورمین کی بیوی برسوں پہلے چل بسی تھی۔

اس دیہی علاقے میں ایسپینوسا ایسی باتیں سیکھ رہا تھا جن سے پہلے وہ بے خبر تھا اور نہ ہی جن کا اسے کبھی دھیان آیا تھا۔ مثال کے طور پر گھر کے قریب پہنچنے پر گھوڑا سرپٹ نہیں دوڑانا چاہئے اور جب تک کوئی خاص کام نہ ہو، گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نہیں جانا چاہئے۔ کبھی کبھار وہ پرندوں کو ان کی آوازوں سے شناخت کر لیتا۔

وہاں قیام کے آغاز ہی میں ڈینیئل کو دارالخلافہ جانا پڑا تاکہ وہاں مال مویشیوں سے متعلق ایک کاروباری معاملہ طے کر سکے۔ مجموعی طور پر اس کام میں ہفتہ بھر لگ گیا۔ ایسپینوسا، جو پہلے ہی اپنے کزن کے عورتوں سے اچھے تعلقات اور مردانہ فیشن کی تبدیلیوں میں اس کی گہری

دلچسپی سے بے زار تھا، اس کے جانے کے بعد باڑے میں نصابی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔
گرمی دم گھونٹنے والی تھی اور رات کو بھی اس کیفیت میں فرق نہ پڑتا۔ ایک صبح دن شروع ہوتے ہی طوفان کی آمد سے وہ جاگا۔ ہوا کیشو رینا کے پودوں سے سر ٹکرا رہی تھی۔ ایسپینوسا نے بارش کے اولین قطروں کی آواز سنی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اچانک سرد ہوا کمرے میں گھس آئی۔ اسی سہ پہر سلاڈو میں سیلاب آیا۔

اگلے دن اپنے برآمدے سے پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کو دیکھتے ہوئے، بالٹسر ایسپینوسا نے سوچا کہ عمومی استعارہ جو ارجنٹائن کے سبز میدانوں پامپاس کا موازنہ سمندر سے کرتا ہے، کم از کم اس صبح مکمل طور پر غلط نہیں تھا۔ ہڈسن کا کہنا تھا کہ سمندر ہمیں وسیع اس لیے دکھائی دیتا ہے کیوں کہ ہم اسے جہاز کے عرشے سے دیکھتے ہیں، نہ کہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر یا آنکھوں کی سطح کے برابر رکھ کر۔ بارش بلاتوقف جاری رہی۔ گترے نے شہری مہمان کی مدد سے یا اس کے ہونے کی رکاوٹ کے باوجود مویشیوں کا ایک بڑا حصہ بچا لیا، گو چند جانور پانی میں بہہ گئے۔ سٹیشن کو جانے والے راستے چار تھے، سبھی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تیسرے دن رستی ہوئی چھت سے فورمین کے گھر کو خطرہ پیدا ہوا تو ایسپینوسا نے انھیں پیچھے اوزاروں کے چھپریل کے برابر ایک کمرہ دے دیا۔ اس سے وہ اور بھی قریب آ گئے۔ وہ بڑے ڈائننگ روم میں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔

انھیں گفتگو کرنے میں دشواری ہوتی۔ گترے، جو مقامی علاقوں کے بارے میں کافی کچھ جانتے تھے، مگر اس فن سے یکسر نابلد تھے کہ کیسے اس سب کچھ کو بیان کیا جائے۔ ایک رات ایسپینوسا نے پوچھا کہ کیا انھیں انڈینز کے حملوں کے بارے میں کچھ یاد ہے جب سرحدی فوج کی کمان جونین میں موجود تھی۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں یاد تھا لیکن وہ اس کا جواب تبھی دے پاتے، اگر سوال چارلس اول کے سر قلم کیے جانے کے بارے میں پوچھا جاتا۔ ایسپینوسا کو اپنے باپ کی بات یاد آئی کہ ماضی بعید کے سبھی واقعات ضعیف یادداشت یا تاریخوں سے متعلق مبہم تصور کا نتیجہ

ہوتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کے کاؤبوائیز میں یہ رجحان موجود ہے کہ وہ اپنی پیدائش کا سال اور اس شخص کا نام بھول جاتے ہیں جنھوں نے اس کی پرورش کی ہوتی ہے۔

پورے گھر میں پڑھنے کو کوئی شے نہیں تھی، مویشیوں کے علاج معالجے کی ایک کتاب، ایک رسالے 'The Farm'، یوراگوئے کی طویل نظم 'Tabare' کے ایک نفیس ایڈیشن، 'ارجنٹائن میں چھوٹے سینگوں والے مویشیوں کی تاریخ، حال ہی میں شائع ہونے والے ایک عجیب شہوت پسند یا جاسوسی کہانی والے ناول Don Segundo Sombra کے سوائے۔

رات کے کھانے کے بعد ہونے والی ناگزیر گفتگو کو معنی خیز بنانے کے لیے ایسپینوسا نے گتروں کو، جو کبھی ناخواندہ تھے، ناول کے چند ابواب پڑھ کر سنائے۔ بدقسمتی سے کتاب کے ہیرو کی مانند فورمین بھی ایک چرواہا تھا اور اپنے جیسے کسی کردار کے بارے میں جاننے میں انھیں ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔ ایک گترے بولا کہ یہ کام بہت آسان تھا۔ وہ اپنے ساتھ ضروری سامان سے لدا ہوا ایک خچر رکھتے تھے، اور یہ کہ اگر وہ چرواہا نہ ہوتا، تو اس نے کبھی جھیل گومیز نہ دیکھی ہوتی، وہ کبھی بریگیڈو کے قصبے میں بھی نہ گیا ہوتا، نہ ہی کبھی چیبا چیکو میں نیونیز کا باڑہ ہی اس کے مشاہدے میں آیا ہوتا۔

باورچی خانے میں ایک گٹار پڑا تھا۔ ان تمام واقعات سے پہلے جو میں یہاں بیان کر رہا ہوں، وہ کبھی مزدور ایک دائرے میں بیٹھ جاتے اور ان میں سے کوئی اس ساز کو سُر میں کرنے لگتا، اسے بجانے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ اسے وہ گٹار جام کہتے تھے۔

ایسپینوسا، جس نے داڑھی بڑھالی تھی، آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے رک جاتا اور اپنے تبدیل ہوتے چہرے کا معائنہ کرتا اور اس خیال پر مسکراتا کہ وہ سلاڈو کے سیلاب کا قصہ سنا کر بیونس ایریز میں لڑکوں کو بور کرے گا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ ان مقامات کو یاد کرتا رہتا جہاں وہ کبھی گیا ہی نہیں تھا اور نہ کبھی جائے گا۔ جیسے کیبر یری میں ایک گلی کی نکڑ جہاں ڈاک کا بکسا نصب تھا۔ جوجوئے میں پلازہ ڈیل ونس سے چند بلاکس کے فاصلے پر ایک برآمدے میں سیمنٹ کے بنے

چند شیر، ٹائلوں کے فرش والا شراب خانہ جس کے محل وقوع کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ جہاں تک اس کے بھائیوں اور باپ کا تعلق تھا، ڈینئیل کے ذریعے وہ پہلے ہی جان چکے تھے کہ سیلاب کے پانیوں کی وجہ سے، اور یہ بات علم الحروف کی رُو سے بھی قطعی درست تھی، وہ سب سے کٹ چکا تھا۔

گھر میں گھومتے ہوئے جو ابھی تک پانی سے بھرا ہوا تھا، اس کے ہاتھ انگریزی میں چھپی ہوئی ایک انجیل لگی۔ اس کے آخری صفحوں میں گتھریوں نے جوان کا اصل خاندانی نام بھی تھا، اپنے خاندان کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ اصلاً وہ آئیورنس سے آئے تھے، انیسویں صدی کے ابتدائی ایام میں اس نئی دنیا میں داخل ہوئے، بلاشبہ مزدوروں کی حیثیت سے، اور یہاں ان کا واسطہ انڈینز سے پڑا۔ یہ روداد 1870 کی دہائی تک آ کر رک جاتی تھی یعنی جب ان میں خواندہ لوگوں کا وجود باقی نہیں رہا ہوگا۔ چند ہی نسلوں کے بعد وہ انگریزی سے نابلد ہو گئے۔ جب ایسپینوسا ان سے ملا، ان کے لیے ہسپانوی زبان کو بولنا اور سمجھنا بھی دشوار تھا۔ ان کا کوئی عقیدہ نہیں تھا، لیکن ان کے خون میں ایک مدہم لہر کی مانند کالوینیوں کی کٹر پسندی اور پامپاس میں رائج توہمات موجود تھیں۔ ایسپینوسا نے انھیں اپنی دریافت کے بارے میں بتایا لیکن وہ اس بات کو معمولی سا بھی خاطر میں نہ لائے۔

کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کی انگلیوں نے اسے 'انجیل بمطابق مارک' کے حصے سے کھولا۔ ترجمہ کی مہارت اور شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا گترے اسے سمجھتے بھی ہیں یا نہیں، اس نے رات کے کھانے کے بعد اسے پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا بغور سننا اور اس میں ان کی خاموش دلچسپی اسے ورطہ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھی۔ شاید کتاب کے سرورق پر سنہری حروف نے اس کو اعتبار بخشا تھا۔

'یہ ان کے خون میں موجود ہے۔' ایسپینوسا نے سوچا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ انسان نے تمام تاریخ میں بس دو ہی کہانیاں بیان کیں اور اس کا اعادہ کیا ہے، ایک راہ گم کردہ جہاز کی کہانی

جو ایک عزیز ترین جزیرے کی تلاش میں بحیرہ روم کے پانیوں میں سرگرداں ہے، اور ایک دیوتا کی کہانی جو گولگوتھا میں خود کو صلیب پر چڑھائے جانے کی اجازت دیتا ہے۔ راموس مچیا میں فن خطابت کی تربیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسپینوسا اخلاقی حکایات کی تبلیغ کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد کے دنوں میں گترے بھنا ہوا گوشت اور سارڈینز عجلت میں ہڑپ کر جاتے تاکہ جلد سے جلد انجیل کی قرات کا دور جاری ہو سکے۔

بھیڑ کے بچے نے، جسے گتروں کی لڑکی نے آسمانی نیلے رنگ کا ربن باندھ رکھا تھا، خود کو ایک خاردار تار میں الجھا کر زخمی کر لیا۔ خون کا بہاؤ روکنے کے لیے گترے وہاں جالے لگانا چاہتے تھے۔ ایسپینوسا نے اس کے بجائے چند گولیوں سے اس کا علاج کیا۔ اس پر ان کی طرف سے جس شکر گزاری کا اظہار کیا گیا، اس نے اسے ششدر کر دیا۔ اسے گتروں پر بالکل بھروسہ نہیں تھا سو اس نے دو سو چالیس پیسوز جو اس کے پاس تھے، اپنی کتابوں میں سے ایک میں چھپا لیے۔

اب چوں کہ اصل مالک موجود نہیں تھا، اس نے ڈینیئل کا کردار سنبھال لیا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں احکامات جاری کرتا جن کی فوراً تعمیل ہوتی۔ گترے اس کے ساتھ ساتھ کمروں اور برآمدے میں جاتے جیسے اس کے بغیر وہ گم ہو جائیں گے۔ قرات کی نشستوں میں اس نے دیکھا کہ وہ اس کے کیک وغیرہ کے بچے ہوئے ٹکڑے بھی اٹھا کر لے جاتے جو میز پر گرے ہوتے تھے۔ ایک شام وہ اچانک ہی وہاں آنکلا اور دیکھا کہ وہ اسی کے بارے میں مؤدب انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

'انجیل بمطابق مارک' پڑھ چکنے کے بعد وہ باقی تین انجیلیں بھی پڑھنا چاہتا تھا۔ گتروں کے باپ نے فرمائش کی کہ وہ اسی انجیل کو پھر سے پڑھے تاکہ وہ اسے زیادہ بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔ ایسپینوسا نے محسوس کیا کہ وہ بالکل بچوں جیسے تھے جو تنوع یا عجیب پن پر تکرار کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس رات اس نے حیرت میں مبتلا ہوئے بغیر سیلاب کا خواب دیکھا اور اس ٹھک ٹھک

ٹھک کی وجہ سے بیدار ہوا جو چھپریل کی تعمیر نو کے سلسلے میں جاری تھی، جسے اس نے طوفان کی آواز سمجھا۔ درحقیقت بارش کم ہونے کے باوجود بھاری ہوگئی تھی۔ ٹھنڈ بھی شدید تر تھی۔ گتروں نے اسے بتایا کہ طوفان نے چھپریل کی چھت کو نقصان پہنچایا تھا اور یہ کہ ایک بار اگر وہ شہتیروں کی مرمت کرلیں تو وہ اسے بھی دکھائیں گے کہ نقصان کی شدت کیا تھی۔ یہ بات کہ وہ ان کے لیے مزید ایک اجنبی نہیں رہا تھا اور وہ اس پر خصوصی توجہ نچھاور کرتے تھے، اس کے لیے پریشان کن تھی۔ ان میں کوئی کوفی پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ اس کے لیے ہمیشہ ایک پیالہ تیار رکھتے جس میں مٹھی بھر شکر ملی ہوتی۔

طوفان منگل کے روز آیا۔ جمعرات کی رات کو وہ دروازے پر ہونے والی معمولی دستک کی وجہ سے جاگا جو اپنے خدشات کی وجہ سے وہ ہمیشہ اندر سے مقفل رکھتا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ باہر گتروں کی لڑکی کھڑی تھی۔ اندھیرے میں وہ اسے پہچان نہیں سکا لیکن اس کے پیروں سے اندازہ لگایا کہ وہ ننگے پیر آئی تھی اور بعدازاں بستر میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہ شروع ہی سے برہنہ تھی۔ لڑکی اس کے گلے نہیں لگی، نہ کوئی ایک لفظ ہی بولا، وہ اس کے برابر لیٹ گئی اور کانپنے لگی۔ وہ پہلی بار کسی مرد کے ساتھ لیٹ رہی تھی۔ جب وہ گئی تو جاتے ہوئے بھی اس نے اسے بوسہ نہیں دیا۔ ایسپینوسا نے سوچا کہ وہ تو اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ کسی ایسی جذباتی وجہ سے جسے سمجھنے کی اس نے کوشش نہیں کی، اس نے عہد کیا کہ وہ بیونس ایریز میں کسی کو اس واقعے کے بارے میں نہیں بتائے گا۔

اگلا دن پچھلے دنوں ہی کی طرح شروع ہوا سوائے اس کے کہ گتروں کے باپ نے ایسپینوسا سے یہ سوال کیا کہ "کیا یسوع مسیح نے تمام انسانیت کو بچانے کے لیے خود کو قتل ہوجانے دیا؟"

ایسپینوسا جو خود ایک آزاد خیال انسان تھا، لیکن خود کو پابند محسوس کرتا تھا کہ جو کچھ پڑھ کر انھیں سنا چکا تھا، اس کی توجیہ بھی پیش کرے، بولا "ہاں، ہم سب کو جہنم کے عذاب سے بچانے

کے لیے۔''

گترے نے پوچھا، ''جہنم کیا شے ہے؟''

''زمین کے نیچے ایسی جگہ جہاں روحوں کو مسلسل جلایا جاتا ہے۔''

''اور جنھوں نے کیل ٹھونکے، وہ بھی بچ جائیں گے؟''

''ہاں'' ایسپینوسا نے جواب دیا جس کی الٰہیات کچھ ڈگمگا گئی تھی۔

اسے خوف محسوس ہوا کہ فورمین کہیں اس واقعے کے بارے میں نہ پوچھ لے جو گذشتہ رات اس کی بیٹی کے ساتھ ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد انھوں نے اس سے کہا کہ وہ آخری باب دوبارہ پڑھ کر سنائے۔

ایسپینوسا نے طویل دورانیہ کا قیلولہ کیا حالاں کہ اس کی نیند مسلسل اٹھا پٹخ اور مبہم پیش اندیشوں کے پیش نظر مخل ہوتی رہی۔ شام کے قریب وہ بیدار ہوا اور برآمدے میں آیا۔

پھر وہ یوں گویا ہوا جیسے بآواز بلند سوچ رہا ہو، ''پانی نیچے آچکے ہیں۔ ایسا اب زیادہ دیر نہیں رہے گا۔''

''ایسا اب زیادہ دیر نہیں رہے گا۔'' گترے اس کی آواز کی گونج کی صورت میں پکارے۔

تینوں گترے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ فرش پر گھٹنے ٹیکتے ہوئے انھوں نے اس سے ان کے حق میں دعا کرنے کو کہا۔ پھر انھوں نے اس پر لعنت ملامت کی، اس پر تھوکا اور اسے گھر کے پچھواڑے میں دھکیل دیا۔ لڑکی رو رہی تھی۔ ایسپینوسا جانتا تھا کہ دروازے کی پرلی طرف کیا تھا۔ انھوں نے دروازہ کھولا تو اسے کھلا آسمان دکھائی دیا۔ ایک پرندہ چیخا۔ ''سنہری سہرہ'' اس نے سوچا۔ چھپریل کی چھت نہیں تھی، انھوں نے اس کے شہتیر ایک بڑی صلیب بنانے کے لیے اکھاڑ لیے تھے۔

# خفیہ معجزہ

اور خدا نے اسے سو برس کے لیے مار دیا اور اس کے بعد پھر سے زندہ کیا اور کہا ''تم کب سے یہاں ہو؟''

''ایک دن یا چند گھنٹوں سے۔'' اس نے جواب دیا۔

قرآن 11, 261

14 مارچ 1943 کی رات پراگ میں زیلٹنر گاس کے ایک اپارٹمنٹ میں، غیر مکمل المیہ ناٹک 'دشمن'، ابدیت کی دلیل، اور جیکوب بوہمی کے بالواسطہ صیہونی حوالہ جات کا تجزیہ کرنے والے مصنف جیرومر ہلادک نے شطرنج کے ایک طویل کھیل کا خواب دیکھا۔

کھیلنے والے دو افراد نہیں بلکہ دو ممتاز خاندان تھے۔ یہ کھیل صدیوں سے جاری تھا۔ کسی کو یاد نہیں تھا کہ داؤ پر کیا لگا تھا لیکن یہ افواہ تھی کہ یہ جو کچھ بھی تھا، بے انتہا زیادہ تھا، شاید لامحدود۔ شطرنج کے مہرے اور بساط ایک خفیہ مینار میں موجود تھے۔ جیرومیر (اپنے خواب میں) حریف خاندانوں میں سے ایک میں پیدا ہونے والا پہلا فرد تھا۔ گھڑی نے ناقابل احتراز کھیل کا گھنٹہ بجایا۔ خواب دیکھنے والا بارش میں صحرا کی ریت پر بھاگ رہا تھا لیکن اسے نہ مہرے اور نہ ہی شطرنج کے اصول یاد رہے تھے۔ اس موقع پر وہ بیدار ہوا۔ بارش اور ہولناک گھڑیال کا مہیب شور ختم ہو گیا۔ ایک میٹھی ہموار آواز، احکامات کی چیخ و پکار سے مجروح ہوتی ہوئی، زیلٹنر گاس سے بلند

ہوئی۔ یہ صبح کا وقت تھا اور رائخ سوم کا مسلح ہراول دستہ پراگ میں داخل ہو رہا تھا۔

انیس تاریخ کو حکام کو ایک مخبر سے رپورٹ موصول ہوئی۔ اسی شام جیرومر ہلادک گرفتار ہوا۔ اسے مولداؤ کے دوسرے کنارے پر ایک سفید جیل میں لایا گیا۔ اس سے گسٹاپو کی طرف سے لگائے گئے الزامات میں سے ایک کو بھی رد نہ کیا جا سکا۔ اس کی ماں کا خاندانی نام جیروسلاوسکی تھا۔ وہ یہودی النسل تھا۔ بوہمی پر اس کی تنقید صیہونی اثرات سے آزاد نہیں تھی۔ آسٹریا کے جرمنی سے الحاق کے خلاف مظاہرے میں ملزموں کے دستخطوں میں اس کے دستخط بھی شامل تھے۔

1928 میں اس نے ہرمان بارسڈورف اشاعتی مرکز کے لیے Sepher Yezirah کا ترجمہ کیا۔ ادارے کی شائع شدہ فہرست کتب میں تشہیری مقصد کے تحت مترجم کا بڑھا چڑھا کر پرستائش تعارف پیش کیا گیا تھا۔ فہرست کا معائنہ کیپٹن جولیس روتھ نے کیا جو ان افسران میں سے ایک تھا جن کی رائے پر ہلادک کی قسمت کا دارومدار تھا۔

کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنی خصوصی مہارت کے شعبے کے علاوہ، کسی اور معاملے میں سادہ لوح نہ ہو۔ گوتھک تحریر میں چند اوصاف کا بیان جولیس روتھ کو یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ ہلادک کا مقام و مرتبہ کیا تھا اور یہ کہ اسی لیے اسے موت کی سزا دی جانی ضروری تھی۔ سزا پر عمل درآمد 29 مارچ کو نو بجے صبح ہونا تھا۔ یہ تاخیر (جس کی اہمیت قاری جلد ہی سمجھ پائیں گے) حکام کی اس خواہش کے احترام میں ہوئی تھی کہ اس عمل کو یونہی غیر شخصی انداز میں اور سوچ بچار کے بعد کیا جائے۔ ہلادک کا پہلا ردعمل محض دہشت کا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسے پھانسی دی جائے، اس کی گردن اڑائی جائے یا چاقو گھونپا جائے۔ لیکن پستول بردار دستے کی گولیوں کی بوچھاڑ سے موت کی سزا ناقابل برداشت تھی۔

بے کار ہی اس نے خود کو قائل کرنے کی بہتیری کوشش کی کہ صرف مرنے کی سادہ اور کائناتی حقیقت ایسی ہولناک شے تھی کہ جس سے خوف پیدا ہوتا تھا۔ نہ کہ اس سے جڑے ٹھوس

حقائق، جن کا تصور کرنے سے ہلادک تھکتا نہیں تھا۔

لغو انداز میں اس نے اپنی موت کے عمل کی مختلف صورتوں کا تصور کیا۔ اس عمل کو لامحدود طور پر فرض کیا، بے نیند صبح سے گولیوں کی پراسرار بوچھاڑ تک۔ اس دن سے پہلے، جو جولیس روتھ نے اس کے لیے طے کیا تھا، وہ سینکڑوں مرتبہ ہلاک ہوا، ان صحنوں میں، جن کی ساختیں اور زاویے علم ہندسہ کی سارے سلسلوں کے مطابق تبدیل ہوئے، وہ بدلتے چہروں اور متغیر تعداد میں کبھی دور اور کبھی قریب کھڑے سپاہیوں کے ہاتھوں مشین گنوں کی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس نے ان تخیلاتی سزاؤں کا شاید حقیقی دہشت کے ساتھ سامنا کیا (شاید حقیقی دلیری کے ساتھ بھی)۔ ہر وضع چند سیکنڈ برقرار رہتی۔ جب یہ دائرہ بند ہوتا تو ہلادک نامختتم انداز میں اپنی موت کے کپکپاتے لمحہ کی طرف لوٹ آتا۔

تب اس نے سوچا کہ حقیقت کم ہی اس کے مطابق ہوتی ہے جیسا ہم اس کے بارے میں گمان کر لیتے ہیں۔ اپنی بے راہ رو منطق کے ساتھ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ کسی وقوعہ کی تفصیلات کی پیشین گوئی کرنا اسے ہونے سے روکنے کے مترادف ہے۔ اس کمزور جادو پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے انتہائی دہشت انگیز تفصیلات وضع کیں تاکہ یہ وقوعہ نہ ہو سکے۔

قدرتی طور پر اس خوف کے ساتھ کہ یہ تفصیلات کہیں ایک طور سے پیشین گوئیاں ہی نہ ہوں، اس نے سوچ کا یہ عمل تمام کیا۔ راتوں کو لاچاری کے ساتھ اس نے کوشش کی کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے کہ وقت کی گزران پر قابو پالے۔ وہ جانتا تھا کہ وقت انتیس کی صبح کی طرف سرپٹ بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے بآواز بلند کہا، "میں بائیس کی رات میں ہوں۔ جب تک یہ رات اور اس سے اگلی چھ راتیں نہیں گزرتیں، میں ماورائے ایذا رسانی اور لافانی ہوں۔"

اس نے محتاط انداز میں سوچا کہ جن راتوں میں وہ سو جاتا ہے، وہ گہری ہو جاتی ہیں، ایسے دھندلے تالاب کی طرح جن میں وہ خود کو غرق کر سکتا تھا۔ تب ایسے لمحے بھی آئے جب اس نے بے چینی کے ساتھ گولیوں کی آخری بوچھاڑ کی خواہش کی جو اس کی زندگی کا چراغ گل کر دے

گی، گولیوں کی بوچھاڑ جو اس کی بہتری یا خرابی کی صورت میں اسے نجات دلا دے گی۔ اٹھائیسویں تاریخ کو جب غروب آفتاب کی آخری کرنیں کھڑکی کی بلند سلاخوں میں چمک رہی تھیں، اس کی توجہ اپنے ناٹک 'دشمن' کے خیال سے ہٹی۔

ہلادک چالیس برس سے زیادہ عمر کا تھا۔ چند دوستیوں اور بہت سی عادتوں کے علاوہ، ادب کی مسئلہ خیز ریاضت نے ہی اس کی زندگی کی شکل پذیری کی تھی۔ باقی سبھی لکھاریوں کی طرح اس نے دوسروں کی کامیابیوں کی پیمائش اُس سب کچھ کی بنیاد پر کی جو انھوں نے حاصل کیا، پھر یہ سوچا کہ دوسرے بھی اس کو ان سب کاموں کی بنیاد پر ماپیں جنھیں کرنے کا اس نے ارادہ باندھا تھا۔ ان تمام کتابوں نے، جو اس نے شائع کیں، اسے ندامت کے پیچیدہ احساس میں مبتلا کیا۔ بوہمی، ابن ایذرا اور فلڈ کی تحریروں پر اپنے ناقدانہ مضامین میں وہ محض محتاط رویے اور اطلاق کو بروئے کار لایا تھا۔ سیفر یزیراہ کا اس کا ترجمہ لاپرواہی، تھکاوٹ اور قیاس آرائی پر مبنی تھا۔ 'ابدیت کی توجیہ' اسے شاید کچھ کم ناقص معلوم ہوئی۔ پہلی جلد میں ان ابدیتوں کو درج کیا گیا تھا جو پارمینڈیز کی ناقابل تغیر ہستی سے لے کر ہنٹن کے قابل تغیر ماضی تک انسانوں نے اختراع کی تھیں۔ دوسری جلد میں (فرانسس بریڈلے کی ہم نوائی میں) اس بات سے انکار کیا گیا تھا کہ کائنات میں ہونے والے سبھی وقوعات ایک عارضی سلسلے کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ دلیل دیتا ہے کہ انسان کے ممکنہ تجربات کی تعداد لامحدود نہیں ہے۔ اور یہ کہ محض ایک 'اعادہ' یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وقت ایک مغالطہ ہے۔

بدقسمتی سے وہ دلائل جو اس مغالطے کو ثابت کرتے ہیں، وہ اس سے کم غلط نہیں ہیں۔ ہلادک کی عادت تھی کہ وہ ایک طرح کی قابل نفرت پیچیدگی کے ساتھ ان کی جانچ کرتا رہتا۔ اس نے کئی ایک 'اظہاریت پسند' نظمیں بھی لکھیں جو شاعر کے الجھاؤ میں اضافہ کرتے ہوئے 1924 میں شائع ہونے والے شاعری کے ایک انتخاب میں بھی شامل ہوئیں۔ اپنے منظوم ناٹک 'دشمن' کے ذریعے ہلادک کو امید تھی کہ وہ اپنے مبہم اور غیر متاثر کن ماضی سے نجات پالے گا۔

(اسے منظوم صورت قابل تحسین معلوم ہوتی کیوں کہ اس سے تماشائیوں کے لیے ممکن نہیں رہتا تھا کہ وہ ناٹک کے غیر حقیقی پن کو یاد رکھ پائیں جو فن کی بنیادی شرط ہے۔)

اس ناٹک میں وقت، جگہ اور عمل کی اکائیوں کا مشاہدہ کیا گیا۔ یہ واقعہ ہراڈکینی میں رونما ہوا، بیرون رومرسٹاڈ کے کتب خانے میں، انیسویں صدی کی آخری سہ پہروں میں سے کسی ایک میں۔ پہلے ایکٹ کے پہلے منظر میں ایک اجنبی رومرسٹاڈ کے ہاں آتا ہے۔ (گھڑیال میں سات کا گھنٹہ بجتا ہے۔ ڈوبتے سورج کی شعاعوں کی شدت کھڑکیوں کی رفعت بڑھاتی ہے، معروف ہنگیرین موسیقی کے جذبات انگیز سُر ہوا میں تیرتے ہیں۔) اس کی آمد کے بعد کئی دوسرے بھی آتے ہیں۔ رومرسٹاڈ ان لوگوں سے شناسا نہیں ہے جو اس سے التجا کرنے آتے ہیں حالاں کہ اسے یہ ناگوار احساس ہوتا ہے کہ وہ انھیں کہیں دیکھ چکا ہے شاید کسی خواب میں۔ وہ سبھی اس سے خوف زدہ ہیں لیکن یہ واضح ہو جاتا ہے، پہلے تماشائیوں پر اور پھر خود رومرسٹاڈ پر بھی کہ وہ خفیہ دشمن ہیں، اسے تباہ کرنے پر کمربستہ۔ وہ کسی طرح ان کی پیچیدہ سازش پر نظر رکھنے یا انھیں چکمہ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مکالمے میں وہ اس کی منگیتر جولیا وان ویڈناؤ کا ذکر کرتے ہیں اور ایک خاص شخص جیروسلاو کیوبن کا بھی، جس نے کبھی اس کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

کیوبن اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے اور خود کو رومرسٹاڈ تصور کرتا ہے۔ خطرات کی پیچیدگی بڑھتی ہے۔ دوسرے ایکٹ کے اختتام پر رومرسٹاڈ سازشیوں میں سے ایک کو قتل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تیسرے اور آخری ایکٹ کا آغاز ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ بے ربطگیاں بڑھتی ہیں۔ ایسے اداکار سٹیج پر ظاہر ہوتے ہیں، جنھیں بظاہر کھیل سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ کچھ وقت کے لیے وہ شخص جسے رومرسٹاڈ نے قتل کیا، سٹیج پر ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی ذکر کرتا ہے کہ شام گزر نہیں رہی۔ گھڑیال کا گھنٹہ سات بار بجتا ہے۔ بلند کھڑکیوں میں سے مغرب کا سورج منعکس ہوتا ہے، ہوا میں ایک جوشیلا ہنگیرین نغمہ گونجتا ہے۔

پہلا اداکار سامنے آتا اور وہی مکالمے دہراتا ہے جو وہ پہلے ایکٹ کے پہلے منظر میں بھی ادا کر چکا ہے۔ کسی حیرت یا تشویش کا اظہار کیے بغیر رومرسٹاڈ اس سے گفتگو کرتا ہے۔ حاضرین سمجھ لیتے ہیں کہ رومرسٹاڈ وہی بدحال جیروسلاو کیوبن ہے۔ ناٹک کبھی نہیں کھیلا گیا۔ یہ ایک دائروی ذہنی خلفشار ہے جس کا کیوبن کولامختتم انداز میں تجربہ ہوتا ہے۔

ہلادک نے کبھی خود سے یہ نہیں پوچھا کہ اغلاط پر مبنی یہ المیاتی مزاح قابل ستائش تھا یا مضحکہ خیز۔ یا یہ کہ کیا یہ محتاط انداز میں بُنا گیا تھا یا حادثاتی طور پر۔ اس پلاٹ میں، جس کا خاکہ میں نے پیش کیا، اس نے وجدانی طور پر، اپنے عیبوں کی پردہ پوشی اور اپنے جوہر کو بروئے کار لانے کا بہترین طریقہ وضع کیا تھا، یعنی اس سب کچھ کو بچا لینے (گو علامتی طور پر) کا امکان جو اس کی زندگی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔ اس نے پہلے اور تیسرے ایکٹ کے ایک یا دو منظروں کی لکھت مکمل کی۔ ناٹک کی منظوم صورت نے یہ گنجائش پیدا کی کہ وہ اس پر مسلسل کام کر سکے، کسی مسودے کی موجودگی کے بغیر چھ رکنی بحر کو بدلتے ہوئے۔ اسے خیال آیا کہ اسے ابھی مزید دو ایکٹوں پر کام کرنا ہوگا لیکن جلد ہی اسے مرنا بھی ہوگا۔

تاریکی میں وہ خدا سے ہم کلام ہوا۔ اس نے دعا مانگی ''اگر کسی طور میں زندہ رہا، اگر میں تمہاری اعادہ کی گئی باتوں اور غلطیوں میں سے ایک نہیں ہوں، تو پھر میں 'دشمن' کے مصنف کے طور پر زندہ رہوں گا۔ اس ناٹک کو مکمل کرنے کے لیے، جو میرے اور تمہارے لیے بھی ایک جواز بن سکتا ہے، مجھے مزید ایک سال کی ضرورت ہے۔ مجھے اس مہلت کی اجازت دو، تم ہی سے صدیاں اور وقت جڑے ہوئے ہیں۔''

یہ آخری رات تھی، سب سے زیادہ ہولناک رات۔ لیکن دس منٹ بعد ہی نیند کسی گہرے سمندر کی طرح اسے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ صبح کے قریب اس نے خواب دیکھا کہ وہ 'کلیمنٹائن کتب خانے' کے درمیانی ہال میں چھپ گیا تھا۔

سیاہ چشمہ پہنے ہوئے ایک لائبریرین نے اس سے پوچھا، ''آپ کیا تلاش کر رہے

ہیں؟''

ہلادک نے جواب دیا،''خدا کو کھوج رہا ہوں۔''

لائبریرین نے کہا،''خدا کلیمنٹائن میں موجود چار لاکھ کتابوں کے صفحات میں لکھے حروف میں سے ایک حرف ہے۔ میرے والد اور ان کے آباؤاجداد اسی حرف کو کھوجتے رہے۔ میں اسے تلاشتے ہوئے ہی اندھا ہوا۔'' اس نے اپنا چشمہ اتارا اور ہلادک نے اس کی آنکھوں کو دیکھا جو مردہ تھیں۔

ایک قاری ایک اٹلس لوٹانے آیا۔

''یہ بالکل بے کار ہے۔'' وہ بولا اور اٹلس ہلادک کو تھمائی جسے اس نے ایسے ہی ایک جگہ سے کھولا۔ ایک دھندلے صفحے پر اسے بھارت کا نقشہ دکھائی دیا۔ اچانک گہرے یقین کے ساتھ اس نے ننھے حروف میں سے ایک حرف کو چھوا۔ ایک ہمہ گیر آواز اس سے مخاطب ہوئی ''تمھیں تمھاری محنت کے لیے وقت بخش دیا گیا۔'' ہلادک بیدار ہو گیا۔

اسے یاد تھا کہ انسان کے خواب خدا سے جڑے ہوتے ہیں اور یہ کہ میمونائڈ نے لکھا تھا کہ خواب میں سنے گئے الفاظ الوہی ہوتے ہیں اگر وہ بہت واضح اور نمایاں ہوں اور انھیں ادا کرنے والا شخص دکھائی نہ دے۔

اس نے لباس پہنا۔ دو سپاہی جیل خانے میں داخل ہوئے اور اسے حکم دیا کہ وہ ان کے پیچھے چلے۔ اپنی کوٹھڑی ہی میں اس نے سوچا کہ جب وہ باہر نکلے گا تو اسے برآمدوں، سیڑھیوں، اور جدا عمارتوں کی ایک بھول بھلیاں دیکھنے کو ملیں گی۔ حقیقت ایسی شاندار نہیں تھی۔ ان سپاہیوں کے ساتھ وہ ایک تنگ آہنی زینے کے ذریعے عقبی صحن میں پہنچا۔ بہت سے فوجی، جن میں چند ایک بغیر بٹنوں کی وردی میں ملبوس تھے، ایک موٹر سائیکل کا معائنہ اور اس پر بحث کر رہے تھے۔ سارجنٹ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ آٹھ بج کر چوالیس منٹ ہوئے تھے۔ نو بجے تک انھیں انتظار کرنا پڑا۔ ہلادک، بدقسمتی سے کہیں زیادہ اپنی کم مائیگی کے بوجھ تلے دبا ہوا، لکڑیوں کے ایک

ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا فوجی اس سے نظریں چرا رہے تھے۔ اپنے انتظار کو سہل بنانے کے لیے سارجنٹ نے اسے سگریٹ دیا۔ ہلادک تمبا کو نوش نہیں تھا۔ لیکن محض مروت یا عاجزی کے سبب اس نے سگریٹ لے لیا۔ لیکن جونہی اسے جلایا، اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

وہ دن بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ فوجی مدھم آواز میں بات کر رہے تھے جیسے وہ پہلے ہی سے مر چکا ہو۔ بے کار ہی اس نے اس عورت کو یاد کرنے کی کوشش کی جس کی علامتی صورت جولیا وان ویڈناؤ تھی۔ فوجی دستہ آگے بڑھا اور ایک ترتیب سے کھڑا ہو گیا۔ ہلادک نے، بیرکوں کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے، گولیوں کی بوچھاڑ کا انتظار کھینچا۔ کسی نے کہا کہ دیوار خون کے چھینٹوں سے داغدار ہو جائے گی۔ قیدی سے کہا گیا کہ وہ چند قدم آگے بڑھے۔ بارش کا ایک موٹا قطرہ ہلادک کی کنپٹیوں پر گرا اور آہستگی سے پھسلتا ہوا اس کے رخسار تک آیا۔ سارجنٹ نے چیخ کر آخری حکم جاری کیا۔

طبعی کائنات سکتے میں آ گئی۔ بندوقیں ہلادک پر تن گئیں لیکن جو لوگ اسے مارنے پر مامور تھے، وہ ساکت تھے۔ سارجنٹ کا بازو بے ڈھنگے انداز میں جیسے ہمیشہ کے لیے ساکت ہو چکا تھا۔ صحن میں لگے ہموار پتھروں میں سے ایک پتھر پر ایک مکھی اپنا ناقابل تغیر سایہ ڈالے ہوئے تھی۔ جیسے کسی تصویر میں ہوتا ہے، ہوا تھم چکی تھی۔ ہلادک نے چیخنے کی کوشش کی، کوئی لفظ، ہاتھ کی کوئی جنبش۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ فالج زدہ ہو چکا تھا۔ وہ تھمی ہوئی دنیا کی معمولی سرسراہٹ بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اس نے سوچا ''میں جہنم میں ہوں۔ میں مر چکا ہوں۔ ورنہ میں پاگل ہو چکا ہوں۔''

پھر یہ خیال اس کے ذہن میں آیا، ''وقت رک چکا ہے۔'' پھر اسے لگا کہ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کا ذہن بھی رک چکا ہوگا۔ اس نے اپنے خیال کی آزمائش کی کوشش کی۔ اس نے (اپنے ہونٹ ہلائے بغیر) ورجل کی پر اسرار چوتھی نظم دہرائی۔ اس نے تصور کیا کہ اب دور ہو چکے فوجی بھی

اس کی بے چینی میں برابر کے شریک ہوں گے۔اس نے خواہش کی کہ ان سے بات کرے۔اسے حیرت اور پریشانی ہوئی کہ اپنی طویل بے حرکتی پر نہ اسے معمولی تھکاوٹ محسوس ہوئی اور نہ ہی کوئی بے ہوشی۔ایک غیر معین وقفہ کے بعد وہ سو گیا۔جب وہ جاگا تو دنیا ویسی ہی بے حرکت اور خاموش تھی۔پانی کا قطرہ ہنوز اس کے رخسار پر ٹھہرا ہوا تھا۔صحن میں مکھی کا سایہ پتھر پر موجود تھا۔ہوا میں سگریٹ کا دھواں جو اس نے اگلا تھا، ابھی تک فضا میں تحلیل نہیں ہوا تھا۔

ان دنوں میں سے ایک دن مزید گزرا تو کہیں ہلادک اصل بات سمجھا۔

اس نے خدا سے اپنا کام ختم کرنے کے لیے پورا ایک سال مانگا تھا۔ذات باری تعالی نے اسے یہ وقت بخش دیا۔خدا نے اس کے لیے یہ خفیہ معجزہ رونما کیا تھا۔جرمن فوج کی گولی اسے مقررہ وقت پر ختم کر دے گی لیکن اس کے ذہن میں گولی مارنے کا حکم جاری ہونے اور اس پر عمل درآمد ہونے کے درمیان ایک سال کا وقفہ گزرے گا۔اس پیچیدگی سے وہ گزرا، صدمے تک، اور صدمے سے بحالی تک، اور بحالی سے فوری احساس تشکر تک۔

اس کے پاس کوئی دستاویز نہیں تھی سوائے یادداشت کے۔اس حقیقت نے کہ اسے ہر وہ اضافی بحر یاد کرنی پڑی جس کا اس نے اضافہ کیا تھا، اس پر ایک اتفاقی بندش عائد کی جوان افراد کے لیے غیر متوقع تھی جو مبہم پیراگرافس لکھتے اور پھر انھیں بھول جاتے ہیں۔وہ آنے والی نسلوں یا حتی کہ خدا کے لیے کام نہیں کر رہا تھا، جس کی ادبی ترجیحات سے وہ ناواقف تھا۔بہت محتاط انداز میں حرکت کیے بغیر خفیہ طور پر اس نے وقت کے دائرے میں دکھائی نہ دینے والی ارفع بھول بھلیاں تیار کیں۔اس نے تیسرے ایکٹ پر پھر سے کام کیا۔بعض بہت زیادہ واضح استعاروں کو حذف کر دیا جیسے گھڑیال کا بار بار بجتا گھنٹہ، موسیقی۔کوئی تفصیل اسے بور نہیں کرتی تھی۔اس نے تفصیلات میں ترمیم کی، انھیں مختصر کیا، یا وسعت دی۔بعض جگہوں پر وہ پھر سے اصل متن کی طرف لوٹ آیا۔اس نے دل میں صحن اور جیل خانے کے لیے محبت محسوس کی۔اس کے سامنے موجود چند چہروں میں سے ایک چہرے نے رومرسٹاڈ کے کردار سے متعلق اس کے تصور کو تبدیل کیا۔

اس نے دیکھا کہ الجھی ہوئی بلند آہنگ صوتیات جو فلابیئر کے لیے بہت تشویش ناک تھیں، محض بصری توہمات ہیں، سنے جانے والے نہیں بلکہ لکھے جانے والے لفظ کی کمزوریاں اور بندشیں۔ اس نے اپنا ناٹک مکمل کرلیا۔ بس ایک ہی جملہ لکھا جانا باقی تھا۔ آخر اس نے اسے پالیا۔ پانی کا قطرہ اس کے رخسار سے نیچے بہہ گیا۔ اس نے جنونی چیخ ماری، اپنا سر ہلایا اور ایک چار گنا بڑے دھماکے نے اسے آلیا۔

جیرومر ہلادک 29 مارچ کو دن کے 09.02 بجے ہلاک ہوا۔

# دیوتا کا کلام

عقوبت خانہ گہرا اور پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اسکی ہیئت تقریباً ایک مکمل نیم کرے جیسی ہے حالاں کہ فرش (جو پتھر ہی کا بنا ہوا ہے) ایک بڑے دائرے سے کسی قدر کم ہے اور یہ حقیقت کسی طور جبر اور کشادگی کے احساسات کو مہمیز کرتی ہے۔ ایک درمیانی دیوار اسے وسط میں تقسیم کرتی ہے۔ یہ اگرچہ بہت بلند ہے لیکن یہ محراب کے بالائی حصہ تک نہیں پہنچ پاتی۔ میں، زینا کان، کہولون کے اہرام کا ساحر، جسے پیڈرو ڈی الوراڈو نے جلا کر خاکستر کر دیا، دیوار کے ایک طرف قید ہوں۔ دوسری کوٹھڑی میں ایک تیندوا ہے جو خفیہ انداز میں نپے تلے قدموں سے اپنی قید کے زمان و مکان کو ماپتا رہتا ہے۔

وسطی دیوار میں بنی ہوئی آہنی سلاخوں والی ایک بلند کھڑکی فرش سے جڑی ہے۔ بے سایہ گھنٹوں (دن کے وسط) میں بلند محراب میں ایک سقفی دروازہ کھلتا ہے اور ایک داروغہ زنداں، جس کی صورت ان تمام برسوں میں میرے ذہن میں دھندلا گئی ہے، ایک آہنی چرخی گھماتا اور ہمارے لیے پانی کے مرتبان اور گوشت کے قتلے رسی سے باندھ کر نیچے بھیجتا ہے۔ روشنی کا گنبد میں ورُود ہوتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب تیندوا مجھے دکھائی دیتا ہے۔

میں یہ حساب بھول چکا ہوں کہ کتنے برسوں سے تاریکی میں پڑا ہوں۔ میں جو کبھی جوان تھا اور اس زندان میں چل پھر سکتا تھا، اب سوائے موت کے انتظار کے کسی قابل نہیں رہا جو دیوتاؤں نے میرے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ برکانی شیشے کے لابنے خنجر سے میں نے اپنے شکار کے سینے چیر

ڈالے۔ اب یہ حال ہے کہ کسی جادو کے بغیر خود کو خاک سے اٹھا بھی نہیں سکتا۔

اہرام کو نذرِ آتش کیے جانے سے قبل ان آدمیوں نے، جو بلند قامت گھوڑوں سے اترے تھے، مجھ پر آگ میں تپائی ہوئی دھات سے تشدد کیا تا کہ میں انہیں خفیہ مخزن کے درست مقام کی نشاندہی کروں۔ میری آنکھوں کے سامنے انہوں نے دیوتا کے بت کو پامال کیا لیکن دیوتا نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا اور میں خاموشی کے ساتھ ان کے تشدد کو سہتا رہا۔ انہوں نے میری کھال نوچی، میرے اعضا توڑے اور میری صورت بگاڑ دی۔ مجھے اس زندان میں ہوش آیا جس سے میں اس فانی زندگی میں کبھی نجات نہیں پا سکوں گا۔

کچھ کرنے کی ناگزیریت سے مجبور ہو کر، کہ وقت کو کسی طرح گزارہ جائے، میں نے عقوبت خانے کی تاریکیوں میں وہ سب کچھ یاد کرنے کی کوشش کی جو مجھے معلوم تھا۔ غیر مختتم راتیں میں نے پتھر پر کھدے سانپوں کی ترتیب و تعداد یا ادویاتی درخت کی صحیح صورت یاد کرنے میں صرف کیں۔ اس طور بتدریج میں نے گزرے ہوئے برسوں کو زیر کیا۔ بتدریج میں نے وہ سب کچھ پھر سے پالیا جو میری ملکیت میں نہیں رہا تھا۔ ایک رات میں نے محسوس کیا کہ میں ایک بہت گہری یادآوری کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ سمندر کو دیکھ پانے سے پہلے مسافر خون کی گردش میں تیزی محسوس کرتا ہے۔

گھنٹوں بعد میں نے اس یادآوری کے ہلکے سے خاکے کا ادراک کیا۔ یہ دیوتا کی ایک حکایت تھی۔ تخلیق کے پہلے دن، اس پیش آگاہی کے تحت کہ وقت کے اختتام پر تاراجی اور تباہی کا دور دورہ ہوگا، دیوتا نے ایک طلسمی جملہ لکھا جس میں اتنی قوت تھی کہ اس شر کو ختم کر دے۔ اس نے اس انداز میں اسے لکھا کہ یہ بہت بعد کی نسلوں تک پہنچے اور کسی اتفاق سے آلودہ نہ ہو۔ کوئی نہیں جانتا کہ اسے کہاں لکھا گیا اور نہ ہی یہ کہ کس رسم الخط میں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ موجود ہے۔ ایک خفیہ تحریر، اور یہ کہ ایک منتخب انسان ہی اسے پڑھ سکے گا۔ میں نے سوچا کہ ہم ہمیشہ کی طرح اب وقت کے اختتام پر موجود ہیں اور دیوتا کے آخری پروہت کی حیثیت سے میری تقدیر مجھے اس تحریر کے وجدان کا شرف بخشے گی۔ اس حقیقت نے کہ قفس کی دیواروں نے مجھے باندھ رکھا تھا،

میری امید کو مجروح نہیں کیا۔ غالباً میں کہولوم کی تحریر ہزار ہا مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ بس اب اسے سمجھنے کی ضرورت تھی۔

اس خیال نے میری ہمت بندھائی اور میرے اندر عجیب طرح کے گھمیر کو جنم دیا۔ دنیا کے طول و عرض میں قدیم اشکال بھری ہوئی ہیں، فنا ناپذیر اور ابدی اشکال۔ ان میں سے کوئی بھی ایک علامت وہ ہو سکتی ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ ایک پہاڑ خدا کا کلام ہو سکتا تھا یا ایک دریا یا ایک سلطنت یا ستاروں کا جھرمٹ۔ لیکن صدیوں کے عمل میں پہاڑ ہموار ہو جاتے ہیں اور دریا کا راستہ بدلتا رہتا ہے۔ اور سلطنتیں تباہی اور بربادی سے دوچار ہوتی ہیں۔ ستاروں کی ترتیب بدلتی رہتی ہے۔ خود آسمان ایک سا نہیں رہتا۔ پہاڑ اور ستارہ افراد ہیں اور فرد کی زندگی فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ مجھے کسی زیادہ مستحکم، زیادہ ناقابل تغیر شے کی تلاش تھی۔ میں نے اناج کی، گھاس کی، پرندوں کی، انسانوں کی نسلوں کے بارے میں سوچا۔ شاید وہ سحر میرے ہی چہرے پر لکھا گیا ہو۔ غالباً میں خود ہی اپنی تفتیش کا مقصود تھا۔ انھی گہری قیاس آرائیوں کے درمیان مجھے خیال آیا کہ تیندوا بھی دیوتا کی صفات میں سے ایک ہے۔

اس خیال سے میری روح تقدس کے جذبے سے معمور ہو گئی۔ میں نے زمان کی اولین صبح کا تصور کیا۔ دیوتا کو اپنا پیغام تیندووں کی زندہ کھال پر رقم کرتے تصور کیا جو باہم جفتی کریں گے اور نامختتم انداز میں غاروں میں، بانس واڑیوں میں، جزیروں پر تولید و تناسل کا سلسلہ جاری رکھیں گے تاکہ آخری انسان اس پیغام کو وصول کر سکے۔ میں نے تیندوں کے اس گروہ، تیندووں کی ان کثیر بھول بھلیوں کا تصور کیا جو چراہ گاہوں اور جانوروں کے گلوں میں دہشت پھیلاتے رہے، ایک خاص ڈیزائن کو محفوظ رکھنے کے لیے۔ میں نے اپنے پڑوس میں اس کی موجودگی میں اپنے قیاس کی توثیق اور ایک خفیہ ودیعت کا ادراک کیا۔

میں نے طویل برس اس کی کھال پر موجود دھبوں کے جمگھٹ کی ہیئت اور ترکیب سمجھنے میں صرف کیے۔ دن بھر کی تاریکی کے دورانیوں میں روشنی کا ایک لمحہ مجھے تفویض ہوتا۔ یوں میں اس

قابل ہوا کہ زرد پوستین پر پھیلی سیاہ شکلوں کو اپنے ذہن میں بٹھا سکوں۔ ان میں سے چند ایک دائروں جیسی تھیں۔ کچھ ٹانگوں کی اندرونی جانب آڑی ترچھی لکیروں کی صورت میں تھیں۔ چند چھلوں جیسی تھیں جو ہر جگہ موجود تھیں۔ غالباً وہ ایک جیسی آواز یا لفظ کی مانند تھیں۔ بیشتر کے کنارے سرخ تھے۔

میں اپنی مشقتوں کی پر تھکن روداد بیان نہیں کروں گا۔ ایک سے زائد مرتبہ میں اس گنبد میں چیخ اٹھا کہ اس تحریر کو پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ بتدریج مجھے اس چیستان میں، جس پر میں نے غور وخوض کیا تھا، دیوتا کی تحریر کے عمومی چیستان کی نسبت کم الجھاؤ محسوس ہوا۔ کس نوع کا جملہ (میں نے خود سے پوچھا) ایک ذہن مطلق تشکیل دے سکتا ہے؟ میں نے سوچا کہ انسانی زبانوں میں کوئی قضیہ ایسا نہیں ہے جس سے مراد تمام کائنات نہ ہو۔ لفظ ''تیندوا'' کہنا ان تمام تیندووں کے ذکر کے مترادف ہے جنہوں نے اس لفظ کو جنم دیا، اور ان ہرنوں اور کچھووں کے مترادف بھی جنھیں اس نے ہڑپ کیا۔ وہ گھاس بھی جسے ہرن غذا کے طور پر استعمال کرتا رہا۔ وہ زمین بھی جو اس گھاس کو پیدا کرنے والی ہے اور وہ آسمان جس نے زمین کو روشنی دی۔

میں نے غور کیا کہ دیوتا کی لسانیات میں ہر لفظ حقائق کی لاانتہاء سلسلہ بندی کا دعویٰ دار ہوگا، ڈھکے چھپے انداز میں نہیں بلکہ قطعی طور پر، نہ ہی تدریجی طور پر بلکہ فی الفور۔ ایک وقت ایسا آیا کہ کسی الہامی کلمے کا تصور ہی مجھے طفلانہ اور گستاخانہ معلوم ہوا۔ میں نے سوچا دیوتا کو واحد لفظ ہی ادا کرنا چاہئے۔ اس ایک لفظ میں مطلق وسعت ہوگی۔ اس کا ادا کیا ہوا کوئی لفظ کائنات یا مجموعی طور پر تمام وقت سے کم نہیں ہوسکتا۔ انسانی الفاظ، جیسے تمام دنیا، کائنات، اس لفظ واحد کے سایے اور شبیہیں ہیں، جو خود ایک زبان اور اُس سب کچھ کے مساوی ہے، جس کا ایک زبان احاطہ کرسکتی ہے۔

ایک دن یا ایک رات کہ میرے دنوں اور راتوں میں بھلا اب کیا امتیاز باقی رہ گیا تھا، میں نے خواب دیکھا کہ زندان کے فرش پر ریت کا ایک ذرہ پڑا تھا۔ اسے درخور اعتنا نہ جان کر میں پھر سے سو گیا۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں بیدار ہوں اور فرش پر ریت کے دو ذرّے پڑے تھے۔

میں دوبارہ سو گیا۔ میں نے خواب دیکھا کہ ریت کے ذرے تین ہو گئے تھے۔ یوں ذرے بتدریج بڑھتے گئے حتیٰ کہ ان سے زندان بھر گیا اور میں ریت کے نیم کرے تلے دبا مر رہا تھا۔ میں نے خود کے سوئے ہوئے ہونے کا ادراک کیا۔ سخت کاوش کے بعد خود کو بیدار کیا۔ لیکن بیدار ہونا بے سود رہا۔ لاانتہا ریت میرا دم گھونٹ رہی تھی۔ کسی نے مجھ سے کہا ''تم بیداری کی حالت میں نہیں بلکہ ایک خواب میں جاگے ہو۔ یہ خواب ایک دوسرے خواب میں ملفوف ہے اور ایسا لامحدود طور پر پھیلا ہوا ہے جیسی لامحدود تعداد ریت کے ذروں کی ہے۔ جس راستہ کو تمہیں کھوجنا ہے، وہ غیر مختتم ہے۔ حقیقتاً بیدار ہونے سے پہلے ہی تم مر جاؤ گے''۔

میں مایوس ہو گیا۔ ریت سے میرا منہ بھر گیا لیکن میں چلایا ''خوابوں کی ریت مجھے قتل نہیں کر سکتی نہ ہی خوابوں کے اندر خواب کا کوئی وجود ہے۔'' روشنی کے ایک جھماکے نے مجھے بیدار کیا، تاریکی میں میرے اوپر روشنی کا ایک دائرہ نمودار ہوا۔ مجھے داروغہ زندان کا چہرہ اور ہاتھ، چرغی، رسی، گوشت کے قتلے اور پانی کا مرتبان دکھائی دیے۔

رفتہ رفتہ انسان اپنی قسمت کی ہیئت سے مماثل ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر انسان خود اپنے حالات ہی کا پروردہ ہوتا ہے۔ معمے حل کرنے والے یا انتقام لینے والے، اور دیوتا کے ایک پجاری سے کہیں بڑھ کر میں فقط ایک قیدی ہوں۔ خوابوں کی ان تھک بھول بھلیوں سے نکل کر میں درشت زندان خانے میں واپس آیا جیسے کوئی اپنے گھر لوٹتا ہے۔ میں نے اس کی سیلن کو دعا دی، اس کے تیندوے کو دعا دی، اس روزن کو دعا دی جو روشنی کے داخلے کا راستہ ہے۔ اپنے عمر رسیدہ اور دکھتے ہوئے بدن کو دعا دی، میں نے تاریکی اور پتھر کو دعا دی۔

تب وہ واقعہ ہوا جسے میں فراموش کر سکتا ہوں اور نہ بیان کر سکتا ہوں۔ یہ واقعہ خدا سے، کائنات سے اتصال کا واقعہ تھا۔ (مجھے علم نہیں ہے کہ کیا ان دونوں الفاظ کے معانی میں کوئی فرق ہے۔) وجدان اپنی علامتوں کو دہراتا نہیں ہے۔ ایک انسان خدا کو اندھا کر دینے والی روشنی میں دیکھ پاتا ہے تو دوسرے نے اسے ایک تلوار یا ایک گلاب کی پنکھڑیوں میں دیکھا۔ میں نے ایک غیر

معمولی بلند پہیہ دیکھا جو میری آنکھوں کے سامنے نہیں تھا، نہ میرے عقب میں تھا، نہ میری اطراف میں بلکہ بیک وقت ہر جگہ موجود تھا۔ یہ پہیہ آبی تھا لیکن ناری بھی۔ اور اگرچہ اس کے کنارے دکھائی دیتے تھے لیکن یہ غیر محدود تھا۔ یہ سبھی اشیا سے مل کر بنا تھا، جیسی وہ ہیں، جیسی وہ تھیں اور جیسی وہ ہوں گی، سبھی اشیا۔ جب کہ اس مجموعی بنت کے تاروں میں سے ایک تار میں خود تھا۔ پیڈرو دی الواراڈو، جس نے مجھ پر تشدد روا رکھا، دوسرا تار تھا۔ اسی میں علت و معلول پنہاں تھے اور اس پہیے کی دید ہی مجھے بلا اختتام ہر شے کو سمجھنے کے قابل بنانے کے لیے کافی تھی۔

آہ! جاننے کی مسرت، کامل تخیل یا سرور احساس سے عظیم تر ہے۔ میں نے کائنات کا مشاہدہ کیا اور کائنات کے مخفی نقشوں کو دیکھا۔ میں نے ''کتاب صلاح'' میں بیان کی گئی آفرینش کا نظارہ کیا۔ ان پہاڑوں کو دیکھا جو پانی کی سطح سے ابھرے۔ اولین جنگلی انسانوں کو دیکھا، پانی کے حوض دیکھے، جو انسانوں سے خائف ہو گئے۔ کتے جنہوں نے ان کے چہروں کو پامال کیا۔ بے چہرہ دیوتا جو دوسرے دیوتاؤں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں نے لاانتہاء عوامل کو دیکھا جو ایک مسرت کی تشکیل کرتے ہیں اور ان سب کو سمجھتے ہوئے میں تیندوے کی کھال کی تحریر کے ادراک کے بھی قابل ہو گیا۔

یہ چودہ بے ترتیب (بظاہر بے ترتیب) الفاظ کا ایک منتر تھا اور ان کی باآواز بلند ادائیگی مجھے بے انتہا طاقت ور بنانے کے لیے کافی تھی۔ پتھریلے زندان کو نیست و نابود کرنے، دن کی روشنی کے میری رات میں بھر جانے، جوان ہو جانے، لافانی بن جانے، الوراڈو کو شیر کے ذریعے چیروا دینے، ہسپانوی چھاتیوں میں مقدس خنجر گاڑ دیے جانے، نیز معبد کی تعمیر نو اور سلطنت کی حیات نو کے لیے ان الفاظ کو ادا کرنا کافی تھا۔ چالیس حروف، چودہ الفاظ اور میں، زینا کان، اس قلمرو پر حکومت کروں گا جس پر مونتیز ما کا تسلط تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں وہ الفاظ کبھی ادا نہیں کروں گا کیونکہ میں اب مزید زینا کان کو نہیں جانتا۔

چاہے تیندوے کی کھال پر رقم اسرار میرے ساتھ ہی فنا ہو جائے۔ جس کسی نے بھی کائنات

کا مشاہدہ کرلیا، جس نے کائنات کی آتشیں تراکیب کا ادراک کیا، اسے ایک عام انسان، ایک انسان کی معمولی خوش بختیوں اور سیہ بختیوں کا دھیان ہی کب آئے گا۔ چاہے وہ خود ہی وہی شخص ہو۔ کبھی وہ یہ شخص تھا، جواب مزید اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اس دوسرے شخص کی قسمت، اس دوسرے شخص کی قوم کی اس کے نزدیک کیا وقعت ہوسکتی ہے، جب کہ وہ کچھ بھی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس منتر کو ادا نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ میں یہاں تاریکی میں لیٹے ہوئے خود کو گزرتے دنوں کے ہاتھوں فنا ہوجانے دوں گا۔

# سب کچھ اور کچھ بھی نہیں

اس میں کوئی فرد نہیں تھا۔ اس کے چہرے (جو اس دور کی ناقص پینٹنگز میں بھی ایسا ہی ہے جیسا کسی دوسرے کا نہیں تھا) اور اس کے الفاظ (جو فراواں، تخیلاتی اور جذبات انگیز تھے) کے عقب میں معمولی کپکپی، ایک ایسے خواب کے سوا کچھ نہیں تھی جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ پہلے پہل اس نے سوچا سبھی اس جیسے تھے۔ لیکن ایک واقف کار، جسے اس نے اپنے کھوکھلے پن کا راز بتانے کی کوشش کی، کے چہرے کی حیرت نے اس پر آشکار کیا کہ وہ غلطی پر تھا اور اسے ہمیشہ کے لیے قائل کر لیا کہ ایک فرد کو کبھی اپنی نوع سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔

کبھی وہ سوچتا کہ شاید کتابیں اس کے درد کا مداوا ہو سکیں اور یوں اس نے کچھ لاطینی سیکھی۔ یونانی زبان میں اس کی مہارت اس سے کم تھی، جتنی اس کے کسی ہم عصر کو حاصل ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا جس شے کی اسے جستجو تھی، شاید وہ اسے انسانیت کی ایک بنیادی رسم کی ادائیگی میں ملے اور یوں جون کی ایک طویل شام کو اس نے خود کو اپنی ہیتھوے کے ہاتھوں مغلوب ہو جانے دیا۔

بیس سال کی عمر کے لگ بھگ وہ لندن چلا گیا۔ جبلی طور پر وہ پہلے ہی سے خود کو اس عادت کی تربیت دے چکا تھا کہ وہ کوئی فرد ہونے کا سوانگ بھرے رکھے تا کہ یہ راز افشا نہ ہو سکے کہ وہ کچھ نہیں تھا۔ لندن میں اس نے ایسے پیشے میں اپنی جگہ بنائی جو اس کا مقدر تھا۔ وہ اداکار بن گیا، یعنی ایسا شخص جو سٹیج پر دوسرا شخص ہونے کا ڈھونگ بھرتا ہے۔ اداکاری نے اسے عجیب سرخوشی

سے دو چار کیا، جس سے غالباً وہ پہلے یکسر نابلد تھا۔ لیکن جب آخری مکالمہ ادا کیا جاتا اور تالیوں کی گونج میں سٹیج سے آخری لاش ہٹالی جاتی تو غیر حقیقی پن کا قابل نفرین احساس پھر سے اس پر غالب آ جاتا۔ وہ نہ فیریکس رہتا نہ تیمور لنگ۔ پھر سے 'نا ہستی' بن جاتا۔

اس کیفیت میں گرفتار، اس نے دوسرے سورماؤں اور دوسرے المیہ قصوں کو تصور کیا۔ ایک طرف جہاں اس کا جسم لندن کے چکلوں اور مے کدوں میں ایک جسم کے طور پر اپنی زندگی گزارتا رہا، تو اس میں موجود روح، کبھی سیزر ہوتی جس نے پیشین گوئیاں کرنے والوں کی تنبیہ پر توجہ نہیں دی تھی، اور جولیٹ ہوتی جو لوے پرندے سے نفرت کرتی تھی اور میکبتھ ہوتی جو جھاڑی دار میدان میں جادوگرنیوں سے کلام کرتی جو تقدیر بھی تھیں، تین عجیب بہنیں۔ کوئی شخص کبھی بیک وقت اتنے بہت سے اشخاص نہیں رہا، جس کا تمام تر فن، مصری دیوتا پروٹیئس کی طرح صرف یہی ہو کہ موجود ہونے کی سبھی ممکنہ صورتوں کا ڈھونگ رچایا جائے۔

کبھی کبھار اپنی تحریروں میں کہیں اس سے اعتراف سرزد ہو جاتا، لیکن اس ابہام کے ساتھ کہ اسے سمجھا ہی نہ جا سکے۔ رچرڈ یقین سے کہتا ہے کہ اپنی ہستی میں وہ بہت سے کردار ادا کرتا رہا اور آئیگو عجیب الفاظ میں کہتا ہے "میں وہ نہیں ہوں، جو کہ میں ہوں۔"

بیس سال وہ اس منضبط التباس کی گرفت میں رہا لیکن ایک صبح وہ ایسے بہت سے بادشاہ، جو تلوار کی دھار سے ہلاک ہوئے، اور بہت سے ناخوش عاشق ہونے کی کثرت اور دہشت سے مغلوب ہو گیا کہ جو ملتے ہیں، جدا ہوتے ہیں اور پھر خوش آہنگی سے مر جاتے ہیں۔ اسی دن اس نے اپنا تھیئٹر بیچنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ وہ اپنی جائے پیدائش لوٹا جہاں اس نے بچپن کے دور کے درختوں اور دریا کو پھر سے پالیا۔ اس نے انھیں ان درختوں اور دریاؤں سے نہیں ملایا جنھیں اس کے تفکر نے شان دار، اور اس کے اسطوریاتی کنایوں اور لاطینی کہاوتوں نے بے مثال بنایا تھا۔

اسے کچھ نہ کچھ تو ہونا تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ ناظم تفریحات بن گیا جس نے نام کمایا اور

جس کی دلچسپی قرضوں، مقدمہ بازیوں اور معمولی سود خوری میں تھی۔ اسی کردار کی جون میں اس نے وہ آخری بے کیف وصیت نامہ لکھوایا جس سے ہم آج آگاہ ہیں، اور جس میں اس نے جان بوجھ کر جذبات اور ادب کا شائبہ تک نہ رکھا۔ لندن سے اس کے دوست اسے ملنے آتے اور ان کے لیے وہ پھر سے ایک شاعر کا کردار اوڑھ لیتا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مرنے سے پہلے یا اس کے بعد اس نے خود کو خدا کے حضور پایا اور بولا، ''میں جو بے کار ہی اتنے بہت سے اشخاص رہا، ایک ہی شخص ہونا چاہتا ہوں، خود اپنا آپ۔''

خدا نے ایک بگولے کے ذریعے اس سے کلام کیا ''میں خود بھی، میں نہیں ہوں۔ میں نے دنیا کا ایسے خواب دیکھا تھا جیسے تم نے، میرے شیکسپیئر، اپنے ناٹکوں کا خواب دیکھا، اور میرے خواب ہی کی مختلف شکلوں میں سے ایک شکل تم ہو، تم جو میری ہی طرح بہت سے افراد ہو، اور کچھ بھی نہیں ہو۔''

# تلوار کا زخم

ایک کریہہ صورت زخم کا نشان اس کے چہرے پر کھنچا تھا۔ راکھ کے رنگ کی، تقریباً مکمل محراب جس نے ایک سرے پر اس کی کنپٹی میں جھری ڈالی تھی۔ وہ دوسرے سرے پر اس کے رخسار تک یہ جھری کھنچی ہوئی تھی۔ اس کا اصل نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ٹاکیوریمبو میں اسے ہر کوئی 'لاکولوراڈو کا انگریز' کہتا تھا۔ ان کھیتوں کے مالک کارڈوسو نے یہ کھیت اسے بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تب انگریز نے اسے جو دلیل تھی وہ کسی کے گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس نے کارڈوسو کو اس زخم کا راز بتایا تھا۔ انگریز، ریوگرینڈی ڈیلسر کے سرحدی علاقے سے آیا تھا۔ وہاں بہت سوں کے خیال میں وہ برازیل کا سمگلر تھا۔

کھیتوں میں بے تحاشا گھاس اگی ہوئی تھی۔ نخالص نمکین پانی سے گڑھے بھرے تھے۔ ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے انگریز نے مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سفاکی کی حد تک سخت گیر تھا۔ لیکن محتاط انداز میں منصف مزاج بھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ شرابی تھا۔ سال میں ایک یا دو بار خود کو اوپر چھت والے کمرے میں بند کر لیتا۔ دو تین دنوں کی قید کے بعد کمرے سے یوں برآمد ہوتا جیسے کسی جنگ یا کسی چکرویو سے باہر آیا ہو، زردرُو، کانپتا ہوا، الجھا ہوا اور ہمیشہ کی طرح حاکمانہ انداز کے ساتھ۔ مجھے اس کی سرد مہر آنکھیں، توانا دبلا پن، بھوری مونچھیں یاد ہیں۔ اس کا کسی سے میل جول نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کی ہسپانوی زبان خام اور برازیلین لہجے میں گڈمڈ تھی۔ کاروباری خط یا کسی پمفلٹ کے سوا اس کے لیے کبھی کوئی ڈاک نہ

آتی۔

پچھلی مرتبہ میں جنوبی صوبوں سے گزرا تو کاراگوٹا کی جھیل میں آنے والے سیلاب نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں وہ رات لا کولوراڈا میں بسر کروں۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے احساس ہوا کہ میری یہاں آمد بے موقع تھی۔ میں نے انگریز کا دل جیتنے کی کتنی ہی کوشش کی اور ایسا کرنے کے لیے حب الوطنی کے جذبے سے رجوع کیا جو جذبات میں سب سے کم قابل توجہ ہے۔ میں نے کہا کہ انگلستان جیسی روح والا ملک نا قابل شکست ہے۔ میرا مخاطب متفق تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری بات میں اضافہ کیا کہ وہ انگریز نہیں تھا۔ وہ آئرش تھا، ڈنگاروان سے۔ یہ کہتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھکا جیسے کوئی راز اس سے افشا ہو گیا ہو۔

رات کے کھانے کے بعد ہم آسمان کا نظارہ کرنے کے لیے باہر نکلے۔ مطلع صاف تھا لیکن دور چھوٹی چوٹیوں کے پار جنوبی آسمان بجلی کی گرج چمک سے کٹا پھٹا اور رخنوں سے پُر معلوم ہوتا اور آنے والے طوفان کی آمد کا پتہ دیتا تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں صاف ستھرے کھانے کے کمرے میں جس ملازم نے رات کا کھانا پروسا تھا، وہ اب رم کی بوتل لے آیا۔ دیر تک ہم پیتے رہے، خاموشی کے ساتھ۔

میں نہیں جانتا کہ تب کیا وقت ہوا ہو گا جب میں نے محسوس کیا کہ میں نشے میں دھت ہو چکا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کس تحریک، یا کیسے جوش مسرت یا کیسی اکتاہٹ نے مجھے اس زخم کے نشان کے ذکر پر مجبور کیا۔ انگریز کے چہرے پر تاثرات بدلے۔ کافی دیر تک مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ مجھے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دے گا۔ آخر کار وہ یکسر معمول کی آواز میں بولا ''میں ایک شرط پر آپ کو اس زخم کی کہانی سناؤں گا کہ کسی طرح کی نفرت یا لعن طعن کے اظہار پر قدغن نہیں لگائی جائے گی۔''

میں نے اتفاق کیا۔ یہ وہ کہانی ہے جو اس نے مجھے سنائی، اپنی انگریزی کو ہسپانوی اور حتیٰ کہ پرتگیزی میں گڈمڈ کرتے ہوئے۔

''1922 کے لگ بھگ کناٹ کے شہروں میں سے ایک میں، میں ان بہت سے نوجوانوں میں شامل تھا جو آئر لینڈ کی آزادی کی تحریک میں شریک تھے۔ میرے رفقا میں سے چند ایک آج بھی زندہ ہیں، قیام امن کی کوششوں میں مصروف کار۔ جب کہ باقی رفقا اس کے برعکس انگریزی حکومت کے جھنڈے تلے صحرا اور سمندر میں برسر پیکار ہیں۔ میرے رفقا میں سب سے بہتر شخص جیل کے صحن میں صبح سویرے نیند سے مدہوش انسانوں کے ہاتھوں گولی لگنے سے ہلاک ہوا۔ جب کہ باقی رفقا (جو کسی طور بدقسمت بھی نہیں تھے) ملکی خانہ جنگی کے دوران مختلف گمنام اور تقریباً خفیہ جنگوں میں اپنے انجام سے دوچار ہوئے۔ ہم رپبلیکنز ہیں، کیتھولک ہیں۔ مجھے شک ہے ہم رومانویت پسند ہیں۔ آئر لینڈ ہمارے لیے صرف ایک مثالی مستقبل اور ناقابل برداشت حال ہی نہیں تھا بلکہ یہ ایک تلخ مگر محبت آمیز اسطورہ تھا۔ یہ دائروی مینار اور سرخ دلدلیں تھا۔ یہ پارنل کی تردید تھا اور یہ وہ شان دار طویل نظمیں تھا جو ان سانڈوں کی چوری کی داستانوں پر مبنی تھیں جو پچھلے جنم میں سورما تھے، اور کسی دوسرے جنم میں مچھلی، اور پہاڑ۔

ایک شام جو مجھے کبھی نہیں بھولتی، منسٹر سے، ہمارا ایک رفیق، یہاں آیا۔ اس کا نام جان ونسنٹ مون تھا۔

''وہ بمشکل بیس سال کا ہوگا۔ دبلا پتلا مگر ڈھیلے اعصاب والا شخص۔ اسے دیکھ کر یہ ناگوار تاثر ملتا جیسے وہ ریڑھ کی ہڈی کے بغیر ہو۔ اس نے جوش اور زعم کے ساتھ اشتراکی کتابچوں کا ہر صفحہ چاٹ ڈالا تھا۔ وہ ہر بحث کو ختم کرنے کے لیے جدلیاتی مادیت کو استعمال کرتا۔ دوسروں سے نفرت اور محبت کرنے کی وجوہات لامحدود ہوتی ہیں۔ مون نے عالمی تاریخ کو گھٹیا معاشی تنازعے تک محدود کر لیا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ہر انقلاب کے مقدر میں کامیاب ہونا لکھا ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ایک معزز شخص کے لیے ناکام تحریکیں ہی زیادہ پرکشش ہوتی ہیں۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ ہم نے ہال میں، سیڑھیوں میں اور بعد میں مبہم گلیوں میں ایک دوسرے سے اختلاف جاری رکھا۔

مون جو رائے دیتا، اس سے میں کم متاثر ہوتا بنسبت اس کے نا قابل تردید اور حتمی سچ بیان کرنے والے لہجے سے۔ وہ نہ دلیل دیتا تھا، نہ بحث کرتا تھا۔ وہ فیصلے سناتا تھا، حقارت اور کسی حد تک غصے میں۔

اس رات ہم شہر کے آخری گھروں تک پہنچ گئے تھے، جب گولیوں کی اچانک بوچھاڑ نے ہمیں ششدر کر دیا۔ (شاید اس سے پہلے ہی یا بعد میں ہم ایک کارخانے یا جیل کی خالی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے تھے۔) ہم ایک غیر ہموار گلی میں جا نکلے۔ ایک سپاہی، آگ کی روشنی میں بڑا دکھائی دیتا ہوا، ایک جلتی ہوئی جھونپڑی سے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ چیختے ہوئے اس نے ہمیں رک جانے کا حکم دیا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میرے رفیق نے میری پیروی نہ کی۔ میں اس کی طرف مڑا۔ جان ونسنٹ مون ایسے بے حرکت کھڑا تھا جیسے کسی خرگوش کو گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے جا لیا ہو۔ خوف نے اسے جکڑ لیا تھا۔ میں واپس بھاگا۔ ایک ہی گھونسے سے سپاہی کو نیچے گرایا، ونسنٹ کو ہلایا جھلایا، اسے ملامت کی اور پیچھے چلنے کو کہا۔ مجھے اس کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنا پڑا۔ خوف کے دباؤ نے اسے فالج زدہ کر دیا تھا۔ لیکن پھر ہم بھاگے۔ ہم شعلوں سے تار تار ہوتی ہوئی رات میں بھاگے۔ ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور ایک گولی مون کے دائیں کندھے کو زخمی کر گئی۔ ہم صنوبر کے درختوں میں سے گزر رہے تھے جب وہ سسکیاں لے کر رو دیا۔

1923 کے موسم خزاں میں میں قریب قریب روپوش ہو گیا اور جنرل برکلے کے دیہاتی گھر میں پناہ لی۔ جنرل (جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا) کسی تنظیمی ذمہ داری یا کسی اور وجہ سے بنگال میں متعین تھا۔ وہ گھر ایک صدی سے کم پرانا تھا۔ لیکن خستہ حال اور حزن زدہ تھا اور پیچیدہ برآمدوں اور بے مقصد پیش کمروں سے بھرا ہوا تھا۔ عجائب خانہ اور کتب خانہ پہلی منزل میں تھا۔ وہاں متنازعہ اور متضاد کتابیں موجود تھیں جو ایک اعتبار سے انیسویں صدی کی تاریخ کا احاطہ کرتی تھیں۔ نیشاپور کی تلواریں جن کے خم میں ابھی تک جنگ کے شور اور تشدد کی باقیات قید معلوم ہوتی تھیں۔

(میرے خیال میں مجھے یاد ہے) ہم پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوئے۔ مون کانپتا ہوا، خشک گلے کے ساتھ بڑبڑایا کہ رات کے واقعات عجیب تھے۔ میں نے اس کے زخم پر مرہم لگایا اور پٹی کی اور اسے چائے کا پیالہ بھر کر دیا۔ زخم معمولی تھا۔ اچانک اس نے گھبراہٹ میں ہکلانا شروع کر دیا۔

''تم نے بڑا خطرہ مول لیا تھا، مجھے بچانے کے لیے واپس آ کر۔''

میں نے اسے بتایا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ (خانہ جنگی کی تربیت نے مجھے یہ سب کچھ کرنے کے لیے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ یوں بھی ہم میں سے کسی ایک رکن کی گرفتاری ہماری تحریک کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔)

''اگلے دن مون کی حالت بہتر ہو گئی۔ اس نے مجھ سے ایک سگریٹ لیا اور ہماری انقلابی جماعت کے مالی وسائل سے متعلق سخت پوچھ تاچھ کی۔ اس کے سوالات قابل فہم تھے۔ میں نے (خلوص دل سے) اعتراف کیا کہ صورت حال واقعی سنگین تھی۔

گولیوں کی بوچھاڑ نے جنوبی علاقے میں آگ بھڑکا دی تھی۔ میں نے مون سے کہا کہ ہمارے رفقا ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میرا اوورکوٹ اور ریوالور میرے کمرے میں تھا۔ میں لوٹا تو مون کو صوفے پر لیٹے ہوئے پایا، بند آنکھوں کے ساتھ۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ اسے بخار تھا۔ اس نے اپنے کندھے میں دردناک کھنچاؤ کی شکایت کی۔

تبھی میں سمجھ گیا کہ اس کی بزدلی ناقابل اصلاح تھی۔ میں نے بے دلی سے اس سے کہا کہ وہ اپنا خیال رکھے اور باہر چلا آیا۔ اس خوف زدہ انسان نے مجھے پریشانی میں مبتلا کیا۔ میں اس شخص پر شرمندہ تھا جیسے ونسنٹ مون نہیں بلکہ میں خود بزدل تھا۔ جب ایک انسان کچھ کرتا ہے، تو یہ کچھ ایسا ہی ہے کہ سبھی انسانوں نے ویسا ہی کیا ہو۔

اسی باعث یہ بات غیر مناسب نہیں ہے کہ کسی باغ میں کسی ایک فرد کا حکم عدولی کرنا، تمام انسانیت کو آلودہ کر جائے۔ اسی باعث یہ بات بھی غیر موزوں نہیں ہے کہ ایک یہودی کا

صلیب پر چڑھ جانا، انسانیت کو نجات دلانے کے لیے کافی ہو۔ شاید شوپن ہار درست کہتا ہے۔ میں ایک دوسرا شخص ہوں۔ سبھی انسانوں میں کوئی ساجھی ایک انسان۔ شیکسپیئر ایک اعتبار سے مفلوک الحال جان ونسنٹ مون ہی ہے۔

''ہم نے جنرل کے کشادہ گھر میں نو دن گزارے۔ جنگ کی اذیتوں اور اس تاریک جنگ میں کامیابیوں کی داستان میں یہاں نہیں چھیڑوں گا۔ میرا مقصد اس زخم کے نشان کی تاریخ بیان کرنا ہے جو میرے لیے توہین آمیز ہے۔ میری یادداشت میں وہ نو دن مل کر ایک ہی دن بنتے ہیں، سوائے آخری سے اگلے دن کے، جب ہمارے ساتھیوں نے بیرکوں پر حملہ کیا اور ان سولہ ساتھیوں کی موت کا بدلہ لیا جنھیں ایلفن میں مشین گن کی گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔

میں صبح کے قریب، علی الصبح کی الجھن میں گھرا ہوا گھر سے نکل جاتا۔ رات ہونے پر لوٹتا تھا۔ میرا رفیق اوپر کمرے میں میرا انتظار کر رہا ہوتا۔ اس کا زخم اس کے نچلی منزل تک آنے میں مانع تھا۔ میں اسے یاد کرتا ہوں تو اسے ہاتھ میں ایف این ماؤد یا کلازوٹز کی حکمت عملی کی کتاب پکڑے دیکھتا ہوں۔ 'میرا سب سے پسندیدہ ہتھیار، فوجی دستہ ہے'، اس نے ایک رات میرے سامنے اعتراف کیا۔ اس نے ہمارے منصوبوں کے بارے میں پوچھا۔ اسے ان پر سخت تنقید کرنے یا ان کے بارے میں سوچنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ ہمارے قابل افسوس معاشی وسائل پر اظہار تاسف کرتا۔ حتمی لہجے میں اور سنجیدگی کے ساتھ وہ ہمارے تباہ کن اختتام کی پیشین گوئی بھی کرتا۔ وہ بڑبڑاتا، 'C'est une affaire flambee'۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ظاہری بزدلی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، وہ اپنی ذہنی نخوت کا خوب مظاہرہ کرتا۔ اچھے یا برے، وہ نو دن گزر گئے۔

''دسویں دن شہر پر حتمی طور پر 'بلیک اینڈ ٹینز' کا قبضہ ہو گیا۔ دراز قد، خاموش گھڑسوار سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ ہوا میں راکھ اور دھواں بھرے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں ایک لاش مجھے زمین پر گری ہوئی دکھائی دی۔ یہ منظر میری یادداشت میں اس پتلے کی نسبت کم روشن ہے جسے

فوجیوں نے نشانہ پکا کرنے کے لیے چوک کے وسط میں کھڑا کیا تھا۔ میں وہاں سے چلا تو صبح کی روشنی نے آسمان پر لہریں بنا شروع کیا تھا۔ دوپہر سے پہلے میں لوٹ آیا۔ مون کتب خانے میں کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے لہجے سے لگا کہ وہ فون پر کسی سے مخاطب تھا۔ میں نے اپنا نام سنا۔ اور یہ کہ 'میں سات بجے تک لوٹوں گا'۔ اور یہ بھی کہ وہ مجھے تب گرفتار کر سکتے تھے جب میں باغ میں سے گزر رہا ہوں گا۔ میرا سیانا دوست سمجھ داری کے ساتھ مجھے فروخت کر رہا تھا۔ میں نے سنا وہ ذاتی تحفظ کی ضمانت مانگ رہا تھا۔

یہاں میری کہانی الجھ جاتی اور کچھ تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں میں نے اس مخبر کا سیاہ دہشت ناک کمروں اور غنودگی بھری گہری سیڑھیوں میں تعاقب کیا۔ مون اس گھر سے اچھی طرح واقف تھا، میری ہی طرح اس کے ہر گوشے سے۔ ایک یا دو بار وہ میری نظروں سے اوجھل ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کہ سپاہی مجھے روکتے، میں نے اسے ایک نکڑ میں دھکیلا۔ جنرل کے اسلحے کے نوادرات میں سے میں نے ایک چھوٹی تلوار کھینچ نکالی تھی۔ اسی کی نصف چاند کی دھار سے میں نے اس کے چہرے پر نقش بنایا، خون کا چاند۔ بورخیس، تم جو میرے لیے اجنبی ہو، میں نے تمہارے سامنے یہ اعتراف کیا۔ تمھاری نفرت میرے لیے اذیت دہ نہیں ہے۔"

یہاں پہنچ کر راوی رک گیا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"اور مون؟" میں نے پوچھا۔ "اس کا کیا بنا؟"

"اس نے اپنی غداری کی رقم سمیٹی اور برازیل بھاگ گیا۔ اسی شام شہر کے چوک میں میں نے دیکھا چند شرابی ایک پتلے پر گولیاں برسا رہے تھے۔"

میں نے باقی کہانی کا بے کار ہی انتظار کیا۔ آخر اس سے رخصت مانگی۔ اس کے جسم میں ایک سسکی کی کپکپاہٹ بیدار ہوئی۔ اس نے نقاہت سے، نرمی سے زخم کے قوسی سفید نشان کی طرف اشارہ کیا اور ہکلایا، "تم میرا یقین نہیں کرتے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں اپنے چہرے پر اپنی بدنامی کا نشان لیے پھرتا ہوں۔ میں نے تمھیں یہ کہانی اس لیے سنائی ہے تاکہ تم اسے اختتام تک

سن سکو۔ یہ میں ہی تھا جس نے اس شخص سے غداری کی جس نے مجھے پناہ دی۔ میں ہی ونسنٹ مون ہوں۔ اب مجھ سے نفرت کرو۔"

# انتظار

ایک ٹیکسی نے اسے بیونس ایریز کے شمال مغربی حصہ میں ایک گلی میں چار ہزار چار نمبر گھر کے سامنے اتارا۔ ابھی صبح کے نو نہیں بجے تھے۔ اس شخص نے داغدار چنار کے درختوں، ان میں سے ہر ایک کے تلے زمین کے مربع قطعہ، مختصر چھجوں والے معزز گھروں، برابر ہی موجود دواخانہ اور روغن اور ہارڈ ویئر کی دکان کی کھڑکیوں کے معین نما مانند پڑے شیشوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

ہسپتال کی بے دریچہ طویل دیوار گلی کی دوسری جانب فٹ پاتھ کے عقب میں ایستادہ تھی۔ مزید آگے سورج کی شعاعیں پودوں کے شیشہ گھروں سے ہو کر نیچے اتر رہی تھیں۔ اس شخص نے سوچا یہ چیزیں (جواب بے قاعدہ، اتفاقی اور بغیر کسی تنظیم کے ہیں، خوابوں میں دیکھی جانے والی اشیا کی طرح) کسی وقت، اگر خدا نے چاہا تو نا قابل تغیر، ضروری اور مانوس ہو جائیں گی۔ دواخانہ کی کھڑکی پر چینی مٹی سے ''بریسلیئر'' لکھا گیا تھا۔ یہودی اطالویوں کو پرے دھکیل کر ان کی جگہ لے رہے تھے جنھوں نے ''کری اولیز'' کو راستے سے ہٹایا تھا۔ یہی بہتر تھا۔ اس شخص نے بہتر جانا کہ اپنے جیسوں سے میل ملاقات سے احتراز کیا جائے۔

ٹیکسی والے نے صندوق نیچے اتارنے میں اس کی مدد کی۔ ایک عورت نے جو پریشان یا تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی، آخر کار دروازہ کھولا۔ اپنی نشست سے ٹیکسی والے نے مختلف سکوں میں سے ایک اسے واپس کیا، یوراگوئے کے بیس سینٹاوو کا سکہ جو میلو کے ہوٹل میں رات سے اس کی

جیب میں تھا۔ آدمی نے اسے چالیس سینٹاووز دیے اور فوراً محسوس کیا ''مجھے کچھ ایسا کرنا چاہئے کہ سبھی مجھے معاف کر دیں۔ میں دو غلطیاں کر چکا ہوں۔ میں نے ایک غیر ملکی سکہ استعمال کیا، اور پھر ایسا ظاہر کیا کہ اس غلطی سے مجھے واقعی فرق پڑتا ہے۔''

عورت کی رہنمائی میں آگے بڑھتے ہوئے وہ داخلی ہال اور ابتدائی صحن میں سے گزرا۔ جو کمرہ اس کے لیے مختص کیا گیا تھا، وہ سیدھے ایک دوسرے صحن میں کھلتا تھا۔ بستر لوہے کا بنا تھا، اور کاریگر نے اسے عجیب و غریب لہریوں کی صورت میں موڑا تھا جو شاخوں اور بیلوں کے نرم گچھوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ صنوبر کی لکڑی کی ایک بلند قامت الماری، بستر کے پہلو میں پڑی ایک میز، کتابوں سے لدی ہوئی ایک فرشی شیلف، دو کڈھب کرسیاں اور ہاتھ دھونے کا سٹینڈ، ایک بیسن، مرتبان، صابن دانی اور دھندلے شیشے کی بوتل کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

بیونس ایریز کے صوبے کا نقشہ اور مصلوب عیسیٰ کی تصویر دیواروں پر سجی تھیں۔ دیواری کاغذ قرمزی رنگ کا تھا، پھیلی ہوئی دموں والے بڑے بڑے موروں کے خاکے والا۔ واحد دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ صندوق اندر لانے کے لیے کرسیوں کی جگہ تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ کرایہ دار نے کسی بات پر اعتراض نہ کیا۔ عورت نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے جواب دیا ''ویلری''، کسی خفیہ چیلنج کے طور پر نہیں، نہ اس تذلیل میں تخفیف کے لیے جو وہ محسوس نہیں کر پایا تھا، بلکہ اس لیے کہ یہ نام اس کے لیے تکلیف دہ تھا، کیوں کہ اس کے لیے غیر ممکن تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے نام کے بارے میں سوچے۔ بے شک وہ اس ادبی مغالطے کا شکار نہیں ہوا کہ دشمن کا نام اختیار کرنا ایک زیرک حکمت عملی ہو سکتی ہے۔

شروع میں تو ویلری گھر سے بالکل باہر نہ نکلتا۔ لیکن چند ہفتوں بعد اس نے غروب آفتاب کے وقت کچھ دیر باہر چہل قدمی کی عادت اختیار کی۔ ایک رات وہ تین بلاک دور ایک سینما گھر گیا۔

وہ کبھی سینما میں آخری نشستوں کی قطار سے آگے نہ بڑھتا۔ ہمیشہ فلم کے اختتام سے کچھ دیر

پہلے ہی اٹھ آتا۔ جرائم پیشہ لوگوں کی المیہ کہانیوں پر مبنی فلمیں دیکھتا۔ یہ کہانیاں بلاشبہ اغلاط سے پُر ہوتیں۔ لیکن یہ بلاشبہ ایسے واقعات پر مشتمل ہوتیں جو اس کی سابقہ زندگی سے جڑے ہوئے تھے۔ ویلری نے ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ فن اور حقیقت میں مشابہت کا تصور اس کے لیے اجنبی تھا۔ وہ منفعل انداز میں چیزوں کو پسند کرنے کی کوشش کرتا، وہ اس مقصد کو صحیح صحیح سمجھنا چاہتا تھا جس کے تحت انہیں دکھایا جاتا تھا۔ ناول پڑھنے کے عادی لوگوں کے برعکس اس نے خود کو کبھی کسی فن پارے کا کردار تصور نہیں کیا۔

کوئی خط حتی کہ کوئی گشتی چٹھی بھی کبھی اس کے نام نہیں آئی لیکن ایک مبہم امید کے ساتھ وہ ہمیشہ اخبار کا کوئی ایک سیکشن ضرور پڑھ لیتا۔ سہ پہر کو وہ کرسی دروازے کے پاس سرکا لیتا، اور متانت سے ماتے بناتا اور پیتا۔ اس کی نگاہیں برابر ہی ایستادہ متعدد منزلوں والی عمارت کی دیوار پر پھیلی انگور کی بیل پر جمی رہتی تھیں۔ تنہائی کے برسوں نے اسے سکھایا تھا کہ انسان کی یادداشت میں سبھی دن ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں ہوتا، چاہے وہ عقوبت خانہ میں گزرے یا ہسپتال میں، جو حیرتوں سے پُر نہ ہو اور جو چھوٹی چھوٹی حیرتوں کا ایک شفاف جال نہ ہو۔

دوسری نوع کی قید و بند میں اس نے دنوں اور گھنٹوں کا شمار کرنے کا مشغلہ اپنایا تھا۔ لیکن اس بار اسیری مختلف تھی۔ اس کا کوئی اختتام نہیں تھا۔ جب تک کہ کسی صبح اخبار میں الجندرو ویلری کی موت کی خبر شائع نہ ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ویلری پہلے ہی مر چکا ہو۔ اس صورت میں یہ زندگی ایک خواب ثابت ہوتی۔ اس امکان کے تصور نے اسے پریشان کیا کیوں کہ وہ کبھی صحیح طور پر نہیں جان سکا کہ یہ بات باعث اطمینان تھی، یا بدبختی۔ اس نے خود سے کہا کہ یہ سب لغو تھا اور پھر اسے غیر ممکن قرار دیا۔ دیر آشنا دنوں میں، جو دو یا تین ناقابل تنسیخ افعال کی نسبت گزران وقت کے سبب نسبتاً کم دیر آشنا معلوم ہوتے تھے، اس نے غیر محتاط جذبے کے ساتھ بہت سی چیزوں کی خواہش کی۔ یہ طاقتور ارادہ جس نے انسانوں کی نفرت اور عورتوں سے محبت کو انگیخت کیا تھا، اب کسی خاص

شے کا متمنی نہیں تھا۔ یہ محض باقی رہنے کا خواہاں تھا، تا کہ کبھی فنا نہ ہو۔ ماتے کا ذائقہ، سیاہ تمباکو کا تلذذ، صحن کو بتدریج ڈھانپتی سایوں کی پھیلتی قطار، اس کے لیے یہ لذات کافی تھیں۔

گھر میں ایک بھیڑیا نما کتا بھی تھا جو اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ ویلری نے اس سے دوستی گانٹھ لی۔ وہ اس سے ہسپانوی میں، اطالوی میں اور بچپن کی دیہاتی بولی کے، اس کی یادداشت میں باقی رہ جانے والے الفاظ میں گفتگو کرتا۔ ویلری نے اپنے سادہ حال ہی میں زندہ رہنے کی کوشش کی، یادوں یا توقعات کے بغیر۔ جب کہ اول الذکر کی اس کی نزدیک مؤخر الذکر کی نسبت کہیں کم اہمیت تھی۔ مبہم انداز میں اس نے سوچا کہ وہ دیکھ سکتا تھا کہ ماضی اسی شے سے بنا تھا، جس سے وقت تشکیل پاتا ہے۔ اس باعث وقت فوراً ہی ماضی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کی اکتاہٹ کسی روز قناعت کے احساس میں بدل جاتی۔ ان لمحوں میں وہ خود کو کتے سے زیادہ پیچیدہ محسوس نہیں کرتا تھا۔

ایک رات وہ اپنے منہ کے پچھلے حصے میں جانی پہچانی تکلیف کی لہر پر ششدر رہ گیا اور کانپ اٹھا۔ یہ ہولناک معجزہ چند منٹوں میں دوبارہ رونما ہوا اور پھر علی الصبح بھی۔ اگلے دن ویلری نے ایک ٹیکسی منگوائی جس نے اسے شہر کے ایک علاقے میں دندان ساز کے مطب تک پہنچایا۔ اسے اپنا دانت نکلوانا پڑا۔ جسمانی اذیت کے ان لمحوں میں اس نے دوسرے لوگوں سے زیادہ بزدلی، اور نہ ہی زیادہ آسودہ خاطری محسوس کی۔

ایک اور رات فلم سے لوٹتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ کوئی اسے دھکیل رہا تھا۔ نفرت، خفگی، اور مخفی احساس طمانیت کے ساتھ وہ گستاخ شخص کی طرف مڑا۔ اس نے اسے ایک ننگی گالی دی۔ دوسرے آدمی نے حیران ہوتے اور ہکلاتے ہوئے معذرت طلب کی۔ وہ دراز قد، جوان، سیاہ بالوں والا انسان تھا۔ اس کے ہمراہ جرمن دکھائی دینے والی ایک عورت تھی۔ اس رات ویلری نے خود سے بار بار دہرایا کہ ''وہ انہیں نہیں جانتا۔'' تاہم اگلے چار پانچ دن تک اس نے گلی کا رخ نہ کیا۔

شیلف پر دھری کتابوں کے بیچ ''ڈیوائن کامیڈی'' کی ایک جلد موجود تھی، اینڈریولی کی ایک پرانی شرح کے ساتھ۔ تجسس کی نسبت ایک طرح کے فرض کے احساس سے تحریک پا کر ویلری نے اس بڑے فن پارے کا مطالعہ شروع کیا۔ طعام سے قبل وہ ایک کینٹو پڑھتا اور پھر سخت پابندی کے ساتھ شرح کا مطالعہ کرتا۔ اس نے جہنم کی سزاؤں کو ناقابل یقین یا زائد از ضرورت قرار نہیں دیا۔ نہ یہ سوچا کہ دانتے اسے مجرم گردانتے ہوئے جہنم کے آخری حلقے میں پھینکے گا جہاں گولینو کے دانت مسلسل روگری کی گردن کو چباتے رہتے ہیں۔

یوں لگتا تھا قرمزی دیواری کاغذ پر بنے مور پیچھا نہ چھوڑنے والے ڈراؤنے خوابوں کا خام مواد تھے۔ لیکن ویلری نے کبھی ایسے دیو ہیکل 'کنج' کا خواب نہیں دیکھا جو گنجلک انداز میں زندہ پرندوں سے بنا ہو۔ علی الصبح وہ ایک خواب دیکھتا جس میں مختلف صورت حال میں یہی کچھ ہوتا۔ دو آدمی اور ویلری کمرے میں پستول لیے داخل ہوتے یا وہ اس پر تب حملہ آور ہوتے جب وہ سینما سے باہر نکلتا یا وہ تینوں بیک وقت وہی اجنبی بن جاتے جس نے اسے دھکا دیا تھا، یا وہ اداسی کے ساتھ صحن میں اس کا انتظار کرتے اور یوں معلوم ہوتا کہ اسے نہیں پہچانتے تھے۔

خواب کے آخر میں وہ بستر کے پہلو میں دھرے میز کے دراز میں سے اپنا پستول نکالتا (اور یہ سچ تھا کہ وہ اسی دراز میں پستول رکھتا تھا) اور ان آدمیوں پر گولی چلا دیتا۔ ہتھیار چلنے کی آواز اسے جگا دیتی لیکن ہمیشہ یہ ایک خواب ہی ہوتا اور پھر ایک دوسرے خواب میں اس حملے کو دہرایا جاتا، اور اس سے اگلے خواب میں اسے ان آدمیوں کو پھر سے قتل کرنا پڑتا۔

جولائی کے مہینے کی ایک کہر آلود صبح اجنبی لوگوں کی موجودگی نے (نہ کہ دروازے کی آواز نے جو انہوں نے کھولا) اسے بیدار کیا۔ کمرے کے سایوں میں دراز قد دکھائی دیتے اور انہی سایوں میں عجیب انداز میں سادہ معلوم ہوتے، (ڈراؤنے خوابوں میں وہ ہمیشہ بہت واضح دکھائی دیتے) چوکس، ساکت اور متحمل ایلیچند رو ویلری اور ایک اجنبی نے، نظریں جھکائے ہوئے جیسے وہ ان کے ہتھیاروں کا بار نہ سہار پا رہی ہوں، آخر اسے آلیا۔

ہاتھ کے اشارے سے اس نے انھیں انتظار کرنے کو کہا اور اپنا چہرہ دیوار کے رخ پر پھیر لیا جیسے پھر سے اپنی نیند کو پالینا چاہتا ہو۔ کیا اس نے ایسا ان لوگوں کی ہمدردی جیتنے کے لیے کیا تھا جنہوں نے اسے قتل کیا یا اس لیے کہ دہشت انگیز واقعہ کو برداشت کرنا کم دشوار ہے بہ نسبت اس کو تصور اور غیر مختتم انداز میں اس کا انتظار کرنے کے۔ یا پھر جیسا کہ یہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ شاید اس لیے کہ وہ قاتل خواب ہی کا حصہ تھے جیسا کہ وہ پہلے بھی کتنی ہی مرتبہ، اسی جگہ، اسی وقت خواب کا حصہ رہ چکے تھے۔

وہ اسی طلسمی عمل کی گرفت میں تھا جب دھماکے نے اسے فنا کر دیا۔

# ریت کی کتاب

''تمھاری ریت کی رسی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' جارج ہربرٹ

سطریں نقطوں کی لاانتہا تعداد سے تشکیل پاتی ہیں۔ سطحیں سطروں کی غیر محدود کثرت سے، حجم سطحوں کی بے انتہا تعداد سے۔ اعلیٰ تر حجم، حجم کی غیر محدود مقدار سے۔۔۔ نہیں۔ یہ، یہ زیادہ اقلیدسی ہے، یہ میری کہانی کے آغاز کا بے شک ایک بہترین انداز نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ یہ کہانی سچی ہے، ہر حیرت انگیز کہانی سے متعلق کیا جانے والا دعویٰ ہے۔

میں کال بلگرانو میں چوتھی منزل میں ایک اپارٹمنٹ میں تنہا رہتا ہوں۔ چند ماہ پیشتر ایک شام میرے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی شخص اندر داخل ہوا۔ وہ ماند پڑے نقوش والا دراز قد آدمی تھا۔ یا پھر شاید میرے ضعف البصری نے مجھے اسے یوں دیکھنے پر مجبور کیا۔ اس کے سراپے سے ایمان داروں والی غربت جھلکتی تھی۔ وہ خاکستری لباس میں ملبوس تھا اور اس کے ہاتھ میں اسی رنگ کا سوٹ کیس تھا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ وہ ایک بدیسی تھا۔

اول اول وہ مجھے عمر رسیدہ معلوم ہوا۔ بعد ازاں مجھے احساس ہوا کہ دراصل مجھے یہ غلط فہمی اس کے مہین سنہرے بالوں سے ہوئی تھی جو اسکینڈے نیویائی لوگوں کی طرح تقریباً سفید تھے۔ ہماری گفتگو کے دوران، جو مجھے شک ہے گھنٹہ بھر سے زیادہ جاری رہی، مجھے معلوم ہوا کہ وہ

آرکینز کا رہنے والا تھا۔

میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گفتگو شروع کرنے سے قبل اس نے کچھ توقف کیا۔ ایک طرح کا حزن اس کے چہرے سے جھلکتا تھا۔ جیسا اب میرے ساتھ معاملہ ہے۔

''میں انجیلیں بیچتا ہوں۔'' اس نے آخر کہا۔

لہجے میں فضیلت نمائی کا تاثر پیدا کرتے ہوئے میں نے جواب دیا ''اس گھر میں پہلے ہی بہت سی انگریزی انجیلیں موجود ہیں، جیسے یہی جان وائکلف کی انجیل۔ میرے پاس کپریانو ڈی ویلیرہ اور لوتھر کی انجیلیں بھی ہے (جو ادبی نقطہ نظر سے نسبتاً انتہائی ناقص ہیں)۔ اور لاطینی زبان میں ولگیٹ کی انجیل کی نقل بھی ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، مزید انجیلوں کی تو اب مجھے ضرورت نہیں ہے۔''

خاموشی کے چند لمحوں کے بعد وہ بولا ''میں صرف انجیل ہی نہیں بیچتا۔ میں آپ کو ایک مقدس کتاب پیش کر سکتا ہوں جو ہو سکتا ہے آپ جیسے شخص کی دلچسپی کی چیز ہو۔ مجھے یہ شمالی بھارت میں بکانیر کے مضافات میں ملی تھی۔''

اس نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور ایک کتاب نکال کر میز پر دھری۔ یہ فل سکیپ صفحے کے آٹھویں حصے جتنے حجم کی کپڑے کی جلد والی کتاب تھی جو بلا شبہ بہت سے ہاتھوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی۔ میں نے اس کا معائنہ کیا۔ اس کے غیر معمولی وزن نے مجھے حیران کیا۔ پشتے پر یہ الفاظ درج تھے ''الہامی حکم نامہ''۔ نیچے لکھا تھا، بمبئی۔''

''میرے اندازے کے مطابق انیسویں صدی کی ہے'' میں نے اندازہ لگایا۔

''میں نہیں جانتا'' وہ بولا ''نہ کبھی جان پایا۔''

میں نے یونہی ایک جگہ سے کتاب کھولی۔ رسم الخط میرے لیے اجنبی تھا۔ صفحات جو شکستہ اور ناقص طباعت والے معلوم ہوتے تھے، دو کالمی عبارت والے تھے، کسی بھی انجیل کی طرح۔ الفاظ ایک دوسرے میں گھسے ہوئے تھے اور تحریر چھوٹے چھوٹے مناجاتی بندوں پر مشتمل

تھی۔ ہر صفحے کے بالائی کونے میں عربی اعداد درج تھے۔ میرا دھیان ایک عجیب بات پر گیا۔ مثال کے طور پر بائیں طرف کے صفحے پر 40,514 کے ہندسے درج ہیں جبکہ اگلے طاق صفحے پر 999 کے۔ میں نے صفحہ پلٹا۔ اس پر آٹھ ہندسوں کا عدد لکھا تھا۔ ایک تصویر بھی تھی جیسی عموماً لغات میں ہوتی ہے۔ قلم اور سیاہی سے کھینچے گئے جہاز کے لنگر کی، جیسے کسی غیر پختہ بچے کے ہاتھوں سے بنی ہو۔

اس موقع پر اجنبی نے کہا ''اس صفحے کو غور سے دیکھیے۔ یہ آپ کو دوبارہ کبھی دکھائی نہیں دے گا۔'' اس کی بات سے مجھے خطرے کا احساس ہوا لیکن ایسا اس کے لہجے سے نہیں جھلکتا تھا۔

میں نے صفحے کو بغور دیکھا اور کتاب بند کر دی۔ فوراً بعد اسے دوبارہ کھولا۔ صفحے پر صفحہ پلٹتا رہا لیکن بے سود۔ میں لنگر کی تصویر تلاش نہیں کر سکا۔ ''یہ کسی مقدس صحیفے کا کسی ہندوستانی زبان میں ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے''؟ میں نے اپنے شدید اضطراب کو چھپانے کے لیے بات بدلی۔ ''یہ کسی بھارتی زبان کے مقدس صحیفے کا نسخہ ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟''

''نہیں'' اس نے جواب دیا۔

پھر کسی راز کو افشا کرنے کے انداز میں آواز دھیمی کی۔ ''میں نے یہ کتاب میدانی علاقوں میں ایک چھوٹے قصبے میں سے چند روپوں اور ایک انجیل کے عوض حاصل کی۔ اسکا مالک اسے پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔ مجھے شک ہے کہ وہ اس 'کتاب کتب' کو کوئی تعویز سمجھتا تھا۔ وہ کسی نیچ ذات کا تھا۔ اس ذات کے لوگوں کے سایے پر قدم دھرنے سے پلید ہونے کے خطرے کے بغیر نہیں گزرا جا سکتا۔ اس نے بتایا کہ کتاب کو 'ریت کی کتاب' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کا اور نہ ہی ریت کا کوئی آغاز یا انجام ہوتا ہے۔''

اجنبی نے مجھ سے کہا کہ میں پہلا صفحہ تلاش کرنے کی کوشش کروں۔

میں نے اپنا بایاں ہاتھ سرورق پر رکھا اور اپنا انگوٹھا اولین صفحہ پر رکھنے کی کوشش میں کتاب کھولی۔ سب کچھ بے فائدہ تھا۔ بہت سے صفحے ہر بار سرورق اور میرے انگوٹھے کے بیچ رہ

جاتے۔ یوں لگتا جیسے کتاب کے اندر سے صفحے پھوٹ رہے ہوں۔

''اب آخری صفحہ تلاش کرو۔''

دوبارہ مجھے ناکامی کا سامنا ہوا۔ایسی آواز میں، جو میری نہیں لگتی تھی، میں بمشکل ہکلاہٹ کے ساتھ اتنا کہہ سکا''یہ ممکن نہیں ہے۔''

سرگوشی جیسی مدھم آواز میں اجنبی بولا''ایسا نہیں ہوسکتا لیکن ایسا ہے۔اس کتاب میں صفحات کی تعداد لاانتہا ہے۔نہ اس کا کوئی اولین صفحہ ہے نہ آخری۔ مجھے علم نہیں ہے کہ صفحات پر یوں بے قاعدگی سے نمبر کیوں لگائے گئے ہیں۔شاید یہ سمجھانے کے لیے کہ ایک غیر محدود سلسلے میں کوئی بھی عدد کہیں سے بھی شروع ہوسکتا ہے۔''

بعدازاں جیسے بلند آواز میں سوچتے ہوئے، میں نے کہا،''اگر خلا لامحدود ہے تو اس کا مطلب ہے ہم کہیں بھی، اس کے کسی بھی مقام پر موجود ہیں۔اگر وقت لامحدود ہے تو ہم کسی بھی لمحے میں موجود ہیں۔''

میں اس کے قیاسات سے بےزار ہوگیا۔''بلاشبہ تم ایک مذہبی آدمی ہو۔کیا نہیں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میں پریسبیٹیرین ہوں۔میرا ضمیر صاف ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ اس دیہاتی کو اس شیطانی کتاب کے بدلے کلامِ خدا دے کر میں نے اس سے دھوکہ نہیں کیا۔''

میں نے اسے تسلی دی کہ کسی بات پر اسے شرمندگی محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ پھر اس سے پوچھا کہ کیا وہ محض سفر کی غرض سے ان علاقوں سے گزر رہا تھا۔اس نے جواب دیا کہ چند دنوں بعد اس کا اپنے وطن واپس جانے کا ارادہ ہے۔تبھی مجھے معلوم ہوا کہ وہ آرکنی جزیروں کا ایک سکاٹ تھا اور یہ کہ اس کا گھر آرکینز میں تھا۔میں نے اسے بتایا کہ سٹیونسن اور ہیوم سے اپنی دلبستگی کی وجہ سے میں سکاٹ لینڈ سے خاص لگاؤ محسوس کرتا ہوں۔

''اور روبی برنز بھی۔'' اس نے میری تصحیح کی۔ گفتگو کے دوران میں اس لامحدود کتاب کو

مسلسل کھنگالتا رہا۔ پھر فرضی بے نیازی کے ساتھ پوچھا ''کیا اس عجیب شے کو تم برٹش میوزیم میں دینا چاہو گے؟''

''نہیں آپ کو دے رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ اور کتاب کے بدلے میں خاصی بڑی رقم کا تقاضہ کیا۔

میں نے پوری ایمان داری کے ساتھ جواب دیا کہ اتنی رقم میری استطاعات سے باہر تھی۔ لیکن میرا ذہن اسی سوچ میں غلطاں تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے ایک خیال سوجھا۔

''میں تم سے ایک سودا کرتا ہوں''۔ میں نے کہا ''تم نے یہ کتاب چند روپوں اور انجیل کی ایک جلد کے عوض حاصل کی۔ میں تمہیں اپنی پنشن کی تمام رقم پیش کرتا ہوں جو میں نے حال ہی میں وصول کی ہے۔ اور ساتھ ہی گوتھک الفاظ والی وکلف کی انجیل۔ مجھے یہ اپنے اجداد سے وراثت میں ملی تھی۔''

''سیاہ لفظوں والی وکلف کی انجیل۔'' وہ بڑبڑایا۔

میں اپنی خواب گاہ تک گیا اور اس کے لیے رقم اور کتاب لایا۔ کتابوں کے پرانے شائق کی گرم جوشی کے ساتھ اس نے صفحے پلٹے اور اس کے سرورق کا مطالعہ کرنے لگا۔

''منظور ہے۔'' اس نے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے یکسر بھاؤ تاؤ نہ کیا۔ بعد میں احساس ہوا کہ وہ میرے گھر آیا ہی اس کتاب کو بیچنے کے ارادے سے تھا۔ اس نے رقم بھی نہیں گنی، بس اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ہم بھارت اور آرکنی اور ناروے کے سرداروں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جنہوں نے کبھی وہاں حکومت کی تھی۔ وہ رخصت ہوا تو رات بھیگ چکی تھی۔ میں اسے پھر کبھی نہیں دیکھ سکا۔ نہ ہی میں اس کا نام جانتا ہوں۔

میں نے سوچا کہ ''ریت کی کتاب'' کو شیلف میں اس خالی جگہ پر رکھوں جہاں پہلے

وکلف کی انجیل پڑی تھی لیکن آخر میں نے اسے 'الف لیلہ ولیلہ' کی جلدوں کے شکستہ سیٹ کے عقب میں چھپانے کا فیصلہ کیا۔ میں بستر پر لیٹ گیا لیکن سو نہ سکا۔ صبح تین یا چار بجے میں نے بتی جلائی۔ وہ پراسرار کتاب نکالی۔ اس کے صفحات پلٹے۔ ایک صفحے پر ایک نقاب چھپا ہوا دیکھا۔ صفحے کے ایک کونے میں ایک عدد تھا جواب مجھے یاد نہیں رہا اور جو نو ہندسوں پر پھیلا ہوا تھا۔

میں نے کسی کو اپنا یہ خزانہ نہیں دکھایا۔ اس کتاب کی ملکیت کی خوشی میں اس کے چوری ہو جانے کے کھٹکے کا اضافہ ہو گیا اور پھر یہ اندیشہ بھی لاحق ہوا کہ ہوسکتا ہے یہ واقعی لامحدود نہ ہو۔ ان خدشات نے میری دیرینہ مردم بے زاری کو کئی چند کر دیا۔ میرے بس چند ایک دوست ہی باقی بچے تھے۔ میں نے ان سے ملنا بھی موقوف کر دیا۔ میں کتاب کا اسیر، گھر سے باہر نکلتا ہی نہیں تھا۔

میں نے اس کے گھسے پٹے پشتے اور سرورق کا مکبر البصر عدسے سے معائنہ کیا اور اس میں کسی قسم کے جھانسے کا امکان قطعی رد کر دیا۔

پھر دریافت کیا کہ چھوٹی تصویریں دو ہزار صفحوں کے وقفے سے موجود تھیں۔ انھیں حروف تہجی کے مطابق ترتیب شدہ نوٹ بک میں درج کرنا شروع کیا جو تھوڑے ہی عرصہ میں پُر ہو گئی۔ ان نمبروں کے صفحات کبھی پھر سامنے نہیں آئے۔ رات کو میری بے خوابی مختصر وقفوں کے لیے مجھ پر مہربان ہوتی تو میں کتاب کا خواب دیکھتا۔

موسم گرما اپنے اختتام کے قریب تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ کتاب کوئی دیو ہیکل شے تھی۔ اس خیال میں بھی تشفی کا کوئی پہلو نہیں تھا کہ میں جو اس کتاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا اور اپنی گوشت اور ہڈیوں والی دس انگلیوں سے انھیں چھو رہا تھا، اس کتاب سے کسی طور کم عفریت صفت نہیں تھا۔ مجھے لگا یہ کتاب ایک کابوسی شے تھی۔ ایک نجس شے جس نے بجائے خود حقیقت کو بے حرمت اور آلودہ کر دیا تھا۔

میں نے اسے جلا دینے کے بارے میں سوچا۔ لیکن خوف تھا کہ ایک لامحدود کتاب کو جلا دینے کا عمل بھی لامحدود نہ ہو اور یہ سیارہ دھوئیں سے حبس دم کا شکار نہ ہو جائے۔

مجھے یاد آیا کہ کہیں پڑھا تھا ایک پتے کو چھپانے کی بہترین جگہ ایک جنگل ہی ہے۔
ریٹائرڈ ہونے سے قبل میں میکسیکو سٹریٹ میں ارجنٹائن نیشنل لائبریری میں ملازم تھا جہاں نو لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ میں جانتا تھا کہ لابی سے دائیں ایک خم دار زینہ نیچے تہہ خانے کی تاریکی میں گم ہو جاتا ہے جہاں اخبارات اور نقشہ جات محفوظ کیے جاتے ہیں۔ میں نے سیلے خانوں میں سے کسی ایک میں کتاب ریت گم کر دینے کے لیے لائبریرین کی لحاتی غفلت سے فائدہ اٹھایا۔ پوری کوشش کی کہ یاد نہ رکھوں کہ تب میں دروازے سے کتنا اونچا یا کتنا دور تھا۔
میں اب مطمئن ہوں لیکن میکسیکو سٹریٹ میں سے گزرنے سے بھی احتراز کرتا ہوں جس میں لائبریری موجود ہے۔

---------------------------

# ایک جنگ جو اور ایک غدار کی کہانی

اپنی کتاب (La Pocsia) لا پوئیسیا (بری، 1942ء) کے صفحہ 278 پر کروچے نے مورخ پاؤل داڈیکون کی ایک لاطینی تحریر کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے ڈراکٹلف کی سرنوشت بیان کی اور اس کی قبر کے کتبے کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس کی زندگی اور کتبہ، دونوں ہی مجھے انوکھے معلوم ہوئے۔ بعدازاں میں سمجھا کہ ایسا کیوں ہے؟ ڈراکٹلف لامبرڈ کا جنگجو تھا جو ریوینا کے محاصرے کے دوران اپنے ساتھیوں سے کنارہ کش ہوا اور اسی شہر کا دفاع کرتے ہوئے مارا گیا جس پر وہ حملہ کرنے آیا تھا۔ ریوینا کے باشندوں نے کلیسا کے معبد میں اسے دفنایا اور اس کی قبر پر کتبہ لکھ کر نصب کیا جس میں انھوں نے اپنے تشکر کا اظہار کیا اور ایک وحشی کے درندہ صفت روپ اور اس کی سادگی اور اچھائی کے درمیان عجیب تضاد کو بیان کیا۔

"Terribilis viru facies, sed mente benigus,

longaque robusto pectore barba fuit!"

(گبن نے بھی اپنی کتاب 'زوال اور شکست' میں ان مصرعوں کو نقل کیا ہے۔)

ڈراکٹلف کی داستان حیات ایسی ہی ہے۔ ایک وحشی جو روم کا دفاع کرتے ہوئے ہلاک ہوا یا پھر یہ اس کی داستان کا ایک ٹکڑا ہوگا جو پاؤل داڈیکون ہمارے لیے کھوج نکالنے میں کامیاب ہوا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ واقعہ کب رونما ہوا؟ شاید چھٹی صدی کے وسط میں جب

لانگ بارڈی نے اٹلی کے میدانوں کو تاخت و تاراج کیا یا آٹھویں صدی میں ریوینا کے ہتھیار ڈالنے سے قبل۔ ہم اول الذکر تاریخ کو درست تسلیم کر لیتے ہیں (کہ یہ کوئی تاریخی دستاویز تو نہیں ہے)۔

چلئے ڈرا کٹلف کو، جو بلاشبہ یکتا اور عمیق فرد تھا (جیسا کہ سبھی افراد ہوتے ہیں)، ایک فرد فرض نہیں کرتے بلکہ اسے ابدیت کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ایک عمومی نوع فرض کرتے ہیں جو روایت نے اس کی اور اس جیسے بہت سوں کی بنیاد پر وضع کی تھی۔ جب کہ یہ روایت فراموشی اور یادداشت کے تحت قائم ہوئی۔

جنگلوں اور دلدلوں سے بھرے ایک مبہم خطے سے گزار کر یہ جنگیں اسے دریائے ڈینیوب اور دریائے ایلبا کے کناروں سے اٹلی میں کھینچ لائی تھیں۔ شاید وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ جنوب کی طرف رواں تھا نہ ہی یہ خبر تھی کہ وہ روم ہی کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ شاید وہ آریوں کے عقیدے کا پیروکار تھا جس کے مطابق سورج کا جاہ و جلال مقدس باپ کی شبیہہ ہے۔ تاہم یہ تصور کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کا، ہرتھا کا پجاری تھا جس کا نقاب پوش بت بیل گاڑی میں سوار کر کے ہر جھونپڑے تک لایا جاتا تھا یا یہ کہ وہ جنگ اور طوفان کے دیوتاؤں کا پجاری تھا جو گھر کے بنے ہوئے لباس میں لپٹی اور سکوں اور کنگنوں سے لدی کندہ ناتراش چوبی شبیہیں تھے۔

وہ سور ماؤں اور ارنا سانڈوں کے جنگلات سے آیا۔ وہ نکھری ہوئی جلد والا، جرات مند، معصوم، سفاک، اور اپنے کپتان اور قبیلے کا وفادار تھا، نہ کہ پوری دنیا کا۔ جنگیں اسے ریوینا میں گھسیٹ لائیں اور یہاں اس نے وہ چیز دیکھی جس سے وہ پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا یا جو یوں پورے طور پر کبھی اسے دکھائی نہیں دی تھی۔

اس نے دن، اور سرو کے درخت اور سنگ مرمر دیکھا۔ اس نے ایک کُل دیکھا جو فراواں مگر منظم تھا۔ اس نے ایک شہر دیکھا، ایک عضویہ جو مورتیوں، معبدوں، باغوں، کمروں، درجوں اور قطاروں میں رکھی نشستوں، دودستوں والی صراحیوں، ستونوں اور باقاعدہ کھلے مقامات

سے مترکب تھا۔ ان تمام بناوٹی اشیاء میں سے (میں جانتا ہوں) کوئی ایک بھی شے اسے دلکش معلوم نہیں ہوئی۔ ان سے وہ اسی انداز میں متاثر ہوا جیسے ہم آج کسی ایسے پیچیدہ آلے سے متاثر ہوں جس کے مقصد کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں لیکن جس کی ہیئت میں ہمیں لافانی ذہن کی کارفرمائی محسوس ہو۔ غالباً اس کے لیے لافانی رومن الفاظ پر مشتمل ایک ناقابل فہم عبارت والی محراب کو دیکھ لینا ہی کافی تھا۔ وہ اس الہام یعنی اس شہر کو دیکھ کر یک لخت اندھا ہوا اور پھر بحال ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں اس شہر میں اس کی حیثیت ایک کتے یا ایک بچے کی ہوگی، اور یہ کہ وہ اسے کبھی سمجھ ہی نہیں پائے گا۔ لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ شہر اس کے دیوتاؤں سے اور اس کے عقیدے سے جس پر وہ ایمان لایا، اور جرمنی کی تمام دلدلوں سے زیادہ وقیع ہے۔ ڈراکٹلف نے اپنے ساتھیوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور ریوینا کے لیے لڑا۔ وہ مارا گیا اور اس کی قبر کے کتبہ پر انہوں نے یہ الفاظ کندہ کرائے جنہیں وہ سمجھ نہیں سکے گا۔

"Contemprit caros, dum nos amt ill,parentes,

Hance patrian reputans esse, ravenna, suam".

وہ غدار نہیں تھا۔ (غداروں سے ایسے محترم کتبے منسوب نہیں کیے جاتے) وہ ایک اہل دل شخص تھا، ایک منحرف۔

کئی نسلوں کے بعد لانگوبارڈی، جنہوں نے اس کی غداری پر لعن طعن کی تھی، خود اطالوی لامبارڈز بن گئے، اور غالباً ان میں سے کچھ آلڈیجر بن کر ان لوگوں کے باپ بن سکتے تھے جنھوں نے ایلیگھیر یوں کو جنم دیا۔ ڈراکٹلف کے اس فعل کے حوالے سے بہت سی قیاس آرائیاں ہو سکتی ہیں۔ ان میں سب سے آسان قیاس میرا ہے۔ چاہے یہ حقیقتاً درست نہ ہو، لیکن ایک استعارے کے طور پر یہ سچ ہے۔

جب میں نے کروچے کی کتاب میں اس جنگجو کی روداد پڑھی تو اس نے مجھے غیر معمولی حد تک متاثر کیا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے ایک شے قدرے مختلف صورت میں پھر سے پالی

تھی، جو کبھی میری ہی تھی۔ میں نے فوراً ہی منگول گھڑسواروں کے بارے میں سوچا جو چین کو ایک لامحدود چراگاہ بنانا چاہتے تھے لیکن انہی شہروں میں بوڑھے ہوئے جنھیں پامال کرنے کی خواہش لے کر وہ یہاں آئے تھے۔ لیکن یہ وہ یاد نہیں تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ آخر میں نے اسے پا ہی لیا۔ یہ وہ قصہ تھا جو میں نے ایک مرتبہ اپنی انگریز دادی سے سنا تھا جو اب وفات پا چکی تھیں۔

1872ء میں میرے دادا بورخیس بیونس ایریز کی شمالی اور مغربی سرحدوں اور سانتافی کی جنوبی سرحدوں پر کمانددار کی حیثیت سے متعین تھے۔ ہیڈکوارٹر خونین میں تھا۔ اس سے چار یا پانچ فرسنگ کے فاصلے پر سرحدی چوکیاں واقع تھیں جن سے پرے علاقے کو تب پامپاس اور 'اندرونی علاقہ' بھی کہا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ میری دادی نے نصف حیرت اور نصف طنز کے ساتھ اپنی بدقسمتی کا دکھڑا رویا کہ وہ ایک انگریز عورت تھی لیکن اپنے ملک اور اپنے لوگوں سے دور زمین کے اس آخری سرے پر زندگی گزار رہی تھی۔ جس شخص سے یہ بات کہی گئی تھی، اس نے بتایا کہ یہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ کئی ماہ بعد اسے ایک انڈین لڑکی دکھائی گئی جو آہستہ روی سے بازار میں چل رہی تھی۔ وہ برہنہ پا تھی، اور اس نے دو بھڑکیلے رنگوں والے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ اسکے بال سنہری تھے۔

ایک سپاہی نے اسے بتایا کہ ایک دوسری انگریز عورت اس سے ملنا چاہتی تھی۔ لڑکی راضی ہوگئی۔ وہ بے خوفی کے ساتھ مگر ہر بات پر شک بھی کرتے ہوئے ہیڈکوارٹر میں داخل ہوئی۔ اس کے تانبے کے رنگ کے چہرے پر، جو وحشی رنگوں سے آراستہ تھا، اس کی آنکھوں کا رنگ پھیکا پھیکا نیلا تھا جسے انگریز 'بھورا' بھی کہتے ہیں۔ اس کا جسم ہرن کی طرح ہلکا پھلکا اور ہاتھ مضبوط اور ہڈیالے تھے۔ وہ صحرا سے، 'اندرونی علاقے' سے آئی تھی۔ ہر شے اسے بہت مختصر معلوم ہوتی ہوگی: دروازے، دیواریں، فرنیچر۔

غالباً ایک لمحہ کے لیے دونوں عورتوں کو لگا کہ وہ آپس میں بہنیں تھیں۔ وہ اپنی محبوب سرزمینوں سے بہت دور ایک حیران کن خطے میں موجود تھیں۔ میری دادی نے الفاظ کو واضح انداز

میں ادا کرتے ہوئے اس سے کسی طرح کا سوال کیا۔لڑکی نے کچھ دشواری سے جواب دیا۔ الفاظ کو سوچتے اور انہیں دہراتے ہوئے جیسے وہ ان کے قدیم ذائقے سے حیران ہو رہی ہو۔قریب پندرہ برسوں سے اس نے اپنی آبائی زبان نہیں بولی تھی اور نہ اس کی بحالی سہل تھی۔

لڑکی نے بتایا کہ اسکا تعلق یارک شائر سے تھا، اس کے والدین بیونس ایریز منتقل ہوئے تھے اور یہ کہ وہ ریڈ انڈینز کے ایک حملے کے دوران انہیں کھو بیٹھی۔انڈینز اسے اٹھا کر لے یہاں لے آئے اور اب وہ ان کے سردار کی بیوی تھی جس سے اسکے دو بیٹے تھے اور یہ کہ وہ بہت بہادر مرد تھا۔یہ ساری باتیں اس نے بھونڈی انگریزی میں ٹھہر ٹھہر کر بیان کیں جس میں آراکینین یا پامپین زبان کی آمیزش تھی۔ جب کہ اس کی گفتگو کے پس منظر میں ایک وحشی اور غیر مہذبانہ زندگی کی جھلک صاف محسوس ہوتی تھی۔ گھوڑوں کے سائبان، خشک گوبر سے بھڑکائی ہوئی آگ، ضیافتیں جن میں لوگ آگ میں جھلسے ہوئے گوشت یا کچی آنتیں کھاتے، علی الصبح کی خفیہ ہجرتیں، مویشیوں کے باڑوں پر یورشیں، بجتے ہوئے نقارے، لوٹ مار، جنگیں، برہنہ گھڑ سواروں کے ذخیروں پر کامیاب دھاوے، تعدد ازدواج، عفونت اور توہم پرستی۔

ایک انگریز عورت نے خود کو ایسی بربریت کی سطح تک گرا لیا تھا۔رحم اور صدمے کی ماری میری دادی نے اسے سمجھایا کہ وہ واپس نہ جائے اور اسے یقین دلایا کہ وہ اس کی حفاظت کرے گی اور اس کے بچے اسے دلائے گی۔لڑکی نے جواب دیا کہ وہ یہیں خوش تھی اور اسی رات وہ صحرا کی طرف لوٹ گئی۔ فرانسسکو بورخیس اس سے کچھ ہی عرصہ بعد 1974 کے انقلاب میں مارا گیا۔ غالباً تب میری دادی اس اہل ہو پائی کہ اس دوسری عورت میں، جو اسی کی طرح اپنے لوگوں سے دور کر دی گئی اور اس کٹھور براعظم میں لا پھینکی گئی تھی، خود اپنی قسمت کا عظیم الجثہ آئینہ دیکھ پائے۔

سنہرے بالوں والی انڈین عورت ہر برس خونین یا قلعہ راولی میں قصباتی دکانوں سے زیورات یا میٹ بنانے کا سامان خریدنے آتی تھی۔لیکن میری دادی سے گفتگو کے بعد وہ پھر کبھی دکھائی نہ دی۔مدت بعد ایک مرتبہ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ایک روز میری دادی شکار

کھیلنے گئی۔ ایک دلدلی علاقے کے نزدیک ایک غلیظ جھونپڑی کے باہر ایک شخص بھیڑ ذبح کر رہا تھا۔ جیسے یہ سب کسی خواب کا حصہ ہو، وہی انڈین عورت ایک گھوڑے پر سوار ظاہر ہوئی۔ اس نے خود کو زمین پر گرا لیا اور گرم خون غٹاغٹ پی گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ اس لیے کہ اس کے سوا کوئی راستہ اس کے پاس باقی نہیں بچا تھا یا پھر ایک چیلنج اور ایک اشارے کے طور پر۔

ڈراکٹلف اور اس اسیر کی کہانی کے درمیان ایک ہزار تین سو برس اور ایک سمندر حائل ہیں۔ یہ دونوں ہی مساوی طور پر ناقابل رسائی ہیں۔ اس وحشی کی شبیہہ جو ریوینا کے دفاع میں لڑا، اور اس یورپی عورت کی شبیہ جس نے صحرا کا انتخاب کیا، ہوسکتا ہے یہ بظاہر مختلف معلوم ہوں، باہم متضاد بھی۔ لیکن دونوں ایک ہی طرح کی خفیہ ترغیب کی زد میں آئے۔ ایک ترغیب جو عقل سے زیادہ گہری ہوتی ہے اور دونوں اس ترغیب سے سحر زدہ ہوئے جسے وہ کبھی بیان نہیں کر پائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کہانیاں جنہیں میں نے بیان کیا، ایک ہی کہانی ہوں، اس سکّے کا چہرہ والا اور دوسرا عقبی رخ، خدا کے نزدیک ایک ہی ہے۔

# ایک قتل کی واردات

14 جنوری 1922 کو ٹاربوچ اور لوئی ؤینتھل کی ٹیکسٹائل ملوں سے واپسی پر ایما زنز نے داخلی ہال کے پچھلے حصے میں ایک خط موصول کیا جسے برازیل سے بھیجا گیا تھا اور جس میں اسے اس کے والد کی وفات کی اطلاع دی گئی تھی۔ ڈاک ٹکٹ اور لفافے سے اسے دھوکہ ہوا۔ پھر غیر شناسا لکھائی سے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ نو یا دس سطروں سے پورا صفحہ بھرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایما نے پڑھا کہ اس کے والد جناب مائر نے غلطی سے ویرونال کی زائد از ضرورت دوا پی لی تھی اور وہ باج کے ہسپتال میں مہینے کی تین تاریخ کو فوت ہوئے۔ ان بورڈنگ گھر کے ایک دوست نے خط پر دستخط کیے تھے، ریوگرینڈی کا کوئی فیین یا فین تھا، اور لگتا تھا وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس کی تخاطب مرحوم کی بیٹی تھی۔

ایما کے ہاتھ سے خط چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ اس کا اولین تاثر معدے اور اس کے گھٹنوں میں کمزوری کے احساس کا تھا۔ اندھے احساس جرم، غیر حقیقی پن، سرد مہری، اور خوف کا۔ اور تب یہ خواہش محسوس ہوئی کہ ابھی سے اگلا دن شروع ہو جائے۔ فوراً ہی اس نے محسوس کیا کہ یہ خواہش لاحاصل تھی کیوں کہ اس کے والد کی وفات ہی ایک واقعہ تھی جو دنیا میں رونما ہوا اور یہ مسلسل، لامختتم انداز میں ہوتا رہے گا۔ اس نے خط اٹھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چپکے سے اسے دراز میں رکھا جیسے وہ جانتی تھی کہ پردہ غیب سے کیا نمودار ہونے والا تھا۔ شاید اس نے وہ کچھ دیکھنا شروع کر دیا تھا جو ہونے والا تھا۔ وہ پہلے ہی وہ کچھ بن چکی تھی، جیسا اسے بن جانا تھا۔

بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دن کے اختتام تک ایما، مینوئل مائر کی خودکشی پر روتی رہی جو گزر چکے اچھے دنوں میں ایمینوئل زنز تھا۔ اسے گوال گوئے کے قریب ایک مختصر فارم میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنا یاد تھا۔ اسے اپنی ماں یاد تھی (یا اس نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی)، اسے لانوس میں اپنا چھوٹا خاندانی گھر یاد تھا جسے نیلامی کے ذریعے بیچ دیا گیا۔ اسے ایک کھڑکی کے زرد معیّن شکل کے شیشے یاد تھے۔ اسے گرفتاری کا وارنٹ، رسوائی، 'ٹیلر کے فنڈز میں خرد بُرد' نامی اخباری مضمون کے ساتھ وصول ہونے والے گمنام خطوط بھی یاد تھے، اسے یاد تھا (کہ اسے وہ بھلا ہی نہیں سکتی تھی) کہ آخری رات اس کے باپ نے قسم کھا کر کہا تھا کہ لیوونتھل اصل چور تھا۔

لیوونتھل، آرون لیوونتھل، پہلے اس کارخانے کا منیجر تھا، اب اس کے مالکان میں شامل تھا۔ 1916 سے ایما نے اس راز کی حفاظت کی تھی۔ کسی پر اسے افشا نہیں کیا تھا۔ اپنی بہترین دوست ایلسا ارسٹین پر بھی نہیں۔ شاید اسے یقین تھا کہ یہ راز اس کے اور غیر موجود والد کے درمیان ایک رابطہ تھا۔ لیوونتھل نہیں جانتا تھا کہ وہ اس راز سے آگاہ تھی۔ اس معمولی بات سے ایما زنز نے قوت کا احساس حاصل کیا۔ اس رات وہ سوئی نہیں اور جب صبح کی اولین کرنوں نے کھڑکی کے مثلث کو واضح کیا، تب تک اس کا منصوبہ حتمی صورت اختیار کر چکا تھا۔

اس نے اس دن کو (جو اسے مسلسل بے لطف معلوم ہوا) کسی بھی دوسرے دن کی طرح گزارنا چاہا۔ کارخانے میں ہڑتال کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایما نے، جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتی تھی، صاف کہا کہ وہ ہر طرح کے تشدد کے خلاف تھی۔ اس لیے وہ اس میں شامل نہیں ہوئی۔ چھ بجے کام کا وقت ختم ہوتے ہی وہ ایلسا کے ساتھ عورتوں کے ایک کلب میں گئی جس میں ایک جمنیزیم اور سوئمنگ پول بھی تھا۔ اسے اپنا نام بار بار پکارنا اور اس کے ہجے لکھوانے پڑے۔ اسے وہ بے ہودہ مذاق بھی برداشت کرنا پڑا جو ہجے درست کرانے کے دوران سہیلیوں نے اس سے کیا۔

ایلسا اور لڑکیوں میں سب سے کم عمر لڑکی کرون فس کے ساتھ اس نے ایک فلم کے بارے میں بات کی جسے دیکھنے وہ اتوار کی سہ پہر کو جانے والی تھی۔ پھر دوست لڑکوں کے بارے

میں بات چھیڑی۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ ایما اس موضوع پر بات کرے گی۔ اپریل میں وہ انیس سال کی ہو جائے گی لیکن ابھی سے مرد اس میں مریضانہ خوف کو تحریک دیتے تھے۔ گھر واپس آ کر اس نے کساوا سوجی اور سبزیوں سے گاڑھا سوپ تیار کیا، عجلت میں اسے کھایا، پھر بستر میں چلی گئی اور خود کو سونے پر مجبور کیا۔ یوں پندرہ تاریخ کا جمعہ گزرا، کام، مصروفیت اور معمول سے بھرا دن۔ اُس دن سے پہلے کا ایک دن۔

ہفتے کو وہ بے چینی کے ساتھ بیدار ہوئی۔ بے چینی، نہ کہ بے آرامی کے ساتھ، اور اس احساس تسکین کے ساتھ کہ آخر وہ دن آن پہنچا تھا۔ اب اسے منصوبہ سازی یا تصور بندی کی حاجت نہیں رہے گی۔ چند گھنٹوں میں کہ حقائق کی سادگی ہی کافی ہو گی، اس نے لاپرنسا میں پڑھا تھا، 'مالموسے آنے والا 'Nordstjarnan' جہاز اس شام گھاٹ نمبر 3 سے روانہ ہو گا۔' اس نے لیووینتھل کو فون کیا اور یہ خبر دی کہ وہ اسے ہڑتال کے بارے میں کوئی راز کی بات بتانا چاہتی تھی اور وعدہ کیا کہ وہ رات کو اس کے دفتر میں آئے گی۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ یہ کپکپی ایک مخبر کی آواز کے موافق بھی تھی۔

اس صبح کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ ایما دوپہر تک کام کرتی رہی۔ پھر ایلسا اور پیریلا کے ساتھ اتوار کی سیر کی تفصیلات طے کیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ لیٹ گئی اور بند آنکھوں سے منصوبے کا جائزہ لیا جو اس نے سوچ رکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ آخری اقدام، پہلے قدم کی نسبت کم وحشت ناک ہو گا کیوں کہ وہ بلا شک وشبہ اسے فتح اور انصاف سے ہم کناری عطا کرے گا۔ اچانک متنبہ ہوتے ہوئے وہ بستر سے اٹھی اور اپنے سنگھار میز کے دراز تک بھاگتی ہوئی گئی۔ اسے کھولا۔ ملٹن سلز کی تصویر کے نیچے جہاں وہ اسے پچھلی رات چھوڑ گئی تھی، پین کا خط موجود تھا۔ یہ کسی کی نظر میں کیسے آ سکتا تھا۔ اس نے اسے پڑھا اور پھر پھاڑ دیا۔

اس شام کے واقعات کو حقیقی انداز میں بیان کرنا دشوار ہو گا اور شاید نادرست بھی۔ جہنمی تجربے کی ایک خصوصیت اس کا غیر حقیقی پن ہے، ایسی خصوصیت جو اس کی دہشت میں تخفیف کرتی

ہے لیکن شاید یہی اسے سنگین بھی بناتی ہے۔ کیسے ایک فعل کو معتبر بنایا جا سکتا ہے جس پر خود اسے کرنے والا بھی یقین نہ رکھتا ہو۔ کیسے اس مختصر انتشار کو بحال کیا جائے جسے آج ایما زنز کی یاد مسترد کرتی اور الجھا دیتی ہے۔

ایما، المیگرہ میں لائنیئرز سٹریٹ میں مقیم تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس شام وہ ساحلی علاقے میں گئی۔ بدنام پیسیو ڈی جولیو میں شاید اس نے خود کو آئینوں میں عکس در عکس دیکھا، روشنیوں میں نگاہ خاص و عام کا مرکز بنتے اور گرسنہ نگاہوں میں برہنہ ہوتے ہوئے۔ لیکن یہ فرض کرنا زیادہ مناسب ہے کہ شروع میں وہ کچھ دیر وہاں بھٹکتی رہی ہوگی، اجنبی گلیوں میں کسی کی نگاہ میں آئے بغیر، وہ دو یا تین شراب خانوں میں گئی اور دوسری عورتوں کے معمول اور طریقہ کار کا معائنہ کیا۔

آخر وہ نورڈسٹجارنن سے آئے ہوئے چند لوگوں سے ملی۔ ان میں سے ایک بہت کم عمر تھا، اس سے اسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں وہ اس کے دل میں جذبہ ترحم پیدا نہ کر دے۔ اس کے بجائے اس نے ایک دوسرے مرد کو جو شاید اس سے پستہ قد اور بد گو بھی تھا، اس لیے چنا تا کہ اس واقعہ کی دہشت کے خالص پن میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔ وہ مرد اسے دروازے تک لے گیا، پھر وہ ایک تاریک داخلی ہال میں داخل ہوئے۔ ایک تنگ زینے تک گئے، ایک پیش کمرے میں (جس میں لانوس والے گھر جیسی آڑھی ترچھی کھڑکی تھی) اور پھر ایک غلام گردش میں داخل ہوئے اور ایک دروازے تک پہنچے جو ان کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ صبر آزما واقعات وقت کی حد سے باہر رونما ہوتے ہیں۔ یا تو اس لیے کہ ماضی قریب، مستقبل سے کٹا ہوتا ہے یا اس لیے کہ جو اجزا ان واقعات کی تشکیل کرتے ہیں، وہ مسلسل معلوم نہیں ہوتے۔

وقت سے باہر کے اس دورانیے میں، منقطع اور ناخوش گوار احساسات کی اس پیچیدہ بدنظمی میں، کیا ایما زنز نے ایک بار بھی اس مردہ شخص کے بارے میں سوچا ہوگا جو اس قربانی کا باعث بنا؟ میرے خیال میں ایک بار تو ضرور سوچا ہوگا اور اس لمحے اس نے اپنے مایوس کن ہدف کو

خطرے میں ڈالا ہوگا۔اس نے سوچا ( کہ وہ اس اہل تھی ہی نہیں کہ نہ سوچے ) کہ جو گھناؤنا کام اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ کیا، اسے اب وہ خود سے دہرا رہی تھی۔ اس نے اس بارے میں مبہم حیرت کے ساتھ سوچا اور سر کے چکرانے کی کیفیت میں تسکین پائی۔ وہ شخص، جو سویڈن یا فن لینڈ کا تھا، ہسپانوی نہیں بول سکتا تھا۔ وہ ایما کے لیے ایک ذریعہ تھا جیسا کہ وہ خود اس کے لیے تھی۔ وہ اس کے لیے لذت کا ذریعہ بنی جب کہ وہ اس کے لیے انصاف کے حصول کا وسیلہ بنا۔

ایما اکیلی ہوئی تو اس نے فوراً ہی اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔ چھوٹی تپائی پر رقم دھری ہوئی تھی جو وہ شخص چھوڑ گیا تھا۔ ایما بیٹھ بیٹھی اور نوٹوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جیسا کچھ ہی دیر پہلے وہ خط کے ساتھ کر چکی تھی۔ دولت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا بد تہذیبی ہے، جیسے رزق کو پرے پھینکنا۔ ایسا کرنے کے بعد وہ اس پر پچھتائی بھی تھی۔ ایک نخوت بھرا عمل، اور وہ بھی اس خاص دن۔۔۔ اس کا خوف اس کے جسم کے صدمے، اس کی نفرت کے احساس میں تحلیل ہو گیا۔ اداسی اور نفرت کا احساس ایما کو زنجیر کی طرح جکڑے ہوئے تھے۔ وہ آہستگی سے اٹھی اور لباس پہنا۔

کمرے میں چمک دار رنگ نہیں تھے۔ شام کی آخری روشنی نے اسے مزید بے زار کن بنا دیا۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر وہاں سے کھسک لی۔ ایک سٹیشن سے وہ برقی گاڑی لیکروز میں بیٹھ گئی جو مغرب کی سمت روانہ ہو رہی تھی۔ اپنے منصوبے کے مطابق اس نے سامنی حصے کی جانب اگلی نشست منتخب کی تا کہ اس کا چہرہ کسی کو دکھائی نہ دے۔ شاید گلیوں میں بے لطف آوارگی کے دوران یہ بات اس کے لیے باعث تسکین تھی کہ جو کچھ ہوا، اس سے کہیں کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ سکڑتے ہوئے بے کیف مضافات میں سے گزری، انھیں دیکھتے اور ساتھ ہی ساتھ انھیں فراموش کرتے ہوئے۔ وہ وارنیز کی ذیلی گلیوں میں سے ایک میں اتر گئی۔ بالکل برعکس انداز میں اس کی تھکاوٹ قوت میں بدل گئی کیوں کہ اس تھکاوٹ نے اسے پابند کیا کہ وہ اپنے منصوبے کی تفصیلات پر توجہ مرکوز کرے اور اس کی حقیقی نوعیت اور حتمی مقصد کو اس سے پوشیدہ رکھے۔

آرون لیوونتھل عام لوگوں کے لیے ایک سنجیدہ انسان تھا جب کہ قریبی دوستوں کے لیے بخیل۔ وہ کارخانے کے بالائی حصے میں تنہا رہتا تھا۔ قصبے کے خستہ حال مضافات میں رہتے ہوئے اسے چوروں کا خوف رہتا تھا۔ کارخانے کے صحن میں اس نے ایک بڑا کتا رکھا ہوا تھا اور سبھی جانتے تھے کہ اس کے میز کی دراز میں گولیوں سے بھرا پستول موجود تھا۔ سال بھر پہلے وہ اپنی بیوی کی غیر متوقع موت پر ماتم کر چکا تھا۔ وہ اس کے لیے ایک عمدہ جہیز ساتھ لائی تھی۔ لیکن دولت اس کا خبط تھی۔ خفتہ پشیمانی کے ساتھ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ دولت کمانے کی نسبت اسے بچانے میں زیادہ طاق تھا۔ وہ ایک مذہبی انسان تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس کا خدا کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ تھا جس کی وجہ سے خدا نے عبادتوں اور خدا ترسی کے بدلے اسے کارخیر سے چھوٹ دے رکھی تھی۔ گنجا، فربہ، ماتمی لباس پہنے ہوئے، دھندلے شیشوں والی عینک اور سنہری داڑھی کے ساتھ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا اپنی ملازم زنز کی خفیہ رپورٹ جاننے کا انتظار کھینچ رہا تھا۔

اس نے اسے آہنی دروازہ اندر دھکیلتے ہوئے دیکھا (جسے اس نے خاص اس کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا) اس نے ویران صحن عبور کیا۔ اس نے اسے کتے کے بھونکنے پر متبادل راستہ اختیار کرتے دیکھا (جسے خاص مقصد کے تحت وہاں باندھا گیا تھا)۔ ایما کے ہونٹ تیزی سے جنبش کر رہے تھے، ایسے شخص کی طرح جو مدھم آواز میں عبادت کر رہا ہو، تھکاوٹ کے ساتھ، بار بار وہ جملہ دہراتے ہوئے جسے لیوونتھل مرنے سے پہلے ضرور سنے گا۔

واقعات ویسے نہیں ہوئے جیسا ایما زنز نے ان کے بارے میں قیاس کیا تھا۔ کل صبح سے اس نے کتنی ہی مرتبہ تصور میں خود کو مضبوطی سے ریوالور تانے ہوئے، مکروہ انسان کو اپنا بھیانک جرم قبول کرنے پر مجبور کرتے اور اس پر اپنی جرات مندانہ چال کو بے نقاب کرتے ہوئے دیکھا تھا جو الوہی انصاف کو انسانی انصاف پر برتری دلا دے گی۔ (کسی خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ انصاف کا ایک آلہ کار ہونے کے ناطے وہ نہیں چاہتی تھی کہ خود یہی سزا اس کا مقدر ہو۔) سینے کے وسط میں ایک گولی لیوونتھل کے مقدر کا فیصلہ کر دے گی۔ لیکن کچھ بھی اس انداز میں نہیں ہوا۔

آرون لیووینتھل کے سامنے بیٹھے ہوئے ایما کو اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے سے بڑھ کر اس اذیت کا بدلہ لینے کی خواہش ہوئی، جسے اس نے سہا تھا۔ اس شدید اور سنگین ذلت کے بعد وہ بھلا کیسے اسے قتل کر سکتی تھی۔ نہ ہی اس کے پاس چال بازی کی مہلت تھی۔

بودے انداز میں اس کے دفتر میں بیٹھے ہوئے اس نے لیووینتھل سے معذرت کی، (ایک مخبر کے روپ میں) اپنی وفاداری کی ذمہ داری کا ذکر کیا، چند نام لیے، چند ایک کو فرض کیا۔ یوں بولتے بولتے اچانک رک گئی جیسے کسی خوف نے گھیر لیا ہو۔ لیووینتھل اس کے لیے پانی کا گلاس لینے گیا۔ ڈائننگ روم سے اس کے لوٹ آنے تک، کہ عورت کی جذباتیت سے غیر متاثر ہونے کے باوجود وہ دل میں اس کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا، ایما دراز میں سے بھاری ریوالور نکال چکی تھی۔ اس نے ٹریگر دو مرتبہ دبایا۔ لیووینتھل کا بھاری بھر کم جسم یوں ڈھے گیا جیسے دھماکوں اور دھویں سے کچلا گیا ہو۔ پانی کا گلاس گر کر چکنا چور ہو گیا۔ اس کا چہرہ حیرت اور برہمی کے تاثرات میں لپٹا اس کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے ہسپانوی اور یدش زبان میں گالیاں نکل رہی تھیں۔ شیطانی الفاظ مسلسل بہہ رہے تھے۔ ایما کو پھر سے گولی چلانی پڑی۔ نیچے صحن میں زنجیر سے بندھا کتا بری طرح بھونکنے لگا تبھی اس کے بدکلام ہونٹوں سے خون کا فوارہ سا پھوٹ بہا جس نے اس کی داڑھی اور لباس کو بھگو دیا۔

ایما نے الزام نامہ بولنا شروع کیا جو اس نے تیار کر رکھا تھا (''میں نے اپنے باپ کا بدلہ لیا ہے اور مجھے اس کی سزا نہیں دی جائے گی۔) لیکن وہ ابھی اپنی بات مکمل نہیں کر پائی تھی کہ لیووینتھل نے آخری سانس لی۔ وہ کبھی نہیں جان سکی کہ وہ اسے سمجھ بھی پایا تھا یا نہیں۔

کتے کی تناؤ بھری بھونکار نے اسے یاد دلایا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے صوفے پر بے ترتیبی پیدا کی، مردہ شخص کی جیکٹ کے بٹن کھولے، اس کی دھبہ دار عینک اتاری اور انھیں فائلوں کی الماری کے اوپر رکھ دیا۔ پھر اس نے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور وہی کچھ دہرایا جو وہ اب تک کئی مرتبہ دہرا چکی تھی، کچھ ایسے ہی یا ذرا مختلف الفاظ میں: کوئی غیر معمولی واقعہ ہو چکا ہے،

کوئی نا قابل یقین واقعہ۔ لیو ویلنتھل نے ہڑتال سے متعلق بات کرنے کے لیے مجھے یہاں بلایا تھا۔ انھوں نے مجھ سے جنسی زیادتی کی۔ میں نے انھیں قتل کر دیا۔

کہانی نا قابل یقین تھی لیکن پھر بھی اس نے ہر کسی کو متاثر کیا کیوں کہ اصل میں ایسا ہی ہوا تھا۔ ایمازنز کا لہجہ بھی سچا تھا، اس کی ندامت میں بھی جھوٹ نہیں تھا، اس کی نفرت بھی حقیقی تھی۔ وہ ہتک بھی سچی تھی جو اس نے محسوس کی۔ صرف جو بات جھوٹ تھی، وہ واقعات تھے، اور وقت اور ایک یا دو خصوصی نام۔

# خواب میں ہونے والی ایک واردات

یہ واقعہ 1897 میں مونٹی ویڈیو میں ہوا۔

ہر ہفتے سبھی دوست کیفے ڈیل گلوبو میں اسی میز کے گرد بیٹھتے، ایک طرف پرے ہوکر۔ وہ سبھی کم تر مالی حیثیت کے حامل تھے، جانتے تھے کہ دوستوں کو اپنے گھروں پر مدعو نہیں کرسکتے، یا پھر شاید گھر سے فرار پانے کے لیے یہاں آتے۔ وہ سبھی مونٹی ویڈیو سے تھے۔ پہلے پہل تو اریی ڈونڈو سے واقفیت گانٹھنا دشوار معلوم ہوا، وہ اندرونی علاقے کا ایک شخص تھا جو کسی پر اعتبار نہیں کرتا، نہ سوال پوچھتا تھا۔ وہ بیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں تھا، نحیف، گہری جلد والا نوجوان، کچھ ناٹا قد اور غالباً کچھ بودا بھی۔ اس کا چہرہ بھلا دیئے جانے والے چہروں میں سے ہوتا اگر اس کی آنکھیں اسے نہ بچا لیتیں جو بیک وقت خمار آلود اور توانائی سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ بیونس ایریز میں خشک مصنوعات کے سٹور پر کلرک تھا اور اپنا فارغ وقت قانون کے مطالعہ میں صرف کرتا۔

جب سبھی جنگ کے خلاف تھے جو ملک کو تباہی سے دوچار کر رہی تھی اور جسے صدر (عمومی رائے کے مطابق) قابل ملامت وجوہات کی بنا پر جاری رکھے ہوئے تھا، اریی ڈونڈو نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ وہ تب بھی خاموش رہا جب دوسرے اس کا ٹھٹھہ اڑاتے اور اسے بخیل آدمی پکارتے۔ سیروس بلینکوس کی جنگ کے تھوڑے عرصہ بعد اریی ڈونڈو نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ آئندہ کچھ مدت تک وہ اس سے نہیں مل پائے گا۔ اسے مرسڈیز جانا تھا۔ کسی کو اس خبر سے کوئی

تشویش نہیں ہوئی۔ کسی نے اسے متنبہ کیا کہ وہ ایپاریسیو ساراویو کے گاؤ چو چرواہوں کے ٹولے سے ہشیار رہے۔ ایری ڈونڈو مسکرایا اور بولا کہ سفید فام لوگوں سے وہ نہیں ڈرتا۔ اس کے ہم سخن نے ،جس نے جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی، کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے لیے اپنی محبوبہ کلارا کو الوداع کہنا دشوار تھا۔ کچھ ایسے ہی الفاظ میں اس نے اسے بھی خدا حافظ کہا۔ اسے بتایا کہ وہ اس کی طرف سے کسی خط کی توقع نہ کرے، کیوں کہ وہ آئندہ بہت زیادہ مصروف ہو جائے گا۔ کلارا، جسے لکھنے کی عادت نہیں تھی، نے یہ شرط کسی احتجاج کے بغیر قبول کر لی۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کے گہرے تعلق میں جڑے تھے۔

ایری ڈونڈو مضافاتی علاقے میں رہتا تھا۔ اس کے ہاں ایک سیاہ فام عورت کام کرتی تھی جس کے نام کا آخری لفظ وہی تھا جو ایری ڈونڈو کا تھا۔ اس عورت کے آباؤ اجداد جنگ عظیم کے زمانے سے اس خاندان کے غلام تھے۔ وہ بہت بھروسے کی عورت تھی۔ ایری ڈونڈو نے اسے تاکید کی کہ جو کوئی اس کے بارے میں پوچھے، وہ اسے ٹال دے اور کہے کہ وہ قصبے سے باہر گیا ہوا تھا۔

اس نے خشک مصنوعات کے سٹور سے اپنی آخری تنخواہ نکلوا لی اور گھر کے پچھلے کمرے میں منتقل ہو گیا، جو مٹی سے بنے ایک صحن میں کھلتا تھا۔ اس اقدام کا مطلب بظاہر کچھ نہیں تھا لیکن اس سے اسے عزلت گزینی کا آغاز کرنے میں مدد ملی جو اس نے خود پر عائد کی تھی۔

اپنے تنگ آہنی بستر سے، جس میں اس نے قیلولہ کرنے کی عادت کو بتدریج بحال کیا، اس نے اداسی سے کتابوں کے خالی خانے کو دیکھا۔ وہ اپنی سبھی کتابیں فروخت کر چکا تھا حتیٰ کہ قانون کی تعارفی جلدیں بھی۔ جو کتاب بچ رہی تھی، وہ انجیل مقدس تھی جسے وہ کبھی نہیں پڑھ سکا۔ وہ اس کا ہر صفحہ کھنگالتا، کبھی دلچسپی سے، اور کبھی بوریت کے ساتھ۔ اس نے خود پر کتاب خروج کا کوئی ایک باب اور کتاب سلیمان کا آخری باب زبانی یاد کرنے ذمہ داری ڈالی۔ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہوتا، کبھی اسے سمجھنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ ایک آزاد خیال انسان تھا لیکن خدا کی عبادت کے بغیر

اس کی کوئی رات نہیں گزری کہ مونٹی ویڈیو آتے ہوئے اس نے اپنی والدہ سے وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے سے انحراف اس پر کسی بدبختی کے نزول کا باعث بن سکتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی منزل مراد 25 اگست کی صبح تھی۔ اس بات کا بھی اسے بخوبی علم تھا کہ کتنے دن اسے یونہی گزارنے تھے۔ ایک بار اپنے ہدف کو پالے تو پھر وقت کا گزران ختم ہو جائے گا، یا اس کے بعد کچھ بھی ہو جائے، اس کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھے گا۔ اس نے اس دن کا ایسے شخص کی طرح انتظار کیا جو اپنی مسرت اور آزادی کا منتظر ہو۔ اس نے اپنی گھڑی کو روک لیا تھا تاکہ وہ ہمیشہ اسے ہی نہ دیکھتا رہے۔ لیکن ہر رات وہ دور سے آتی ہوئی بارہ گھنٹوں کی تاریک آواز سنتا تو کیلنڈر کا ایک صفحہ پھاڑ لیتا اور سوچتا کہ ایک دن اور کم ہو گیا۔

پہلے پہل اس نے اپنا کوئی معمول بنانے کی کوشش کی۔ ماتے پیتا، سیاہ سگریٹ بنانے کے بعد انھیں پھونکتا، مخصوص تعداد میں صفحے پڑھتا اور ان کا تجزیہ کرتا، کلیمینٹینا کے ساتھ کچھ بات چیت کرتا جب وہ ٹرے میں اس کے لیے رات کا کھانا لاتی، لیمپ بجھانے سے پہلے وہ ایک خاص تقریر دہراتا اور اسے سجاتا سنوارتا۔ کلیمنٹینا سے بات کرنا، جو عمر کی منزلیں طے کر رہی تھی، آسان نہیں تھا کیوں کہ اس کی یادداشت شہر سے دور ٹھہری ہوئی تھی، دیہات کی ارضی زندگی میں ہی کہیں۔

ایری ڈونڈو کے پاس شطرنج کی بساط بھی تھی جس پر وہ منتشر کھیل کھیلتا جو کبھی اختتام پذیر نہ ہو پاتے۔ مہروں میں ایک رُخ کم تھا جس کی جگہ وہ پستول کی گولی یا سکہ استعمال کرتا۔

وقت گزارنے کے لیے ہر صبح ایری ڈونڈو ایک جھاڑن اور ایک بڑے جھاڑو سے کمرہ صاف کرتا، حتیٰ کہ مکڑی کے جالے بھی ہٹاتا۔ سیاہ عورت معمولی گھریلو کاموں میں اس کی شمولیت کو پسند نہ کرتی۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ عورت کے دائرہ کار میں آتے تھے بلکہ اس لیے بھی ایری ڈونڈو انھیں ڈھنگ سے نہ کر پاتا۔

وہ پسند کرتا تھا کہ تب بیدار ہو جب سورج سر پر چڑھ آئے لیکن علی الصبح بیدار ہونے کی

عادت اس کی خواہش سے کہیں زیادہ مضبوط تھی۔ وہ اپنے دوستوں کی کمی محسوس کرتا حالاں کہ وہ کسی تلخ احساس کے بغیر یہ مانتا تھا کہ وہ اس کی ناقابل تسخیر اسیری کے پیش نظر اسے شاذ ہی یاد کرتے ہوں گے۔ ایک سہ پہر ان میں سے ایک دوست اس کا پوچھتا ہوا وہاں آیا لیکن دہلیز ہی سے لوٹ گیا۔ سیاہ عورت اسے نہیں جانتی تھی۔ ایری ڈونڈو کبھی نہیں جان پایا کہ وہ کون تھا؟ اخبار پڑھنے کے شائق ایری ڈونڈو کے لیے ایسی عارضی عجیب باتوں کو نظر انداز کرنا دشوار تھا۔ وہ غور و خوص کرنے والا انسان نہیں تھا یا ایسا انسان جو زیادہ تفکر کرتا ہو۔

اس کے دن اور راتیں ایک جیسی گزرتیں لیکن اتواریں زیادہ بھاری ہوتیں۔ جولائی کے وسط میں اس نے قیاس کیا کہ اپنے وقت کو تقسیم کرنے میں اس سے غلطی ہوئی تھی جو کسی نہ کسی انداز میں ہم پر بار ہوتا ہے۔ اس موقع پر اس نے اپنے تخیل کو بھٹکنے دیا اپنے آبائی وطن کے وسیع دیہاتوں سے لے کر، جواب خون آلود ہو چکے تھے، اور سانتا ایرین کے چٹیل میدانوں سے لے کر، جہاں اس نے کبھی پتنگیں اڑائی تھیں، خاص سیاہ و سپید گتھے ہوئے جسم کے گھوڑے تک جو یقیناً اب تک مر چکا ہو گا، اور مویشیوں کے پیروں سے اڑتی دھول سے لے کر، جب چرواہے انھیں باڑے میں ہانک لاتے ہیں، تھکی ماندی گھوڑا گاڑی تک جو ہر ماہ فرے بینٹوس سے نقلی جواہرات کے ڈھیر لاد کر لاتی تھی، اور لا ایگرا سیاڈا کے ساحلی علاقے سے لے کر جہاں 'تیس' ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا، ہروڈیریو تک، اور اونچے نیچے پہاڑوں، ویرانوں اور دریاؤں، اور سیرو سے لے کر جس پر وہ چڑھا تھا، لائٹ ہاؤس تک پھیل جانے دیا۔

ایک بار وہ سیرون کے ساحلی علاقے سے یوراگوئے کے امتیازی نشان والے پہاڑی قلعے تک گیا تھا جہاں وہ سو گیا۔ رات کو سمندری ہوا ٹھنڈی ہو جاتی اور سونے کے لیے موزوں بھی۔ اس نے کبھی بے نیند رات نہیں گزاری۔ وہ اپنی محبوبہ سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا تھا لیکن اسے بتایا گیا تھا کہ انسان کو عورتوں کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے خاص کر جب کہ کوئی بھی رسائی میں نہ ہو۔ دیہات میں رہنے سے اس کی پاکبازی کی عادت پختہ ہو گئی تھی۔ جہاں تک

دوسرے جذبے کا تعلق تھا، وہ اس شخص کے بارے میں سوچنے سے ممکنہ حد تک احتراز کرتا جس سے اسے نفرت ہوتی۔ چھت پر بارش کے برسنے کی آواز اس کی تنہائی کی ساتھی تھی۔

ایک قیدی یا اندھے انسان کے لیے وقت نیچے کی طرف بہتا ہے جیسے زوال پذیر ہو۔ اپنی خلوت گزینی کے وسط میں پہنچنے پر ایری ڈونڈو کو واقعتاً لاوقت کا ادراک ہوا۔ صحن میں پانی کا ایک قدرتی منبع تھا اور تہہ میں ایک تالاب، جہاں ایک مینڈک رہتا تھا۔ ایری ڈونڈو کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ مینڈک کا وقت تھا، ابدیت سے جڑا ہوا، جسے اس نے تلاش کر لیا تھا۔

جوں جوں دن گزرا اس کی بے چینی پھر سے بیدار ہوئی۔ ایک رات یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔ ہر شے مختلف اور پہلے سے بڑی معلوم ہوئی۔ جونہی وہ گلی کی نکڑ سے مڑا، اس نے روشنی دیکھی اور ایک پرچون فروش کی دکان میں چلا گیا جس میں شراب کا کاؤنٹر بھی تھا۔ اپنے وہاں ہونے کا جواز فراہم کرنے کے لیے اس نے ڈبے میں بند برانڈی کے ایک شاٹ کا آرڈر دیا۔ چند سپاہی وہاں چوبی کاؤنٹر پر کہنیاں جمائے بیٹھے محو گفتگو تھے۔ ان میں سے ایک بولا، ''آپ سب جانتے ہیں کہ جنگوں کے بارے میں کوئی خبر افشا کرنا غیر قانونی ہے۔ اس حوالے سے باضابطہ احکامات موجود ہیں۔ کل سہ پہر ہمارے ساتھ ایک واقعہ ہوا جسے سن کر آپ کو مزہ آئے گا۔ چند بیرکوں کے فاصلے پر میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک اخبار 'La Razon' کے دفتر کے آگے سے گزر رہا تھا۔ ہمیں اندر سے آواز سنائی دی جو اس ضابطے کے سراسر خلاف تھی۔ ہم نے اندر داخل ہونے میں دیر نہ لگائی۔ سٹی روم کسی گڑھے کی طرح تاریک تھا۔ ہم نے اس ہلکے پیٹ والے غدار پر گولی چلا دی جو وہاں یہ بک بک کر رہا تھا۔ جب وہ مکمل خاموش ہو گیا، تو ہم آگے بڑھے تاکہ اسے گریبان سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لائیں۔ لیکن دیکھا کہ وہ تو ایک مشین تھی۔ وہ اسے فونوگراف کہتے تھے۔ وہ اپنے آپ باتیں کرتی تھی۔''

سبھی ہنسنے لگے۔ ایری ڈونڈو بھی انھیں بغور سن رہا تھا۔

''تم کیا سوچتے ہو۔ کتنا مایوس کن ہے، دوست۔''

اریی ڈونڈو خاموش رہا۔ باوردی شخص اپنا چہرہ اریی ڈونڈو کے قریب لے آیا۔ ''میں سننا چاہتا ہوں کہ تم کتنی اونچی آواز میں کہتے ہو 'ہمارے ملک کا صدر، حوان آئیڈیار تے بوردا زندہ باد۔''

اریی ڈونڈو نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ قہقہوں اور تالیوں کے شور میں وہ دروازے تک آیا۔ گلی میں اسے آخری تضحیک کا نشانہ بننا پڑا۔

''کسی نے یہ نہیں کہا کہ بزدل احمق ہوتے ہیں، یا یہ کہ مزاج کے تیز ہوتے ہیں۔''

اس کا رویہ بزدلانہ تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ بزدل نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے واپس مڑا اور پورے ارادے سے گھر لوٹا۔

25 اگست کو اپولینو اریی ڈونڈو نو بجے کے کچھ بعد بیدار ہوا۔ اسے کلارا کا خیال آیا۔ پھر اس نے سوچا بھلا یہ کون سا دن تھا؟ 'انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں۔ آخر کار میں یہاں تک پہنچ گیا۔' اس نے اطمینان کے احساس کے ساتھ خود سے کہا۔

پھر تسلی سے حجامت بنائی۔ آئینے میں اسی چہرے کو دیکھا جو اسے ہمیشہ وہاں ملتا تھا۔ ایک سرخ ٹائی منتخب کی اور اپنا بہترین لباس نکالا۔ ذرا دیر سے دوپہر کا کھانا کھایا۔ ابر آلود آسمان سے مینہ کا کھٹکا پیدا ہوا۔ اس نے اس دن کو ہمیشہ ایک چمکدار دن کے طور پر تصور کیا تھا۔ اپنے نم آلود کمرے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑتے ہوئے اسے تلخی کا احساس ہوا۔ دہلیز پر اس کی ملاقات سیاہ فام عورت سے ہوئی جس نے اسے بچ رہنے والے آخری پیسوز دیئے۔ ہارڈویئر سٹور پر لگے بورڈ میں اس نے ہیرے جیسے رنگ دار ڈیزائن دیکھے اور محسوس کیا کہ دو مہینوں سے بھی زیادہ عرصہ گزرا جب اس نے ان کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ کیلی سرانڈی کی جانب چل پڑا۔ یہ چھٹی کا دن تھا اور بہت کم لوگ وہاں موجود تھے۔

ابھی تین نہیں بجے تھے جب وہ پلازہ میٹرز پہنچا۔ TeDeum گیت گایا جا رہا تھا۔ دیدہ زیب لباس میں ملبوس افراد، فوجی افسران، اور کلیسا کے عہدے دار گرجا گھر کی چوڑی

سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ پہلی نظر میں اونچے ہیٹ (جنھیں چند ایک ابھی تک ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے)، وردیاں، سنہری ڈوریاں، ہتھیار اور ڈھیلے کوٹ یہ التباس پیدا کرتے تھے کہ جیسے وہ تعداد میں بہت زیادہ ہوں۔ سچ یہ تھا کہ وہ تیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھے۔ ایری ڈونڈ وخوف زدہ نہیں ہوا۔ اس کے دل میں احترام کا احساس جاگا۔ اس نے پوچھا کہ ان میں صدر کون تھا؟

''وہاں بشپ کے ساتھ تاج اور چھڑی لیے ہوئے۔'' کسی نے اسے بتایا۔

اس نے پستول نکالا اور اس پر گولی داغ دی۔

آئیڈیرتے بوردا چند قدم چلا، پھر منہ کے بل زمین پر آرہا اور واضح الفاظ میں بولا، ''مجھے قتل کر دیا گیا۔''

ایری ڈونڈو نے خود کو حکام کے حوالے کر دیا۔

''میں سرخا ہوں اور یہ کہتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے صدر کو قتل کیا جس نے ہماری جماعت سے غداری کی اور اسے دھوکہ دیا۔ میں اپنے دوستوں اور اپنی محبوبہ سے کنارہ کش ہو گیا تھا تاکہ انھیں اس معاملے میں نہ گھسیٹا جائے۔ میں اخبارات نہیں پڑھتا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اخبارات کی وجہ سے مجھے یہ تحریک ہوئی۔ اس منصفانہ فعل کا میں اکیلا ہی ذمہ دار ہوں۔ اب مجھ پر مقدمہ چلاؤ۔''

تو اس طور یہ واقعات رونما ہو سکتے تھے، بلکہ شاید کچھ زیادہ پیچیدہ انداز میں۔ تو یوں میں نے انھیں اپنے خواب میں ہوتا دیکھا۔

# آسٹریون کا گھر

''اور ملکہ نے ایک بچے کو جنم دیا جسے آسٹریون کہا گیا''

(اپالوڈورس: لائبریری، III ,I)

میں جانتا ہوں وہ مجھ پر متکبر ہونے کا الزام تھوپتے ہیں۔ غالباً مردم بے زاری کا اور پاگل پن کا بھی۔ یہ الزامات (جن کا میں مناسب وقت پر جواب دوں گا) تمسخر آمیز ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں ہے کہ اس کے دروازے (جن کی تعداد غیر محدود ہے) رات دن انسانوں اور جانوروں دونوں کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ (نوٹ: اصل میں ان کی تعداد چودہ بتائی جاتی ہے لیکن اس بات پر یقین کرنے کی ٹھوس وجہ موجود ہے کہ آسٹریون کے لیے اس سے مراد 'لامحدود' ہی ہے۔) کوئی بھی، جو اندر آنے کی خواہش رکھتا ہو، یہاں آ سکتا ہے۔ یہاں اسے نہ کسی قسم کے نسوانی طمطراق کا سامنا ہوگا، نہ پر تکلف درباری وضع داری کا، بلکہ صرف سکوت اور تنہائی کا۔ یہاں اسے ایک گھر ملے گا جیسا کوئی دوسرا اس کرہ ارض پر نہیں ہے (جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مصر میں اس سے ملتا جلتا ایک گھر ہے، وہ دروغ گو ہیں) حتیٰ کہ میرے عیب گو بھی اعتراف کرتے ہیں کہ گھر میں فرنیچر نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے۔ ایک دوسری مضحک افواہ کے مطابق میں یعنی آسٹریون، یہاں قید ہوں۔ کیا مجھے یہ دہرانا ہوگا کہ یہاں کوئی مقفل دروازہ نہیں ہے۔ اور کیا مجھے یہ بھی بتانا ہوگا کہ یہاں سرے سے قفل ہی نہیں ہیں۔

علاوہ ازیں ایک سہ پہر میں واقعی باہر گلی میں نکلا۔ لیکن رات ہونے سے پہلے لوٹ آیا، صرف اس خوف سے کہ عوام الناس کے چہرے، کھلی ہتھیلی کی مانند بے کیف اور سپاٹ چہرے، مجھ میں دہشت پیدا کر رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ لیکن ایک بچے کی لاچار گریہ زاری اور عوام الناس کی غیر مہذب التجائیں، اس بات کے اشارے تھے کہ میں شناخت کر لیا گیا تھا۔ لوگوں نے دعائیں مانگیں، بھاگے اور میرے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ چند ایک کلہاروں کے معبد کے ستونوں کو ملانے والے پر چھتی پر جا چڑھے۔ چند ایک نے پتھر اکٹھے کر لئے۔ ان میں سے ایک نے، مجھے یقین ہے کہ سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ میری ماں آخر یونہی تو ملکہ نہیں بنی۔ میں عوام الناس میں گھل مل نہیں سکتا تھا چاہے میری عاجزانہ طبیعت اسی کی خواہاں ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ میں منفرد ہوں۔ ایک انسان دوسروں کو کیا منتقل کر سکتا ہے، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک فلسفی کی مانند میں سوچتا ہوں کہ فن تحریر کے ذریعے کچھ بھی بیان نہیں ہو سکتا۔ منتشر خصلت اور ادنیٰ باتوں کے لئے میری روح میں کوئی گنجائش نہیں ہے جو عظمت و رفعت کے لیے متشکل ہوئی ہے۔ نہ ہی میں کبھی مختلف حروف میں امتیاز قائم رکھ پاتا ہوں۔ خاص فیض بخش اضطراب نے مجھے فن مطالعہ میں درک حاصل کرنے سے باز رکھا۔ کبھی کبھار مجھے افسوس ہوتا ہے کہ راتیں اور دن طویل ہوتے ہیں۔

بے شک ایسے عوامل کئی ہیں میری توجہ بٹانے والے۔ کبھی میں ایک حملہ آور مینڈھے کی طرح سنگلاخ غلام گردشوں میں بھاگتا ہوں۔ حتیٰ کہ چکرا کر گر جاتا ہوں۔ کبھی میں خود کو ایک حوض کے سایے یا ایک راہ داری کے کونے میں چھپا لیتا ہوں اور مکر کرتا ہوں کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہاں چھتیں ہیں جہاں سے میں خود کو نیچے گرا لیتا ہوں حتیٰ کہ خونم خون ہو جاتا ہوں۔ کسی بھی وقت میں یہ مکر کر سکتا ہوں کہ میں سویا ہوا ہوں اور آنکھیں موند کر گہرے سانس بھرنے لگتا ہوں۔ (کبھی کبھار میں واقعی سو جاتا ہوں، کبھی جب میں آنکھیں وا کرتا ہوں تو دن کا رنگ بدل چکا ہوتا ہے)۔ لیکن ان تمام کھیلوں میں دوسرے 'آسٹریون' کو فرض کرنے کا کھیل میرا پسندیدہ ترین

ہے۔ یہی کہ وہ مجھ سے ملنے آیا ہے اور میں اسے اپنا گھر دکھاتا ہوں۔

تعظیم سے میں اسے بتاتا ہوں، ''اب ہم سابقہ چوراہے کی طرف لوٹتے ہیں یا اس راستے پر ایک دوسرے صحن کی طرف چلتے ہیں یا میں جانتا تھا کہ آپ کو یہ برساتی پرنالہ پسند آئے گا یا اب آپ ایک حوض دیکھیں گے جو ریت سے بھرا ہوا ہے۔ یا اب آپ دیکھیں گے کیسے یہ تہہ خانہ شاخ در شاخ تقسیم ہوتا ہے۔ کبھی کبھار مجھ سے بھول سرزد ہو جاتی ہے۔ ہم دونوں دل کھول کر قہقہے لگاتے ہیں۔

یہ کھیل ہی میں نے اختراع نہیں کئے، گھر کے بارے میں غور و خوض بھی کرتا ہوں۔ گھر کا ہر حصہ خود کو بار بار دہراتا ہے، کوئی بھی خاص جگہ کوئی سی بھی دوسری جگہ ہو سکتی ہے۔ وہاں کوئی ایک حوض' ایک صحن' پینے کے پانی والا کوئی ایک فوارہ، جانوروں کے چارہ کھانے کا کوئی ایک کٹھلا نہیں ہے۔ بلکہ وہاں چودہ (لامحدود) کٹھلے، پینے کے پانی والے فوارے، صحن، حوض ہیں۔ گھر دنیا ہی کے حجم کا ہے' یا پھر یہ کہ یہ دنیا ہی ہے۔

بہر حال کنویں والے کسی ایک صحن اور بھورے پتھر کی گرد آلود راہ داری میں سے گزرتے ہوئے، میں گلی میں نکل آیا۔ مجھے کلہاروں کا معبد اور سمندر دکھائی دیا۔ اس منظر کو میں تب تک نہ سمجھا جب تک رات کے کشف نے مجھ پر یہ ظاہر نہ کیا کہ سمندر اور معبد بھی تعداد میں چودہ (غیر محدود) ہیں۔ ہر شے متعدد بار، چودہ بار دھرائی گئی ہے۔ لیکن دنیا میں دو باتیں بس ایک ہی مرتبہ رونما ہوئیں: ایک تو اوپر عرش پر پیچیدہ سورج اور نیچے آسٹریون ..... شاید میں نے ہی ستاروں' سورج اور اس جسیم گھر کو تخلیق کیا۔ لیکن مجھے اب کچھ بھی یاد نہیں ہے۔

ہر نو برسوں میں نو آدمی گھر میں داخل ہوتے ہیں تا کہ میں انہیں تمام تر شر سے آزاد کر سکوں۔ میں سنگلاخ غلام گردشوں میں دور ہی سے ان کے قدموں کی چاپ یا آوازیں سنتا ہوں۔ خوشی سے ان کی تلاش میں بھاگتا ہوں۔ یہ تقریب چند منٹوں سے زیادہ دیر جاری نہیں رہتی۔ یکے بعد دیگرے میرے ہاتھ خون آلود ہونے سے پہلے ہی وہ زمین پر گرتے جاتے ہیں۔ جہاں گرتے

ہیں، وہیں پڑے رہتے ہیں۔ ان کی نعشوں سے میں مختلف غلام گردشوں میں فرق کر پاتا ہوں۔ میں نہیں جانتا وہ تعداد میں کتنے ہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان میں سے ایک نے اپنی موت کے وقت یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ایک روز میرا نجات دہندہ آئے گا۔

تب سے تنہائی میرے لئے باعث اذیت نہیں رہی۔ کیونکہ میں جان چکا ہوں کہ میرا نجات دہندہ زندہ ہے۔ اور آخر ایک دن وہ خاک سے اٹھے گا۔ اگر میری حس سماعت دنیا کی تمام آوازوں کا احاطہ کر سکے تو اس کے قدموں کی چاپ بھی سن لوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ مجھے ایسی جگہ لے جائے جہاں چند غلام گردشیں اور چند دروازے ہوں گے۔ میں سوچتا ہوں میرا نجات دہندہ کیسا ہوگا؟ وہ کوئی سانڈ ہوگا یا انسان؟ ہو سکتا وہ انسانی چہرے والا سانڈ ہو؟ یا پھر وہ میرے جیسا ہوگا؟

صبح کا سورج کانسی کی تلوار میں منعکس ہوا۔ اب اس پر خون کا کوئی دھبہ باقی نہیں رہا۔

''کیا تم یقین کرو گے، آریادن'' تھیسئس نے کہا ''مینوتار نے تو خود کو بچانے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

---

# شاخ دار راستوں والا باغ

لڈل ہارٹ کی ''تاریخ جنگ عظیم'' کے صفحہ 242 پر آپ کو لکھا ملے گا کہ 24 جولائی 1916ء کو سیرے مونٹا بن سرحد پر تیرہ برطانوی ڈویژنوں (جن کے ہمراہ 14 سو توپیں بھی تھیں) کے حملے کا منصوبہ بنایا گیا جسے بعدازاں 29 جولائی کی صبح تک موخر کر دیا گیا۔ کیپٹن لڈل ہارٹ کے مطابق اس التواء کا سبب غیر متوقع تند بارشیں تھیں۔ ایک تاخیر جیسا کہ ثابت ہوا، جس سے کہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔

درج ذیل عبارت جسے تسنگ تاؤ میں ہوشیول میں انگریزی کے سابقہ پروفیسر ڈاکٹر یوسون نے لکھوایا، پھر سے پڑھا اور اس پر دستخط کیے، اس تمام معاملے پر غیر متوقع انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔ دستاویز کے دو ابتدائی صفحات غائب ہیں۔

''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے وہ آواز پہچان لی جس نے جرمن زبان میں جواب دیا تھا۔ یہ کیپٹن رچرڈ میڈن کی آواز تھی۔ وکٹر رو بنرگ کے فلیٹ میں میڈن کی موجودگی کا مطلب تھا کہ ہماری کاوشوں کا اختتام قریب تھا اور (اگرچہ مجھے یہ بات ثانوی محسوس ہوئی یا اسے یونہی محسوس ہونا چاہئے تھا کہ) یہ ہماری زندگیوں کا بھی خاتمہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ رونبرگ گرفتار ہو چکا یا مارا جا چکا تھا۔ (ایک عجیب اور انتہائی ناخوش گوار خیال۔ پروشیا کا جاسوس ہانز ربنز المعروف وکٹر رونبیرگ نے ایک آٹو میٹک پستول اسے گرفتار کرنے آئے ہوئے افسر کیپٹن رچرڈ میڈن پر تان لیا۔ میڈن نے اپنے دفاع

میں ریبنز پر گولی چلائی جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔مدیر کا نوٹ )

آج غروب آفتاب سے پہلے میں خود بھی اسی انجام سے دوچار ہو جاؤں گا۔میڈن ایک سخت دل شخص ہے یا پھر یہ اس کی مجبوری ہے کہ وہ ایسا ہو۔مملکت انگلستان کا ملازم،ایک آئرش،وہ ایسا شخص ہے جس پر کاہلی اور شاید غداری کے الزامات تھے،وہ بھلا ایسے معجزانہ موقع کو ہاتھ سے جانے دینے اور اس پر شکر گزار نہ ہونے کی غلطی کس طرح کرسکتا تھا۔جرمن رائخ کے دو جاسوسوں کا سراغ ملنا،ان کا گرفتار ہونا یا غالباً موت کے گھاٹ اتر جانا۔میں اوپر اپنے کمرے میں گیا۔احمقانہ طور پر دروازے کو مقفل کیا اور خود کو پشت کے بل تنگ آہنی کھاٹ پر گرالیا۔کھڑکی سے باہر مجھے مانوس چھتیں اور بادلوں سے ڈھکا ہوا چھ بجے کا سورج دکھائی دیا۔مجھے یہ بات غیر معمولی معلوم ہوئی کہ آج کا دن کسی طرح کی پیشین گوئیوں یا اشاروں کے بغیر میری ناگزیر موت کا دن ہوگا۔اس کے باوجود کہ میرے والد فوت ہو چکے،اور اس کے باوجود کہ میں بچپن میں ہائی فنگ کے متشاکل باغ میں رہا،تو کیا میں اب مر جاؤں گا؟

تب میں نے سوچا کہ ہر واقعہ ہر انسان کے ساتھ رونما ہوتا ہے اور کسی ابہام کے بغیر ہوتا ہے،خاص طور پر لمحہ موجود میں۔صدیوں کے بعد صدیاں گزرتی ہیں لیکن پھر بھی واقعات صرف زمانہ حال میں ہوتے ہیں۔ان گنت افراد ہوا میں ہیں،زمین پر اور سمندر میں ہیں،پھر بھی ہر واقعہ جو حقیقتاً ہو رہا ہے،وہ میری ذات سے وابستہ ہے۔میڈن کے گھوڑے سے مشابہ چہرے کی ناقابل برداشت یاد نے میری آوارہ خیالیوں کو کافور کیا۔نفرت اور دہشت کی کیفیت کے بین بین (اپنے خوف کا ذکر میرے لیے باعث ندامت نہیں ہے۔اب جب کہ میں رچرڈ میڈن کا ٹھٹھہ اڑا چکا ہوں،اب جب کہ میری گردن پھانسی کے پھندے کی آرزومند ہے۔) مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس انتشار انگیز اور بلاشبہ انتہائی مسرور جنگجو کو یہ گمان بھی نہیں ہوگا کہ میرے پاس وہ راز موجود ہے،دریائے اینکر پر نئے برطانوی توپ خانے کے صحیح مقام کا راز۔

ایک پرندہ تیزی سے لہراتا ہوا بھورے آسمان پر سے گزرا اور بے دھیانی میں میں نے اسے

ہوائی جہاز سے تعبیر کیا اور پھر ان بہت سے جہازوں کو (فرانسیسی آسمان میں اڑتے ہوئے) فوجی چھاؤنی کو عمودی بمباری سے نیست و نابود کرتے ہوئے تصور کیا۔ کاش میرے منہ سے، اس سے پیشتر کہ گولی اسے پاش پاش کر دے، یہ خفیہ نام ادا ہو سکے کہ اسے جرمنی میں سن لیا جائے تو۔۔۔۔۔۔ لیکن میری آواز بہت نحیف ہے۔

کیسے میں اسے چیف کے کانوں تک پہنچا سکتا تھا؟ اس لاغر اور قابل نفرین انسان کے کانوں تک جو رونبرگ اور میرے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ہم سٹیفورڈ شائر میں ہیں اور جو برلن میں اپنے ویران دفتر میں بیکار ہی بیٹھا ہماری رپورٹ کے انتظار کا دکھ بھوگ رہا تھا، لامختتم طور پر اخبارات کو کھنگالتے ہوئے۔

میں نے با آواز بلند کہا "مجھے یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔" پھر آواز پیدا کیے بغیر اٹھ بیٹھا، بے ضرورت مگر مکمل خاموشی کے ساتھ جیسے میڈن پہلے ہی سے میری گھات میں دروازے پر پہنچ چکا ہو۔

پھر شاید یہ ثابت کرنے کی کوشش میں کہ اب میرے پاس کچھ نہیں بچا، میں نے اپنی جیبوں میں ٹٹولا۔ وہاں وہی کچھ تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ ایک امریکی گھڑی، نکل کی ایک چین اور ایک مربع نما سکہ، رونبرگ کے اپارٹمنٹ کی شامل تفتیش بے کار چابیوں کا چھلا، ایک نوٹ بک، ایک خط جس کو میں نے فوری طور پر ضائع کرنے کا فیصلہ کیا (لیکن کبھی ایسا کر نہیں سکا۔)، ایک جعلی پاسپورٹ، ایک کراؤن، دو شیلنگ اور چند پنس، سرخ اور نیلی پنسل، ایک دستی رومال، ایک پستول جس میں ایک گولی بھری تھی۔ احمقانہ طور پر میں نے اسے ہاتھ میں تھاما اور اس کا وزن محسوس کیا خود میں جرات پیدا کرنے کے لیے۔ میں نے سوچا پستول کی گولی تو دور سے سنائی دے سکتی تھی۔ دس منٹ کے دورانیہ میں میرا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس واحد شخص کا نام موجود تھا جسے یہ پیغام وہاں پہنچانا تھا۔ وہ فینٹن کے مضافات میں رہتا تھا، ٹرین کے ذریعے آدھے گھنٹے سے بھی کم دورانیہ کے سفر پر واقع۔

میں ایک بزدل آدمی ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اب میں ایسے منصوبے کو اختتام تک لے جا چکا ہوں جس کی پر خطر نوعیت سے اور بے باکی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس پر عمل درآمد کتنا دشوار ہے۔ میں نے یہ سب کچھ جرمنی کے لیے نہیں کیا۔ نہیں۔ ایک بربریت پسند ملک کی میرے دل میں کیا عزت ہو سکتی ہے جس نے مجھے ایک جاسوس ہونے کی خواری میں مبتلا کیا؟ البتہ میں انگلستان کے ایک باشندے کو جانتا ہوں، ایک نفیس انسان، جو میرے خیال میں کسی طور گوئٹے سے کم عظیم نہیں ہے۔ میں نے بمشکل ایک گھنٹہ اُس سے گفتگو ہو گی لیکن اس دوران وہ میرے لیے گوئٹے جیسا ہی عظیم رہا۔۔۔

نہیں۔ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کیونکہ مجھے محسوس ہوا کہ چیف کسی باعث میری قوم کے لوگوں سے خائف تھا، لاتعداد آباؤ اجداد تھے جن کا خون میری رگوں میں دوڑتا تھا۔ میں اُسے ثابت کرانا چاہتا تھا کہ زرد قوم کا ایک شخص اس اہل تھا کہ اپنی فوجوں کا دفاع کر سکے۔ پھر مجھے کیپٹن میڈن سے بھی فرار ہونا تھا۔ اس کے ہاتھ اور آواز کسی بھی لمحہ میرے دروازے تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خاموشی سے لباس پہنا۔ آئینے میں دیکھتے ہوئے خود کو الوداع کہا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا، خاموش گلی کا بغور جائزہ لیا اور روانہ ہو گیا۔

سٹیشن میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ لیکن میں نے ٹیکسی لینے میں ہی دانش مندی سمجھی۔ خود کو یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ اس طرح میرے شناخت کیے جانے کا امکان کم ہو جائے گا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ اس ویران گلی میں میں پہچانا جا سکتا تھا اور خطرے میں تھا۔ بہت زیادہ خطرے میں۔

مجھے یاد ہے میں نے ڈرائیور کو سٹیشن کے داخلی پھاٹک سے کچھ فاصلے پر رکنے کو کہا۔ میں بارادہ اور تکلیف دہ آہستگی کے ساتھ ٹیکسی سے باہر نکلا۔ مجھے ایشگرو گاؤں تک جانا تھا۔ لیکن میں نے اس سے کہیں زیادہ فاصلے کا ٹکٹ لیا۔ ٹرین اگلے چند منٹوں میں ہی 8:50 پر چھوٹے گی۔ میں شتابی سے آگے بڑھا۔ اگلی ٹرین 9.30 سے پہلے نہیں چلے گی۔ میں ریل کے ڈبوں کو دیکھتا آگے

بڑھا۔ مجھے یاد ہے چند کسان اور ایک عورت ماتمی لباس میں ملبوس، ایک نوجوان جو بڑے انہماک سے 'Annals of Tacitus' پڑھ رہا تھا، ایک زخمی اور مسرور دکھائی دیتا فوجی۔ بالآخر ڈبوں کو جھٹکا لگا۔ ایک شخص جسے میں پہچانتا تھا بے سود ہی پلیٹ فارم کے اختتام تک بھاگتا گیا۔ وہ کیپٹن رچرڈ میڈن تھا۔ اندر سے شکستہ، کانپتا ہوا میں ڈراؤنی کھڑکی سے دُور نشست کے پرلے کنارے پر سمٹ گیا۔

اس شکستگی کی کیفیت سے میں ایک طرح کے اسفل سرور کی کیفیت میں مبتلا ہوا۔ میں نے خود سے کہا کہ جنگ تو شروع ہو چکی تھی اور میں اپنے دشمن کے وار کو خالی دے کر پہلا مقابلہ جیت چکا تھا، چاہے قسمت کی معمولی مہربانی سے آئندہ چالیس منٹ کے لیے ہی سہی۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ اس معمولی ترین فتح نے مکمل فتح کو واضح کر دیا تھا۔ اپنے آپ ہی سے میں نے کہا کہ یہ جیت ایسی معمولی بھی نہیں تھی کیوں کہ اس قیمتی مہلت کے بغیر جو ٹرینوں نے مجھے عنایت کی تھی، میں جیل میں ہوتا یا مر چکا ہوتا۔

میں نے خود سے کہا کہ میری بزدلانہ مسرت سے بڑھ کر اس بات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا تھا کہ میں ہی وہ اہل شخص تھا جو اس مہم کو کامیابی سے سر کر پائے۔ اس نقاہت سے میں نے تقویت حاصل کی جو مجھ میں باقی رہنی تھی۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ آنے والے دنوں میں انسان خود کو زیادہ سے زیادہ دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف کر لے گا۔ جلد ہی یہاں جنگجوؤں اور رہزنوں کے سوا کوئی باقی نہیں بچے گا۔ میں انہیں یہ مشورہ دیتا ہوں: جس کسی کو کچھ ہولناک فعل کرنا ہو، اسے خود کو یہ کہنا چاہیے کہ یہ کام تو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اسے خود پر ایسا مستقبل عائد کر لینا چاہیے جو ماضی ہی کی طرح ناقابل حصول ہو۔

تو ایسا میں نے کیا۔ جب کہ میری آنکھیں، ایسے شخص کی آنکھیں جو پہلے ہی مر چکا ہو، اس دن کے گزران کا، جو غالباً میرا آخری دن تھا، پھیلتی ہوئی رات کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ ٹرین نرمی سے، آہستگی سے دیودار کے درختوں کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔ اچانک یہ کھیتوں کے

تقریباً عین وسط میں آ کر ٹھہر گئی۔ کسی نے اسٹیشن کا نام نہیں پکارا۔ میں نے پلیٹ فارم پر موجود چند لڑکوں سے پوچھا ''ایشگرو''۔ انھوں نے جواب دیا ''ایشگرو''۔ میں نیچے اتر آیا۔

پلیٹ فارم پر ایک قمقمہ روشنی پھیلا رہا تھا لیکن لڑکوں کے چہرے سائے میں تھے۔ کسی نے مجھ سے پوچھا ''کیا آپ ڈاکٹر اسٹیفن کے گھر جا رہے ہیں''؟

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک دوسرے شخص نے کہا ''ان کا گھر بہت دور ہے۔ لیکن اگر آپ اس راستے پر بائیں ہاتھ چلیں اور ہر موڑ پر بائیں جانب مڑتے رہیں، تو بھٹکے بغیر وہاں پہنچ جائیں گے۔'' میں نے ایک سکہ ان کی طرف اُچھالا (میری آخری پونجی)۔ پتھر کی چند سیڑھیاں نیچے اُتر کر خاموش سڑک پر چلنے لگا۔ یہ بہت آہستگی سے ڈھلوان سے نیچے اُتر رہی تھی اور گرد سے پُر تھی۔ اُوپر شاخیں اُلجھی ہوئی تھیں اور نیچے تک جھکا ہوا پورا چاند میری ہمراہی میں چلتا محسوس ہو رہا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے مجھے خوف محسوس ہوا کہ رچرڈ میڈن نے کسی طور میرے مایوس کن منصوبے کی سُو لگا لی تھی۔ لیکن فوراً ہی احساس ہوا کہ یہ ناممکن تھا۔ ہمیشہ بائیں جانب مڑنے کی بچے کی ہدایت پر مجھے یاد آیا کہ کسی بھُول بھلیوں کے مرکزی نقطے کو دریافت کرنے کا یہ عمومی طریقہ کار ہے۔ مجھے بھول بھلیوں کا کچھ کچھ فہم ہے۔ ایسے بے کار ہی تو میں تسوئی پن کا پڑپوتا نہیں تھا جو ینان کے گورنر تھے اور جنھوں نے اپنے عہدے سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی تا کہ ایک ناول لکھیں جس میں ''ہنگ لیو مینگ'' (Hung Lu Meng) سے کہیں زیادہ کردار موجود ہوں اور ایک بھول بھلیاں تشکیل دیں جس میں تمام انسان اپنی راہ گم کر بیٹھیں۔

تسوئی پن نے تیرہ برس ان متفرق منصوبوں کی تکمیل میں صرف کیے۔ لیکن ایک اجنبی نے ان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ان کا ناول بے ربط تھا۔ نہ ہی کسی کو ان کی بھول بھلیاں ہی ملیں۔ انگریزی درختوں کے تلے میں نے اِن گم شدہ بھول بھلیوں کے بارے میں سوچا۔ میں نے تصور میں انھیں ایک پہاڑ کی خفیہ گپھا میں مکمل اور غیر مُتغیر حالت میں دیکھا۔ پھر تصور کیا کہ چاول

کے کھیتوں نے انھیں مٹا دیا تھا یا یہ پانی کے نیچے کہیں تھیں۔ میں نے انھیں لامحدود تصور کیا، ایسے ہشت اضلاع خیموں اور راستوں سے مترکب بھول بھلیاں نہیں جو اپنے آپ پر آ کر ختم ہوتی ہوں بلکہ دریاؤں اور صوبوں اور بادشاہوں پر مشتمل بھول بھلیاں۔

میں نے بہت سی بھول بھلیوں والی ایک بھول بھلیوں کا تصور باندھا، آڑھے ترچھے راستوں کی بھول بھلیاں، لہردار، موڑ دار، ہمیشہ پھیلتی ہوئی بھول بھلیاں، جو ماضی اور مستقبل کا احاطہ کر لیں اور کسی طور ستاروں کو بھی محیط ہوں۔ ان التباسی شبیہوں میں کھویا ہوا میں فراموش کر بیٹھا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ مجھے ایک غیر معلوم وقفہ کے لیے اپنا آپ دنیا کا ایک مجرد مدرک محسوس ہوا۔

مبہم، زندہ قصبہ، چاند اور دن کی باقیات نے مجھ پر اثر کیا اور کچھ ایسی ہی سڑک کی ڈھلوان تھی جس نے مجھ میں پژمردگی کے سب امکان ختم کر دیئے۔ شام ہونے کو تھی اور لامحدود بھی۔ سڑک نیچے جا رہی تھی اور شاخ در شاخ تقسیم تھی جیسے اسے بے ہیئت معلوم ہونے والے مرغزاروں میں تراشا گیا ہو۔ مدھم مبہم سُروں کی رنگی موسیقی مجھ تک پہنچ رہی تھی، جو پتوں اور فاصلے اور بارش کی وجہ سے ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ میں ہوا کے نرم جھونکوں میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس خیال نے مجھے جکڑ لیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا، دوسرے شخص کے دیگر لمحوں کا دشمن ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی ایک ملک کا نہیں۔ نہ ہی اس کے جگنوؤں، لفظوں، باغوں، ندیوں اور غروب آفتاب کے منظروں کا۔

ایسے ہی تفکرات میں گھرا ہوا میں ایک بلند زنگ خوردہ پھاٹک کے سامنے پہنچا۔ آہنی سلاخوں کے درمیان مجھے ایک راستہ دکھائی دیا پاپلر کے درختوں میں گھرا ہوا اور کسی نوع کی شہ نشین بھی نظر آئی۔ فوری طور پر دو باتیں سمجھ میں آئیں۔ پہلی ادنیٰ اور دوسری تقریباً ناقابل یقین۔ جو موسیقی مجھے سنائی دے رہی تھی وہ شہ نشین یا چھوٹے خوش نما بنگلے سے بلند ہو رہی تھی۔ جب کہ موسیقی چینی طرز کی تھی۔ شائد اس لیے میں بے دھیانی میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہاں گھنٹی کا بٹن تھا یا میں نے اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے لیے ہاتھ سے دستک دی۔ موسیقی کی

آب وتاب قائم رہی۔

اس اپنائیت بھرے گھر کے پچھواڑے سے ایک لالٹین کی روشنی مجھ تک آتی دکھائی دی۔ لالٹین کی روشنی آر پار ہوتی کرنوں اور کبھی درختوں سے چھن کر آتی روشنی کی صورت میں بکھری ہوئی تھی۔ ایک کاغذی لالٹین جس کی شکل ڈھول جیسی اور رنگ چاند جیسا تھا۔ ایک دراز قد شخص نے اسے اٹھایا ہوا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا کیوں کہ روشنی نے میری آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ اس نے دروازہ کھولا اور میری ہی زبان میں آہستگی سے کہا ''میں جانتا ہوں کہ پارسا ہسی پنگ میری تنہائی دور کرنے آیا ہے۔ آپ بلاشبہ باغ دیکھنے کے خواہاں ہیں۔''

میں نے ہمارے قونصل خانے کے عملے میں سے ایک رکن کا نام پہچان لیا تھا۔ لیکن میں نے بے پروائی سے جواب دیا ''باغ؟''

''شاخ دار راستوں والا باغ''۔

میری یادداشت میں کچھ ہلچل سی ہوئی اور میں نے ناقابل فہم یقین سے کہا ''میرے جدامجد تسوئی پن کا باغ''۔

''آپ کے جدامجد؟ آپ کے نامی گرامی آباؤاجداد؟ مہربانی فرما کر آپ اندر تشریف لائیے''۔

اوس سے بوجھل راستہ میرے بچپن کے راستوں کی طرح الجھا ہوا تھا۔ ہم مشرقی اور مغربی علوم کی کتابوں سے بھرے ایک کتب خانہ میں پہنچے۔ میں پہچان گیا زرد ریشمی جلد میں بندھے گم گشتہ انسائیکلوپیڈیا کے قلمی نسخوں کو، جنھیں لومینس شاہی خاندان کے تیسرے شہنشاہ نے مرتب کیا تھا لیکن جس کے چھپنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ کانسی کے بنے ہوئے فونیقس کے برابر فونوگرام پر ریکارڈ گھوم رہا تھا۔ مجھے فیملیر وز کا چینی گل دان یاد ہے اور ایک اور ظروف بہت صدیاں پرانا، نیلے رنگ سے بنا جسے ہمارے کاری گروں نے قدیم ایرانی ظروف سے نقل کیا تھا۔

اسٹیفن البرٹ نے مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا اس کا قد

دراز،نقوش تیکھے،آنکھیں بھوری اور داڑھی بھورے رنگ کی تھی۔اس کے چہرے پر راہبوں جیسا تاثر تھا جس میں ملاحوں جیسی کیفیت موجود تھی۔ بعدازاں وہ بولا چینی ثقافت اور زبان کا طالب علم بننے سے بہت پہلے وہ ٹینٹسن میں ایک مبلغ تھا۔

ہم بیٹھ گئے۔ میں ایک پست قد کشادہ دیوان پر اور وہ کھڑکی اور ایک لمبے دیواری گھڑیال کی طرف پُشت کیے ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرا متلاشی رچرڈ میڈن مجھ تک ایک گھنٹے سے پہلے تو نہیں پہنچ سکتا۔میرا ناقابل تنسیخ ارادہ اس کا انتظار کرسکتا تھا۔

''کیسی حیرت انگیز زندگی تھی تسوئی پن کی''۔سٹیفن البرٹ نے کہا''اپنے آبائی قصبے کا گورنر،علم ہیئت اور علم نجوم کا ماہر،اور مذہبی کتابوں کی شرح وبسط میں باکمال،شطرنج کا کھلاڑی، معروف شاعر اور خطاط۔اس نے یہ سب کچھ تیاگ دیا ایک کتاب اور بھول بھلیاں تخلیق کرنے کے لیے۔اس نے آمریت کے جبر،عدل،معروف ازدواجی آسائش،شاہی ضیافتوں اور حتٰی کہ اپنے تبحّر علمی کے تلذذ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔تاکہ خود کو ُروشن خلوت کے خیمے میں' تیرہ سال تک مقید رکھے۔جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے لواحقین کو بے ترتیب مسودوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس کا خاندان جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے،ان مسودوں کو آگ میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اس کے وصی نے،جو تاؤمت یا بدھ مت کا راہب تھا،ان کی اشاعت پر اصرار کیا۔''

''اس دن سے ہم تسوئی پن کی اولاد'' میں نے جواب دیا۔''اس راہب پر لعن طعن کرتی ہیں۔ان مسودوں کی اشاعت بے معنی تھی۔وہ کتاب باہم متضاد مسودوں کا ایک مبہم ڈھیر تھی۔ایک مرتبہ میں نے بھی اس کا معائنہ کیا تھا۔تیسرے باب میں ہیرو مر جاتا ہے۔چوتھے باب میں وہ پھر سے زندہ ہوجاتا ہے۔جہاں تک تسوئی پن کے دوسرے کارنامے کا تعلق ہے،اس کی بھول بھلیاں ------''

''یہاں تسوئی پن کی بھول بھلیاں ہیں''۔اس نے ایک لمبے سنہری پالش والے ڈیسک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاتھی دانت کی بھول بھلیاں'' میں چلایا ''ایک بہت مختصر بھول بھلیاں''۔

''استعاروں کی بھول بھلیاں'' اس نے اصلاح کی۔ ''وقت کی غیر مرئی بھول بھلیاں۔ مجھ جیسے ایک بربریت پسند انگریز کو اس شفاف راز کے انکشاف کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ قریب سو سے زائد برسوں کے بعد تفصیلات ناممکن الحصول ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ قیاس لگانا مشکل نہیں ہے کہ کیا ہوا تھا؟ تسوئی پن نے ضرور ایک بار ایسا کہا ہو گا کہ ''میں ایک کتاب لکھنے کے لیے سب کچھ چھوڑ رہا ہوں''۔ ایک دوسرے موقع پر کہا ہو گا ''میں ایک بھول بھلیاں تعمیر کرنے کے لیے تیاگ لے رہا ہوں''۔ ہر کسی نے دو مختلف منصوبوں کو قیاس کیا۔ کسی کو یہ خیال نہ سوجھا کہ کتاب اور بھول بھلیاں ایک ہی اور ایک جیسی شے تھیں۔

روشن خلوت کی شہ نشین باغ کے وسط میں ایستادہ ہے جسے غالباً انتہائی پیچیدہ صورت میں متشکل کیا گیا۔ اس صورت حال سے واقعی ایک طبعی مادی بھول بھلیوں ہی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ تسوئی پن مر گیا۔ اس کے زیر تحت وسیع و عریض علاقے میں سے کوئی ایک بھی اس بھول بھلیوں تک نہ پہنچ سکا۔ ناول کی پیچیدگی، میرا اشارہ بلاشبہ الجھاؤ کی طرف ہے، سے مجھے خیال آیا کہ وہ بھول بھلیاں یہی تھیں۔ دو مختلف صورت احوال مجھے اس مسئلہ کے درست حل تک لے گئیں۔ ایک تو یہ عجیب اسطور کہ تسوئی ایسی بھول بھلیاں تخلیق کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جو قطعاً لامحدود ہوں۔ دوسری صورت ایک خط کا اقتباس تھی جسے میں نے دریافت کیا۔''

البرٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ دیر تک وہ پشت میری جانب پھیر کر کھڑا رہا۔ پھر سیاہ اور سنہری میز کی دراز کھولی۔ وہ ہاتھوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا لیے میری جانب مڑا جو کبھی ارغوانی رنگ کا رہا ہو گا لیکن اب گلابی اور مہین تھا اور مستطیل شکل کا تھا۔ اس پر تسوئی پن نے کچھ لکھا تھا۔ بے تابی سے مگر بے سمجھی کے ساتھ میں نے وہ الفاظ پڑھے جنھیں میرے ہی سلسلہ نسب کے ایک فرد نے قلم کی محتاط ضربوں سے لکھا تھا۔ ''میں متعدد مستقبلوں کے لیے (سب کے لیے نہیں) اپنا شاخ دار راستوں والا باغ چھوڑے جا رہا ہوں۔'' میں نے خاموشی سے وہ صفحہ اسے لوٹا دیا۔ البرٹ نے اپنا بیان

جاری رکھا۔

''اس خط کو کھوج نکالنے سے پہلے تک میں یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ کیسے ایک کتاب لامحدود ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یہ حلقہ دار، دائروی، کتاب ہوگی۔ ایک کتاب جس کا آخری صفحہ پہلے صفحے جیسا ہی ہوگا، تاکہ انسان غیر یقینی انداز میں آگے بڑھتا چلا جائے۔ مجھے الف لیلہ ولیلہ کی وہ رات بھی یاد آئی، جب ملکہ شہرزاد (جو نقل کنندہ کی کسی جادوئی سہو کے ذریعے) لفظ بہ لفظ ایک ہزار اور ایک راتوں کی کہانی بیان کرنے لگتی ہے، اس خدشے کے ساتھ کہ وہ پھر سے اسی رات کو نہ پلٹ جائے گی جس سے اس نے سنانا شروع کیا تھا اور یہ سب کچھ ہمیشہ یونہی چلتا رہے۔

میں نے ایک موروثی مسودے کا بھی تصور کیا جو باپ سے بیٹے کو منتقل ہوا ہو، اور جس میں ہر اگلا شخص ایک باب کا اضافہ کردے یا پُرخلوص عقیدت کے ساتھ اپنے بزرگوں کے صفحات کی اصلاح کرے۔ ان قیاس آرائیوں نے مجھے محظوظ کیا اور میری توجہ کو بٹایا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کا بھی مجھے تسوئی پن کے متناقض ابواب سے دور سے بھی واسطہ معلوم نہ ہوا۔ انھی پیچیدگیوں کی ناخوش گوار کیفیت میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے اوکسفرڈ سے یہ مسودہ موصول ہوا جسے ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ جیسا کہ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس فقرے پر میں ٹھٹھکا ''میں متعدد مستقبلوں کے لیے (سب کے لیے نہیں) اپنا شاخ دار راستوں والا باغ چھوڑے جا رہا ہوں۔''

تقریباً فوراً ہی میں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ''شاخ دار رستوں والا باغ''، یہی بے ترتیب ناول تھا۔ اس فقرے نے کہ ''متعدد مستقبلوں کے لیے (سب کے لیے نہیں)'' مجھ پر آشکار کیا کہ یہ شاخ داری وقت میں ہے، خلا میں نہیں۔ مسودے کے بغور مطالعہ نے مجھ پر اس نظریہ کو حتمی طور پر واضح کیا۔ تمام ادبی مسودوں میں انسان کو ہر بار ایک سے زائد متبادلات کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک کا انتخاب کرتا اور باقیوں کو رد کر دیتا ہے۔ حقیقتاً سلجھائے نہ جا سکنے والے تسوئی پن کے ادب میں کردار بیک وقت سبھی متبادلات کا انتخاب کرتا ہے۔

اس طور پر وہ گونا گوں مستقبل اور گونا گوں زمان تخلیق کرتا ہے جو بجائے خود تیزی سے نمو پاتے اور شاخ دار ہو جاتے ہیں۔ یہی ناول کے تناقضات کی وضاحت بھی ہے۔ مثلاً میں کہتا ہوں کہ فانگ کے پاس ایک راز ہے، ایک اجنبی اس کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ فانگ اسے قتل کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ قدرتی طور پر اس کے متعدد نتائج ہو سکتے ہیں۔ فانگ اس دخل انداز کو قتل کر سکتا ہے۔ دخل در انداز، فانگ کو قتل کر سکتا ہے۔ دونوں بچ سکتے ہیں۔ دونوں ہی مر سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

تسوئی پن کے ناول میں تمام ممکنہ صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر صورت مزید تقسیم کا نقطۂ آغاز بنتی ہے۔ کبھی بھول بھلیوں کے راستے متصل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ اس گھر تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ممکنہ ماضیوں میں سے کسی ایک ماضی میں ہو سکتا ہے آپ میرے دشمن ہوں۔ کسی دوسرے ماضی میں آپ دوست ہوں گے۔ اگر آپ میرے نا قابل اصلاح تلفظ کو گوارہ کر سکیں تو میں آپ کو چند صفحے پڑھ کر سناؤں۔"

لیمپ کی روشنی کے چمکیلے دائرے میں اس کا چہرہ بلاشبہ ایک بوڑھے کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا، کچھ پرعزم، اور حتیٰ کہ کچھ غیر فانی تاثر لیے ہوئے۔ اس نے آہستہ روی درستگی کے ساتھ ایک ہی رزمیہ باب کے دو روپ پڑھے۔ پہلے روپ میں ایک فوج ایک پہاڑی ویرانے سے ہو کر جنگ کے لیے روانہ ہوتی ہے۔ چٹانوں اور تاریکی کی دہشت جوانوں میں زندگی کے لیے نفرت کو مہمیز کرتی ہے اور وہ ایک آسان فتح کی طرف بڑھتے ہیں۔ دوسرے روپ میں وہی فوج ایک محل میں سے گزرتی ہے جہاں ایک میلہ برپا ہے۔ تاباں جنگ انہیں اسی جشن کا ایک تسلسل معلوم ہوتی ہے اور وہ آسانی سے فتح حاصل کر لیتے ہیں۔

میں نے ان قدیم کہانیوں کو گہری تعظیم کے ساتھ سنا جو اتنی غیر معمولی نہیں تھیں جتنی یہ حقیقت کہ میرے سلسلہ نسب ہی کے ایک آدمی نے اسے تخلیق کیا اور اسے دور دراز ملک کے ایک فرد کی مایوس کن مہم کے دوران مجھ پر آشکار کیا۔ مجھے اختتامی الفاظ یاد ہیں جنہیں ہر روپ میں ایک

خفیہ حکم کے طور پر دہرایا گیا ''یوں سور ما لڑے، ان کے دل پر سکون تھے، ان کی تلواریں متشدد، وہ مارنے اور مر جانے پر آمادہ تھے۔''

اس لمحہ سے میں نے اپنے آپ میں اور اپنے مبہم بدن میں ایک غیر مرئی، غیر معلوم افزائش کی موجودگی محسوس کی، کسی منتشر، متوازی اور بعد ازاں مربوط ہو جانے والی فوجوں کی نہیں بلکہ ایسی افزائش کی موجودگی جسے فوجوں نے پہلے سے تصور کر لیا تھا۔ سٹیفن البرٹ نے بات جاری رکھی:

''مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ کے عالی مرتبت جد امجد فضول ہی ان تغیرات سے الجھتے رہے۔ مجھے یہ بات اغلب معلوم نہیں ہوتی کہ انھوں نے ایک خطیبانہ ریاضت کی لامحدود کارکردگی کے لیے اپنے تیس برسوں کی قربانی دی۔ آپ کے ملک میں ناول ادب کی ایک ضمنی صنف ہے۔ تسوئی پن کے وقتوں میں یہ ایک سفلی صنف تھی۔ تسوئی پن ایک فطین ناول نگار تھا لیکن وہ اعلیٰ علمی مرتبے کا حامل تھا اور اس نے بلاشبہ خود کو محض ایک ناول نگار نہیں سمجھا۔

اس کے معاصرین نے اس کے مابعدالطبیعیاتی، پراسرار رجحانات کی توثیق کی جب کہ اس کی زندگی ان رجحانات کی تائید تھی۔ فلسفیانہ مناقشہ ناول کے ایک عمدہ حصے کو اپنی اوٹ میں کر لیتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان مسائل میں سے کسی ایک نے بھی اسے اتنا پریشان نہ کیا ہوگا اور نہ اتنا الجھایا ہوگا جتنا وقت کے عمیق مسئلہ نے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ یہ مسئلہ ہی ایسا تھا جس کا اس کے باغ کے صفحات میں ذکر نہیں ہوا۔ اس نے کبھی یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ آپ اس ارادی فروگذاشت کی کیا وضاحت پیش کریں گے؟''

میں نے چند ایک حل تجویز کیے۔ سبھی غیر تسلی بخش۔ ہم نے ان پر بحث کی۔ آخر کار سٹیفن البرٹ نے کہا، ''ایک پہیلی میں، جس کا جواب 'شطرنج' ہے، وہ کونسا واحد ممنوعہ لفظ ہوگا جو استعمال نہیں ہوا ہوگا۔''

میں نے لمحہ بھر کے لیے تفکر کیا اور جواب دیا ''شطرنج''

''بالکل درست'' البرٹ نے کہا، ''شاخدار راستوں والا باغ ایک بہت بڑی پہیلی یا معما ہے

جس کا موضوع وقت ہے۔ یہی خفیہ مقصد اسے یہ نام دینے میں مانع ہوا۔ ایک لفظ کو ہمیشہ بھول جانا، نامناسب استعاروں اور واضح ہیر پھیر سے رجوع کرنا، اس لفظ کی طرف توجہ دلانے کا شاید سب سے تاکیدی انداز ہے۔ بہرطور یہی وہ دشوار گزار راستہ ہے جسے کج ادا تسوئی پن نے اپنے انتھک ناول کے ہر پھیر میں ترجیحاً برتا۔ میں سینکڑوں مسودوں کا باہم موازنہ کر چکا ہوں۔ میں ان اغلاط کی تصیح کر چکا ہوں جو نقل کنندوں کی غفلت سے واقع ہوئیں۔ میں نے اس انتشار کے منصوبے کے لیے ایک مفروضہ وضع کیا۔ میں نے اس کی بنیادی ترتیب کی تشکیل نو کی یا مجھے یقین ہے کہ میں نے ایسا از سرنو کیا۔ میں نے تمام مسودے کا ترجمہ کیا اور میں جانتا ہوں کہ ایک بار بھی یہ لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ اس کی وضاحت سہل ہے۔

شاخدار راستوں والا باغ کائنات کی، جیسا کہ تسوئی پن نے تصور کیا، ایک نامکمل شبیہ ہے مگر نادرست نہیں۔ نیوٹن اور شوپن ہار کے برعکس آپ کے جدّ ایک یکساں اور مطلق وقت پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ وہ وقتوں کے ایک لامحدود سلسلہ پر یقین رکھتے تھے، وقتوں کا ایک منتشر، مرتکز اور متوازی طور پر پھیلتا اور چکر کھاتا ہوا جال۔ وقتوں کی یہ ساخت جس میں وقت ایک دوسرے سے رجوع کرتے، ایک دوسرے سے الجھتے ہیں، ایک دوسرے کاٹتے یا جیسا کہ صدیوں سے اس بارے میں کسی کو علم نہ ہو سکا کہ وہ سبھی ممکنات کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر وقتوں میں ہم موجود نہیں ہوتے۔ کسی وقت میں تم موجود ہوتے ہو لیکن میں موجود نہیں ہوتا۔ دوسرے وقتوں میں، میں موجود ہوتا ہوں لیکن تم نہیں۔ جب کہ مختلف وقتوں میں ہم دونوں ہی موجود ہوتے ہیں۔

اس خاص وقت میں اتفاق کے موافق ہاتھ نے مجھے شرف یاب کیا کہ آپ میرے گھر تشریف لائے۔ کسی دوسرے وقت میں ہو سکتا ہے اس باغ میں سے گزرتے ہوئے آپ مجھے مردہ پائیں۔ یونہی ایک دوسرے وقت میں، میں یہی الفاظ کہتا ہوں لیکن میں ایک سہو ہو سکتا ہوں، ایک بھوت۔

''ہر وقت میں'' میں نے آواز میں معمولی لغزش پیدا کیے بغیر کہا،''میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اور تسوئی پن کے باغ کی تخلیق نو پر آپ کی قدر کرتا ہوں۔''

''سب وقتوں میں نہیں'' وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑایا ''وقت مسلسل لاتعداد مستقبلوں میں شاخ در شاخ تقسیم ہو جاتا ہے۔ انہی میں سے ایک وقت میں میں آپ کا دشمن ہوں''۔

ایک بار پھر سے مجھے ہجوم کی سی کیفیت کا احساس ہوا جس کا مجھے پہلے تجربہ ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوا کہ یہ مرطوب باغ جس نے گھر کو گھیرا ہوا تھا، غیر محدود طور پر غیر مرئی لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ لوگ 'البرٹ اور میں' تھے، جو وقت کی مختلف سمتوں میں خفیہ، مصروف کار اور کثیر الاشکال تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور یہ ڈراؤنا خواب تحلیل ہو گیا۔ زرد اور سیاہ باغ میں صرف ایک آدمی تھا۔ لیکن وہ ایک بت کی طرح مضبوط تھا۔ وہ راستے پر چلتا ہوا قریب آ رہا تھا اور وہ کیپٹن رچرڈ میڈن تھا۔

''مستقبل تو پہلے سے موجود ہے'' میں جواب دیا۔''لیکن میں آپ کا دوست ہوں، کیا میں وہ خط دوبارہ دیکھ سکتا ہوں''۔

البرٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ سیدھا کھڑے کھڑے اس نے لکھنے کی میز کی دراز کھولی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے اس پر ریوالور تان لیا۔ انتہائی احتیاط کے ساتھ گولی چلائی۔ کوئی حرف شکایت بلند کیے بغیر البرٹ نیچے گر گیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کی موت محض لمحہ بھر میں ہوئی۔ ایک ہلکی جنبش کی طرح۔

باقی سب کچھ غیر حقیقی، غیر اہم ہے۔ میڈن اندر گھس آیا اور اس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ مجھے پھانسی کا سزاوار قرار دیا گیا۔ میں انتہائی ناگوار انداز میں جیت گیا تھا۔ میں نے برلن تک اس شہر کے خفیہ نام کی ترسیل کر دی جس پر انہیں حملہ کرنا چاہیے تھا۔ کل ہی انہوں نے اس پر بمباری کی۔ میں نے یہ خبر انہی اخباروں میں پڑھی جو انگلستان بھر میں ایک اجنبی یوتسون کے ہاتھوں چینی زبان

وثقافت کے معروف عالم البرٹ سٹیفن کے قتل کے معمے کو زیر بحث لائے تھے۔ چیف نے یہ معمہ حل کرلیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میرا مسئلہ (جنگ کے کان پھاڑ دینے والے شوروغوغا میں) البرٹ نامی ایک شہر کی نشاندہی کرنا تھا اور یہ کہ میرے پاس ایسا کرنے کے لیے اسی نام کے ایک شخص کو قتل کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا (نہ کوئی جان سکتا ہے) میری بے حساب ندامت اور تھکاوٹ کو۔

# مڈ بھیڑ

جو لوگ روزانہ صبح اخبار پڑھتے ہیں، وہ ایسا اسے پھر سے بھلا دینے کے لیے کرتے ہیں یا پھر اس لیے کہ شام کی گفتگو میں اس کا حوالہ دے سکیں اور اسی لیے کسی کو یہ بات تعجب آمیز نہیں لگتی کہ میںنکو یو رائز تے اور ایک شخص ڈنکن کے کبھی بہت مشہور ہونے اور زیر بحث آنے والے واقعہ کو یا تو لوگ مزید یاد نہیں رکھ پائے یا پھر یہ یوں انھیں یاد رہا جیسے کوئی خواب۔

بلا شبہ یہ واقعہ 1910 میں ہوا تھا، دم دار ستارے اور صد سالہ تقریبات کے سال میں، اور تب سے اب تک ہم کتنی ہی چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ واقعہ کے اہم کردار جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے اور انھوں نے مکمل خاموش رہنے کی قسم کھائی تھی، مر چکے ہیں۔ میں نے بھی قسم کھانے کے لیے اپنا ہاتھ بلند کیا تھا اور نو یا دس برسوں کی تمام تر رومانوی سنجیدگی کے ساتھ اس رسم کی سنگینی کو محسوس کیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دوسروں نے بھی اس بات کو یاد رکھا تھا کہ میں نے اپنا وعدہ ایفا کیا تھا۔ نہ ہی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہے تھے۔ بہرکیف جو کچھ بھی ہے، کہانی حاضر ہے، ناگزیر تبدیلیوں کے ساتھ جو وقت، اور اچھا (یا برا) ادب پیدا کر دیتا ہے۔

اس شام میرا عم زاد لیفینز مجھے ایک تقریب میں لے گیا جہاں دیہاتی علاقے لاس لارلز میں لوگوں کا ایک بڑا ہجوم چربی لگے بچھڑے (یا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا میمنے) کے بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ موجود تھا۔ میں اس منظرنامے کو بیان نہیں کر سکتا۔ صوبے کے شمال میں ایک پرامن اور سایہ دار قصبے کا تصور ذہن میں لائیے جو ایک ہموار، پھیلتے ہوئے شہر کے بجائے دریا کی

طرف نرمی سے ڈھلوانی صورت میں جھکا ہوا تھا۔ ریل کا سفر اتنا طویل تھا کہ مجھے اس سے بوریت محسوس ہونے لگی لیکن جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ بچپن میں وقت آہستہ آہستہ گزرتا ہے۔

شام اترنا شروع ہو چکی تھی جب ہم اس بڑے دیہاتی گھر کے پھاٹک پر پہنچے۔ وہاں مجھے قدیم بنیادی عناصر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ گوشت کی مہک جو سیخ پر اس کے سنہری ہونے کے بعد اٹھتی ہے، درخت، کتے، خشک ٹہنیاں، آگ جو لوگوں کو اکٹھا کرتی ہے۔ وہاں ایک درجن سے زیادہ مہمان نہیں تھے سبھی بالغ مرد۔ (یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ان میں عمر رسیدہ ترین تیس سال سے زیادہ نہیں تھا۔) مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ سبھی گہری نظر رکھتے تھے ایسے شعبوں میں جن کی آج بھی مجھے کچھ شد بد نہیں ہے۔ جیسے گھڑ دوڑ کے گھوڑے، سلائی کڑھائی، آٹو موبائلز، اور بدنام زمانہ مہنگی خواتین۔ کسی نے میرے شرمیلے پن میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کی، کسی نے میری طرف توجہ نہیں کی۔ میمنے کے گوشت کی وجہ سے، جسے کم تر مہارت کے ساتھ وہاں کام کرنے والے چوکیداروں میں سے ایک نے تیار کیا تھا، ہم دیر تک کھانے کے کمرے میں اکٹھے رہے۔ شرابوں کی تاریخوں پر بات ہوتی رہی۔ وہاں ایک گٹار بھی موجود تھا جس پر مجھے یاد ہے کہ میرے ایک عم زاد نے ایلیاس ریگولیز کے گیت 'La tapera' اور 'El gaucho' اور لنفارڈو بولی میں چند گیت گائے جو تب بہت معروف تھے۔ گیت جو کالی جونین کے گھروں میں سے کسی ایک میں چاقوؤں سے ہونے والے ایک دنگے کے بیان پر مبنی تھے۔ اس کے بعد کافی اور سگار پیش کیے گئے۔ لیکن واپس گھر جانے سے متعلق کوئی لفظ کسی نے نہیں کہا۔

جیسا کہ لیوگونز نے بھی ایک بار کہا تھا، مجھے "گھر پہنچنے میں دیر ہو جانے کا خوف" لاحق ہوا۔ میں گھڑی کی طرف دیکھنے کی جرات نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنی تنہائی کے احساس کو چھپانے کے لیے کہ میں خود کو مردوں کے درمیان ایک لڑکا محسوس کرنے لگا تھا، میں وائن کے ایک دو جام چڑھا گیا کسی خاص مزے کے بغیر۔

اچانک ہی یوریئرٹ نے بلند آواز میں ڈنکن کو پوکر کھیلنے کے لیے للکارا، یعنی صرف

وہی دونوں، آمنے سامنے۔ کسی نے اعتراض کیا کہ دو کھلاڑیوں کا کھیل تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ اس نے چار کھلاڑیوں کی تجویز دی۔ ڈنکن اس تجویز کے حق میں تھا۔ لیکن یوریئرٹ نے بدتمیزی کے ساتھ جسے میں نہیں سمجھ سکا، (اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کی) اصرار کیا کہ صرف وہی دونوں یہ کھیل کھیلیں گے۔ ٹروکو (جس کا بنیادی مقصد وقت کو گیتوں اور نیک دلی سے کیے گئے مکارانہ حربوں سے پُر کرنا ہوتا ہے) اور سولیٹیئر کی معتدل بھول بھلیوں کے علاوہ میں نے کبھی تاش کے کھیل میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ کسی کی نظر میں آئے بغیر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

ایک بڑا گھر جیسا میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے تاریکی میں ڈوبے کشادہ کمرے (جب کہ صرف کھانے کے کمرے ہی میں روشنی تھی) ایک لڑکے کے لیے اس سے کہیں زیادہ تعجب زا تھے جیسے کسی سیاح کے لیے ایک غیر دریافت شدہ ملک ہو سکتا ہے۔ بتدریج میں نے گھر کو دریافت کیا۔ مجھے یاد ہے ایک بلیئرڈ روم، ایک محافظت خانہ شیشے کے مستطیل اور چہار پہلوی پٹوں والا، جھولنے والی کرسیوں کا ایک جوڑا، اور ایک کھڑکی جس میں سے ایک جھروکا دکھائی دیتا تھا۔ اس مدھم روشنی میں میں گم ہو گیا۔ مالک مکان نے، جس کا نام ان تمام برسوں کے بعد اتنا یاد ہے کہ ایکی ویڈو یا ایکی بل تھا، مجھے تلاش کر لیا۔ بڑی شفقت سے یا جمع کرنے والے کے افتخار کے ساتھ وہ مجھے ایک طرح کے نوادرات کی الماری تک لے گیا۔

اس نے کمرے میں روشنی کی، تو میں نے دیکھا کہ یہ الماری ہر طرح کی شکل اور نوع کے چاقوؤں سے بھری ہوئی تھی۔ چاقو جوان کو استعمال کیے جانے کے وقوعات کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ پرگیمینو کے نزدیک اس کی چھوٹی سی زمین ہے اور یہ کہ اس نے یہ نوادرات برسوں صوبے بھر میں سفر کر کے یہاں وہاں سے اکٹھے کیے تھے۔ اس نے وہ الماری کھولی اور چاقوؤں کے ساتھ لگے چھوٹے معلوماتی کارڈوں کو دیکھے بغیر ان کی تاریخ بیان کرنی شروع کی جو تاریخ اور جگہ کے فرق سے تقریباً ایک جیسی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ان چاقوؤں میں ایسا چاقو بھی تھا جو موریرا کی ملکیت رہا

(وہ جنوبی امریکہ کے کاؤبوائے کا ایک مثالی نمونہ تھا جیسے بعد میں مارٹن فیرو اور ڈان سیگنڈ وسومبرا ہوئے۔) اس نے اعتراف کیا کہ وہ چاقو اس کے پاس نہیں تھا۔لیکن بولا کہ ایسا ہی ایک چاقو، U کی شکل کی صلیب کے حفاظتی دستے والا وہ مجھے دکھا سکتا تھا۔تبھی غصے میں چیختی آوازیں سنائی دیں۔فوراً ہی اس نے الماری بند کردی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

یوریئرٹ چلاّ رہا تھا کہ ڈنکن مکاری کر رہا تھا۔باقی سبھی ان کے اردگرد کھڑے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ڈنکن باقیوں سے قد میں لمبا تھا۔وہ مضبوط جسم کا مالک تھا،ایک بے حس چہرے والا انسان جس کے کندھے بھاری تھے اور بال اتنے سنہری تھے کہ بالکل سفید معلوم ہوتے تھے۔مانیکو یوریئرٹ اعصابی طور پر مضطرب تاثرات اور تیز حرکت کرنے والا انسان تھا۔اس کا رنگ گہرا تھا، اور نقوش ایسے تھے جن میں غالباً انڈین نقوش کا پرتو دکھائی دیتا تھا۔اس کی چھدری بدہیئت مونچھیں تھیں۔واضح طور پر وہ نشے میں تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ فرش پر بکھری ہوئی بوتلیں دو تھیں یا تین یا پھر حرکی تصویری کیمرہ کار کی گمراہ کن تصویروں نے میری یادداشت کو یوں آلودہ کیا تھا۔ یوریئرٹ کی تیز (اور اب ناشائستہ) گالیاں رکنے میں نہیں آتی تھیں۔ڈنکن لگتا تھا کہ انھیں سن ہی نہیں رہا تھا۔آخر کار وہ کھڑا ہوا، جیسے تھک چکا ہو اور یوریئرٹ کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔یوریئرٹ فرش سے چیخا جہاں وہ پھیلا ہوا گرا تھا کہ وہ ایسی گستاخی برداشت نہیں کرسکتا۔اس نے ڈنکن کو لڑائی کی چنوتی دی۔

ڈنکن نے اپنے سر اثبات میں ہلایا۔

''سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے خوف زدہ ہوں۔'' اس نے وضاحت کرنے انداز میں مزید کہا۔

اس کے جواب میں قہقہوں کی بوچھاڑ ہوئی۔

''تم مجھ سے لڑو گے۔ اور اسی وقت'' یوریئرٹ نے پھر سے اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

کسی نے کہا خدا اسے معاف فرمائے، اور یہ کہ وہاں ہتھیاروں کی کمی نہیں تھی۔

مجھے صاف یاد نہیں ہے کہ شیشے کی نمائشی الماری کس نے کھولی۔ مانیکو یوریئرٹ نے سب سے لمبا اور نمایاں دکھائی دینے والا چاقو منتخب کیا، جس کا U کی صورت کی صلیب والا حفاظتی دستہ تھا۔ ڈنکن نے ایسے ہی جیسے ان میں سے کوئی کسی دوسرے کی معاونت کرے، لکڑی کے دستے والا چاقو منتخب کیا جس کی دھار پر چھوٹے سے درخت کا نقش کھدا تھا۔ کسی نے کہا کہ یہ ایسی بات تھی کہ خنجر کے مقابلے میں مانیکو نے تلوار کا انتخاب کیا۔

کسی کو یہ دیکھ کر حیرت نہ ہوئی کہ اس موقع پر مانیکو کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ یہ بات البتہ بھی کو ورطہ حیرت میں ڈال گئی کہ کپکپاہٹ ڈنکن کے ہاتھ میں بھی تھی۔ روایت کا تقاضہ تھا کہ جب مرد ایک ڈوئیل لڑتے ہیں، تو وہ اس گھر کو تہہ و بالا نہیں کرتے جس میں وہ ہوتے ہیں بلکہ مقابلے کے لیے باہر کھلی جگہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ کچھ مزہ لیتے ہوئے اور کچھ سنجیدگی کے ساتھ ہم بھیگی ہوئی رات میں باہر آ گئے۔ میں شراب کے نشے میں مسرور نہیں تھا لیکن مہم جوئی کے نشے نے میرے حواس پر غلبہ پا لیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ کوئی قتل ہو جائے تاکہ میں اس واقعہ کو بعد میں کہیں یاد کروں اور بیان کر سکوں۔ شاید تب دوسرے بھی اس سے زیادہ بالغ نہیں تھے، جتنا میں تھا۔

مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ ایک گرداب ہے جس کے خلاف ہم مدافعت نہیں کر پا رہے تھے، وہ ہمیں اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور ہم اس میں کھو جائیں گے۔ کسی نے حقیقتاً مانیکو کی الزام تراشی کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ سب کا خیال تھا کہ یہ کسی پرانی مخاصمت کا شاخسانہ تھا جو آج شراب کی وجہ سے بھڑک اٹھی تھی۔ ہم جنگل میں چلتے رہے جو اس جھروکے سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ یوریئرٹ اور ڈنکن آگے آگے تھے۔ مجھے یہ بات عجیب لگی کہ دونوں ہی ایک دوسرے پر نگاہ رکھے ہوئے تھے، اس خوف سے کہ کہیں دوسرا اچانک حملہ نہ کر دے۔ ہم ایک گھاس دار قطعہ میں داخل ہوئے۔

''یہ جگہ مناسب رہے گی۔'' ڈنکن نے دھیمی تحکمانہ آواز میں کہا۔

دونوں نوجوان وسطی جگہ میں غیر فیصلہ کن انداز میں کھڑے ہوگئے۔

''یہ ہتھیار پھینک دو۔ یہ تو بس ایسے ہی ہاتھ میں آگئے۔ اصل میں تو ایک دوسرے کو پچھاڑو۔'' کسی نے چلا کر کہا۔ لیکن تب تک لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ پہلے تو وہ بے ڈھنگے طریقے سے لڑے جیسے وہ زخمی ہونے سے ڈر رہے ہوں۔ شروع میں وہ مخالف کے چاقو کی دھار پر نظر جمائے ہوئے تھے لیکن پھر انھوں نے نگاہیں ایک دوسرے کی نگاہوں میں پیوست کردیں۔ یوریئرٹ اپنے غصے کو بھول چکا تھا۔ ڈنکن کو اپنی نفرت یا لاتعلقی مزید یاد نہیں رہی تھی۔ خطرے نے ان کی کایا کلپ کردی تھی۔ اب وہ دو مرد تھے، دو لڑکے نہیں تھے جو ایک دوسرے سے دست وگریباں تھے۔ میں نے چاقو کی لڑائی کو لوہے کے انتشار کی صورت میں تصور کیا لیکن میں اسے دیکھتے رہنے کے قابل تھا یا اسے تقریباً شطرنج کے ایک کھیل کے طور پر ملاحظہ کرتا رہا۔ وقت نے نہ ہی اس واقعے کو، جس کا میں نے مشاہدہ کیا، ماند کیا، نہ اسے چمک عطا کی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب کچھ کتنی دیر جاری رہا۔ ایسے واقعات ہوتے ہیں جنھیں وقت کے عمومی اہتمام کے تحت نہیں سمجھا جاسکتا۔

چوں کہ ان کی کلائیاں (جو حفاظتی پٹیوں کے بغیر تھیں) وار کو روکنے کے لیے استعمال ہو رہی تھی، ان کی آستینیں تھوڑی ہی دیر میں لیر لیر ہوگئیں، اور ان کے خون سے زیادہ سے زیادہ لتھڑتی گئیں۔ مجھے خیال آیا کہ ہمارا یہ فرض کرنا غلط تھا کہ وہ چاقو کے استعمال سے نابلد تھے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ دونوں حریف مختلف انداز میں اپنے ہتھیار استعمال کر رہے تھے۔ ہتھیاروں کا بھی آپس میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ اس کمی کے ازالے کے لیے ڈنکن اپنے حریف کے قریب رہنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ یوریئرٹ پرے پرے ہٹ رہا تھا تاکہ ہاتھ لمبا کرکے زیریں حصے پر وار کرسکے۔

''یہ دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔ انھیں روکو۔'' اسی لڑکے آواز ابھری جس نے پہلے چاقوؤں کی الماری کی خبر دی تھی۔

کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ بیچ بچاؤ کے لیے آگے بڑھتا۔ یوریئرٹ کے پیر اکھڑ چکے تھے۔ ڈنکن نے اس پر حملہ کیا۔ ان کے جسم ایک دوسرے سے تقریباً چھو رہے تھے۔ تبھی یوریئرٹ کا چاقو ڈنکن کے چہرے تک پہنچا۔ فوراً ہی وہ مختصر دکھائی دیا۔ وہ اس کی چھاتی میں اتر چکا تھا۔ ڈنکن گھاس پر گر گیا۔ تبھی وہ بولا، جب کہ اس کی آواز بمشکل سنائی دیتی تھی۔

''کتنی عجیب بات ہے۔ ایک خواب لگتا ہے۔''

اس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کیں۔ نہ وہ اپنی جگہ سے ہلا۔ میں نے دیکھا کہ ایک انسان نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ مانیکو یوریئرٹ اس کی نعش پر جھکا اور گڑگڑایا کہ وہ اسے معاف کر دے۔ وہ صاف طور پر سسکیاں لے رہا تھا۔ جو حرکت اس سے سرزد ہو چکی تھی، اس کا اسے احساس ہوا اور وہ خوف زدہ ہو گیا۔ میں تب جان گیا کہ اسے افسوس ایک جرم کرنے سے کہیں زیادہ اس بات کا تھا کہ کیسا احمقانہ فعل اس سے سرزد ہوا تھا۔

میں اس منظر کی مزید تاب نہیں لا سکا۔ جس منظر کو دیکھنے کی مجھے خواہش تھی، وہ رونما ہو چکا تھا، اور میں تباہ حال تھا۔

لیفینر نے بعدازاں مجھے بتایا کہ انھیں لاش میں سے چاقو باہر نکالنے کے لیے پوری قوت لگانی پڑی تھی۔ وہ سب مل بیٹھے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ ممکنہ حد تک کم جھوٹ بولا جائے گا۔ چاقوؤں کی لڑائی کو تلواروں کے مقابلے جیسی بہتر صورت سے بدل دیا گیا۔

مہاگنی کی میز پر تاش کے پتے اور بل منتشر حالت میں پڑے تھے جن کی طرف توجہ دینے یا انھیں چھونے کی بھی کسی نے کوشش نہیں کی۔

بعد کے برسوں میں میں نے ایک سے زائد بار یہ کہانی کسی دوست کو سنانے کا سوچا لیکن مجھے ہمیشہ شک گزرا کہ راز کو اپنے تک محدود رکھنے میں زیادہ لطف ہے جتنا اسے کسی سے بانٹ لینے میں۔ 1929 میں ایک عمومی گفتگو کے نتیجے میں اس خاموشی کے لمبے وقفے کو توڑنے کی مجھے تحریک ہوئی۔

پولیس کے ایک ریٹائرڈ چیف حوزے اولاو چاقوؤں کی لڑائیوں کے بارے میں بتا رہے تھے جو ریٹائرو کے بدنام علاقوں اور آگے ایل باجو کی بحری گودیوں میں ہوئی تھیں۔ پھر وہ بتانے لگا کہ اس قسم کے لوگ کچھ بھی کرنے پر قادر ہوتے ہیں جیسے گھات لگانا، غداری کرنا، فریب بازی اور گھٹیا قسم کی بدمعاشی، تاکہ اپنے حریفوں پر سبقت حاصل کریں۔ اس نے بتایا کہ پوڈیستاس اور گیوٹیریز وغیرہ سے پہلے چاقوؤں کی لڑائی قسم کی کسی شے کا تصور نہیں تھا، بس ہاتھاپائی ہی ہوتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے ایک بار سچ مچ ایسی ہی ایک لڑائی دیکھی تھی۔ پھر اتنے برسوں کے بعد اسے اس رات کی کہانی سنائی۔

اس نے میری روداد پیشہ وارانہ توجہ کے ساتھ سنی اور پھر مجھ سے ایک سوال پوچھا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ یوریئرٹ اور دوسرا لڑکا اس سے پہلے کبھی چاقوؤں سے نہیں لڑے تھے؟ یا یہ کہ اس علاقے میں کسی نے کبھی انھیں اس بارے میں کچھ نہیں سکھایا تھا۔''

''نہیں'' میں نے جواب دیا ''وہاں موجود بھی لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اور کسی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔''

اولاو نے جیسے بآواز بلند سوچتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ''آپ نے کہا کہ ان میں سے ایک چاقو کا U صورت صلیب جیسا حفاظتی دستہ تھا۔ اس قسم کے صرف دو معروف خنجر ہیں۔ ایک تو وہ جسے موریرا نے استعمال کیا، اور دوسرا وہ جو تاپلقین کے قریب حوان المادا کے پاس تھا۔''

تبھی کچھ مجھے یاد آیا۔

''آپ نے ایک لکڑی کے دستے والے چاقو کا بھی ذکر کیا تھا،'' اولاو نے اپنی بات جاری رکھی، ''جس کی دھار پر ننھے درخت کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس طرح کے چاقو ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ یہ اس کمپنی کا نشان ہے جس نے اسے تیار کیا۔ لیکن ان میں ایک چاقو ایسا تھا۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر گویا ہوا، ''ایک شخص ایکی ویڈونا می تھا جس کی پرگیمینو کے قریب زمین تھی۔ تب ایک لڑاکا ہوا کرتا تھا، حوان المانزہ، جس نے کچھ شہرت حاصل کی تھی اور اسی

علاقے میں صدی کے اختتامی برسوں میں اپنا مرکز قائم کیا تھا۔ پہلے شخص کے قتل سے لے کر، جسے ایکی ویڈو نے چودہ برس کی عمر میں کیا تھا، وہ ہمیشہ چھوٹے چاقو استعمال کرتا تھا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ یہ اس کے لیے ہمیشہ خوش قسمت ثابت ہوئے ہیں۔

حوان المانزہ اور حوان المادہ کے درمیان بڑی تناتنی تھی کیوں کہ لوگ انھیں آپس میں گڈ مڈ کر دیتے تھے۔ جیسے ان کے نام ایک سے ہیں۔ ایک طویل عرصہ تک لوگوں کی نظریں ان پر رہیں لیکن ان کے راستے کبھی ایک دوسرے سے الجھے نہیں۔ حوان المادہ کسی انتخابات یا ایسے ہی کسی موقع پر ایک گولی کا شکار ہو گیا۔ جب کہ دوسرا میرے خیال میں بوڑھا ہو کر لاس فلورز میں ایک ہسپتال میں مرا۔"

اس سہ پہر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا گیا۔ ہم دونوں سوچنے لگے۔

نو یا دس لوگ تھے۔ سبھی اب فوت ہو چکے تھے۔ انھوں نے وہی کچھ دیکھا، جو میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔ چھاتی پر لمبا وار اور پھر جسم آسمان کے تلے بچھ گیا۔ لیکن جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ کسی پرانی کہانی کا اختتام تھا۔ مانیکو یوریئرٹ نے ڈنکن کو قتل نہیں کیا تھا۔ یہ ہتھیار تھے نہ کہ انھیں چلانے والے جو لڑ رہے تھے۔ وہ ایک الماری کے ایک خانے میں ایک دوسرے کے پہلو میں خوابیدہ لیٹے ہوئے تھے حتیٰ کہ ان ہاتھوں نے انھیں جگایا۔ شاید بیدار ہونے پر وہ چونکے ہوں گے۔ شاید اسی لیے یوریئرٹ کا ہاتھ کپکپایا تھا اور ڈنکن کا بھی۔

دونوں ہی جانتے تھے کہ کیسے لڑا جاتا ہے یعنی چاقوؤں کو۔ میری مراد وہ لوگ نہیں ہیں۔ اور اس رات وہ بہت عمدگی سے لڑے تھے۔ طویل عرصہ تک انھوں نے صوبے کی لمبی سڑکوں پر ایک دوسرے کو پا لیا تھا اور آخر کار ایک دوسرے کو تلاش کر لیا۔ تب تک ان کے لڑاکے رزق خاک ہو چکے تھے۔ ان چاقوؤں کی دھاروں میں انسانی کینہ خوابیدہ اور باقی رہا۔ اشیا کی عمر انسانوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ پھر کبھی دوبارہ ان کی مڈ بھیڑ نہیں ہوگی۔

# مداخلت کار

وہ کہتے ہیں (اگر چہ یہ غیر ممکن معلوم ہوتا ہے) کہ نیلسن بھائیوں میں سے چھوٹے بھائی ایڈیورڈو، نے اٹھارہ سونوے کے لگ بھگ کسی وقت یہ کہانی بڑے بھائی کرچیئن کی موروں کے قصبے میں قدرتی وجوہات کی بنا پر ہونے والی موت کے بعد سنائی تھی۔ جو بات بلاشک وشبہ درست ہے، وہ یہ ہے کہ اس طویل رات کے دوران، جب کرنے کو اور کچھ بھی نہیں تھا، میتے کے پیالے گردش کرتے رہے، تو کسی نے اسے کسی سے سنا اور بعدازاں اسے سان تیا گوڈیبوو کو سنایا جس سے میں نے اسے پہلی بار سنا۔

اس کے برسوں بعد ٹرڈیرا میں مجھے پھر سے یہ کہانی سنائی گئی جہاں یہ حقیقتاً رونما ہوئی تھی۔ یہ دوسرا کسی حد تک مختصر بیان سان تیا گو کے بیان کی بنیادی تفصیلات کی توثیق کرتا ہے، ان معمولی تغیرات اور ترامیم کے ساتھ جن کی توقع کی جاسکتی ہے۔ میں اب اسے ضابطہ تحریر میں لا رہا ہوں کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ اس سے ان لوگوں کو جاننے کی ایک مختصر اور الم ناک راہ کھل سکتی ہے (اگر چہ میں اپنے خیال میں غلط بھی ہوسکتا ہوں) جو کبھی خنجر سے لڑائیاں لڑتے تھے اور بیونس ایریز کے مضافات میں دشوار گزار علاقوں میں رہتے تھے۔ میں یہ کہانی پوری ایمان داری کے ساتھ سناؤں گا حالاں کہ میں دیکھ سکتا ہوں کہ ادبی تحریک کے نتیجے میں ہوسکتا ہے میں کہیں مختصر تفصیلات کو بڑھا چڑھا دوں یا ان کا اضافہ کردوں۔

ٹرڈیرا میں انھیں نلسینز کہا جاتا ہے۔ مجھے ایک کلیسائی پادری نے بتایا کہ اس کے پیش رو

پادری کو یاد تھا کہ اس نے کسی حیرت کے بغیر ان کے گھر میں شکستہ سیاہ حروف والی انجیل دیکھی تھی۔ جس کے آخری صفحے پر ہاتھ سے لکھے ہوئے چند نام اور تاریخیں موجود تھیں۔ یہ سیاہ حروف والی انجیل کی واحد جلد تھی جو ان کی ملکیت تھی۔ اس سے جڑی نلسنز کی المناک روداد اب قصہ پارینہ ہو چکی ہے جیسے کبھی ہر شے کھو جائے گی۔ یہ بڑا اختہ حال گھر (جواب باقی نہیں رہا) بغیر سیمنٹ والی اینٹوں سے بنا تھا۔ داخلی راستے سے ہی سرخ ٹائلوں کا اولین اندرونی صحن دکھائی دیتا تھا اور دوسرا صحن اس سے کہیں پیچھے تھا جس کے فرش کی مٹی کو دبا کر سخت کیا گیا تھا۔ چند ہی لوگ اس داخلی راستے کو عبور کر پائے تھے۔ نلسنز اپنی خلوت کی حفاظت کرتے تھے۔

وہ اپنے زبوں حال اور فرنیچر کے بغیر خواب گاہوں میں چارپائیوں پر سوتے تھے۔ ان کی تعیّشات میں گھوڑے، کاٹھیاں، چھوٹی دھار والے خنجر، ہفتے کی رات کے بھڑک دار ملبوسات اور شراب شامل تھی جو انھیں جھگڑالو بنا دیتی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دراز قد تھے، سرخی مائل بالوں والے، ڈنمارک یا آئرلینڈ (جن ملکوں کے نام بھی شاید انھوں نے کبھی نہ سنے ہوں گے) کے لوگوں کا خون ان ہسپانوی امریکی حیوانوں کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ قرب و جوار میں لوگ سرخ سر والوں سے خوف زدہ تھے کہ یہی انھیں پکارا جاتا۔

وہ مویشی چرانے والے، لاری چلانے والے، گھوڑے چرانے والے اور کبھی کبھار پتے باز ہوتے تھے۔ ان کی شہرت بخیل لوگوں کی تھی سوائے اس موقع کے کہ جب وہ مے نوشی کرتے یا جوا کھیلتے ہوئے کھلے دل کا مظاہرہ کرتے۔ ان کے آباء واجداد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آئے۔ ان کے پاس ایک بیل گاڑی اور بیل کا جوا ہوتا تھا۔

جسمانی طور پر وہ ان اکھڑ لوگوں سے مختلف تھے جن کی وجہ سے کوسٹا براوا کو ایک غیر قانونی علاقے کے طور پر شہرت حاصل تھی۔ یہ بات اور کئی دوسری باتیں جن کے بارے میں ہمیں کچھ خاص علم نہیں ہے، یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے کتنے قریب تھے۔ ان میں سے کسی ایک سے دشمنی مول لینے کا مطلب دو دشمن پالنا تھا۔

نیلسنز جسمانی لذات کے شائق تھے لیکن ان کے رومان بری شہرت والی ڈیوڑھیوں، دہلیزوں اور گھروں میں پلتے تھے۔ اس کا بہت چرچا ہوا تھا جب کرسچیئن، خولیانہ برگوس کو اپنے ساتھ گھر لایا۔ سچ یہ تھا کہ ایک طور سے اسے اپنے لیے ایک ملازمہ مل گئی تھی لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ وہ اس کے لیے قیمتی زیورات بھی لاتا اور اسے تقریبات میں بھی لے جاتا۔ خستہ حال کرایہ کے چھوٹے گھروں کی تقریبات جہاں خاص ٹانگو کے رقص (جیسے مثال کے طور پر کیو براڈا اور کورٹے رقص) غیر شائستہ مانے جاتے تھے اور ان کی وہاں اجازت نہیں تھی اور جہاں جوڑے ''دن کی روشنی میں رقص کرتے تھے''۔

خولیانہ کی آنکھیں بادامی تھیں اور جلد کی رنگت گہری۔ کوئی اس کی طرف دیکھتا تو وہ مسکرا دیتی۔ پسماندہ مضافات میں، جہاں عورتیں کام کی زیادتی اور نظر انداز کیے جانے کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو جاتی تھیں، وہ ایسی بدصورت بھی نہیں تھی۔

پہلے پہل ایڈیورڈو ان کے ساتھ رہتا تھا۔ پھر کسی کام سے وہ اریسیفس گیا اور واپسی پر ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لے آیا جسے اس نے سڑک سے اٹھایا۔ چند ہی دنوں میں اس نے اسے چلتا کیا۔ وہ زیادہ بدمزاج اور آزردہ ہو گیا تھا۔ وہ کونے میں واقع شراب خانے والے جنرل سٹور میں جا کر مے نوشی کرتا اور کوئی اس سے بات کرتا تو اسے جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ کرسچیئن کی عورت کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس کے قرب و جوار کے لوگوں نے خفیہ اور فریبی مسرت سے محسوس کیا (اور شاید وہ جانتے تھے کہ اس بھائی کو احساس ہونے سے پہلے ہی وہ اس معاملے سے باخبر ہو گئے تھے) کہ دونوں بھائیوں میں ایک خفیہ دشمنی سی چل پڑی تھی۔

ایک رات مے نوشی کی محفل سے گھر لوٹتے ہوئے ایڈیورڈو نے کرسچیئن کا سیاہ گھوڑا اس کے گھر کے باہر ایک کھمبے سے بندھا دیکھا۔ کرسچیئن صحن میں بیٹھا اس کا انتظار کھینچتا رہا۔ وہ اپنے بہترین سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔

اس کی عورت ماتے کا پیالہ ہاتھ میں لیے گھر میں گھوم رہی تھی۔

''میں فیریس کے گھر ایک تقریب میں جا رہا ہوں۔ خولیانہ یہاں ہے۔ اگر تم اسے چاہتے ہو تو اسے استعمال کرو۔''

اس کا لہجہ نصف تحکمانہ تھا، نصف خوش آمدیدی۔ ایڈیورڈو خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کہے۔ کرسچین اٹھ کھڑا ہوا، ایڈیورڈو کو خدا حافظ کہا، خولیانہ کو نہیں جو اس کے لیے محض ایک شے تھی۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور کسی عجلت کے بغیر آہستہ چال میں چل دیا۔

اس رات کے بعد سے وہ دونوں ہی اسے استعمال کرتے۔ کسی کو اس غلیظ اہتمام کی تفصیلات سے کبھی آگاہی نہیں ہوئی جس نے اردگرد کے لوگوں کی شرافت کی تذلیل کی تھی۔ چند ہفتے یہ انتظام یونہی قائم رہا۔ لیکن زیادہ دیر چل نہیں سکا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ تینوں گھر پر ہوں اور بھائیوں میں سے کوئی خولیانہ کا نام لے، یا اسے بلائے بلکہ وہ ایسی وجوہات تلاش کرتے اور وہ انھیں مل بھی جاتیں کہ جن کی بنیاد پر وہ ایک دوسرے سے اختلاف کر سکیں۔ وہ کھالوں کے ایک انبار کی قیمت فروخت کے بارے میں بے کار باتیں کر رہے تھے لیکن اصل میں کوئی اور بات تھی جس پر وہ بحث رہے تھے۔ کرسچین کی عادت تھی کہ وہ اپنی آواز بلند کر لیتا۔ ایڈیورڈ کی عادت خاموش ہو جانے کی تھی۔ اس بات کو جانے بغیر وہ ایک دوسرے سے حسد میں مبتلا تھے۔

شہر کے دشوار گزار مضافات میں کوئی آدمی یہ نہیں کہتا، نہ ہی کسی کے بارے میں ایسا کہا جاتا تھا کہ عورت (خواہش اور ملکیت سے بڑھ کر) اس کے لیے کوئی شے مسئلہ ہو لیکن دونوں بھائی اس کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اس بات سے وہ کسی قدر ہتکی محسوس کرتے۔ ایک سہ پہر کو لوماس ٹاؤن پلازا میں ایڈیورڈ حوان آئیبرا پر چڑھ دوڑا جس نے اسے ایسی خوبصورت عورت کو شکار کر لینے پر مبارک باد دی۔ تب میرے خیال میں ایڈیورڈ نے اسے سخت سست کہا۔ ایڈیورڈ کی موجودگی میں کوئی بھی کرسچین کو ایسے مذاق کا نشانہ نہیں بناتا تھا۔

عورت حیوانوں کی سی اطاعت پسندی کے ساتھ دونوں بھائیوں کی حاجات کا دھیان رکھتی حالاں کہ وہ چھوٹے بھائی کے لیے اپنی پسندیدگی کو چھپا بھی نہ پاتی تھی جس نے اس انتظام

کار میں حصہ لینے سے انکار تو نہیں کیا تھا لیکن اسے شروع بھی نہیں کیا تھا۔ ایک دن بھائیوں نے خولیانہ کو حکم دیا کہ وہ باہر صحن میں دو کرسیاں لائے اور پھر وہاں سے دور رہے۔ دونوں آپس میں کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ بات چیت طویل ہوگی۔ اس لیے وہ ستانے کے لیے لیٹ گئی۔ لیکن جلد ہی انھوں نے اسے آواز دے کر بلایا۔

انھوں نے اس سے کہا کہ جو کچھ بھی اس کی ملکیت ہے وہ ایک بوری میں ڈال لے حتیٰ کہ کانچ کے موتیوں کی تسبیح اور ننھی صلیب بھی جو اس کی ماں نے اسے دی تھی۔ پھر وضاحت میں کوئی لفظ کہے بغیر انھوں نے اسے بیل گاڑی میں لادا اور ایک دشوار گزار اور خاموش سفر پر روانہ ہو گئے۔ بارش تھم چکی تھیں جس سے سڑکیں کیچڑ آلود تھیں۔ صبح کے پانچ بجے ہوں گے جب آخر وہ موروِن پہنچے۔ وہاں انھوں نے قحبہ خانے کی مالکہ کو جگایا اور اسے کہا کہ وہ خولیانہ کو فروخت کر دے۔ سودا طے پا گیا۔ کرسچین نے رقم لی اور پھر اسے ایڈیورڈو سے بانٹ لیا۔

ٹرڈیرا میں نیلسنز نے، جو دہشت ناک محبت کے چنگل میں (جو ان کے معمول کا حصہ بن چکا تھا) پھنس گئے تھے، پھر سے مردوں کے درمیان مردوں والی پرانی زندگی جینے کی کوشش کی۔ وہ پھر سے ٹروکو کے کھیلوں، مرغوں کی لڑائی اور مے نوشی میں دلچسپی لینے لگے۔ یوں شاید انھوں نے سوچا کہ انھوں نے خود کو بچا لیا تھا لیکن پھر وہ غیر واضح (یا پھر ضرورت سے زیادہ) غیر حاضریاں کرنے لگے۔ سال کے اختتام سے کچھ ہی پہلے ایڈیورڈو نے کہا کہ اسے دارالخلافہ میں کوئی کام تھا۔ وہ چلا گیا۔ وہ رخصت ہو چکا تو کرسچین موروِن کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں سفری کھمبے سے بندھا گھوڑا، جس کے لیے یہ کہانی ہمیں پہلے ہی متوقع بنا دیتی ہے، ایڈیورڈو کا چھوٹا گھوڑا تھا۔ کرسچین اندر چلا گیا۔ ایڈیورڈو وہاں موجود تھا اور اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

''یوں معلوم ہوتا ہے کہ'' کرسچین نے اس سے کہا، ''اگر ہم زیادہ عرصہ یونہی چلتے رہے تو اپنے گھوڑوں کو تھکا دیں گے۔ شاید ہمیں اسے وہاں پہنچا دینا چاہئے جہاں ہم اسے لے جا سکتے ہیں۔''

اس نے قحبہ خانے کی مالکہ سے بات کی، اپنے بٹوے سے چند سکے نکالے اور وہ دونوں خولیانہ کو لے کر چل دیئے۔ وہ کرسچیئن کے ساتھ سوار تھی۔ ایڈیورڈو اپنے لمبے بالوں والے گھوڑے کو تیز دوڑاتا آگے نکل گیا تاکہ انھیں نہ دیکھ سکے۔

وہ پھر سے اپنے پرانے معمول پر واپس آ گئے۔ ان کا قابل نفرت حل کارآمد ثابت نہیں ہوا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو چکمہ دینے کی ترغیب کے آگے ہار گئے۔ فتنہ پلتا رہا لیکن نیلسنز میں محبت بھی بہت تھی (کون کہہ سکتا تھا کس قسم کی دشواریوں اور خطروں کو انھوں نے اکٹھے سہارا تھا) اور انھوں نے اپنی برہمی کا دوسروں کو نشانہ بنایا جیسے کوئی اجنبی، کتے، خولیانہ جس نے ان کے درمیان نفاق کا بیج بویا تھا۔

مارچ کا مہینہ اختتام کے قریب تھا لیکن گرمی کا زور مسلسل بڑھ رہا تھا۔ ایک اتوار کو (لوگ اتوار کو ایک دن پہلے کا دن پکارتے ہیں) ایڈیورڈو شراب خانے سے گھر لوٹ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کرسچیئن بیلوں کو گاڑی میں جوت رہا تھا۔

"آؤ" کرسچیئن بولا، "ہمیں نگر کے ہاں کچھ کھالیں لے جانی ہیں۔ گاڑی میں انھیں پہلے ہی لادلیا ہے۔ ہم شام کو ٹھنڈے موسم میں چلیں گے۔"

میرے خیال میں نگر کی دکان نیلسنز کے گھر کے ایک طرف جنوب میں واقع تھی۔ وہ ٹروپ روڈ سے روانہ ہوئے۔ پھر ایک ایسے راستے پر ہو لیے جہاں آمدورفت کم تھی۔ دیہات رات کے گہرا ہونے کی وجہ سے پھیلا ہوا لگتا تھا۔ وہ ایک کھیت کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے جو خشک تنکوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کرسچیئن نے سگار پھینک دیا جو اس نے ابھی جلایا تھا اور گاڑی روک لی۔

"چلو، بھائی کام کرتے ہیں۔ گدھ ہمارے بعد یہاں آکر صفائی کر دیں گے۔ میں نے اسے آج قتل کر دیا۔ ہم اسے یہاں چھوڑ جائیں گے، اسے اور اس کے آرائشی لباس کو۔ یہ ہمارے لیے مزید مشکلات پیدا نہیں کرے گی۔"

تقریباً روتے ہوئے انھوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ اب وہ ایک اور طرح کے تعلق میں جڑ گئے تھے، اس عورت کے ناطے، جسے دکھ کے ساتھ قربان کیا گیا اور اسے فراموش کردینے کی ذمہ داری کے ناطے۔

# آئینہ اور نقاب

کلانٹارف کی جنگ تمام ہوئی، جس میں ناروے کی فوجوں کو شکست فاش ہوئی، تو آئر لینڈ کے بادشاہ نے اپنے درباری شاعر سے کہا، "عظیم کارہائے نمایاں کو اگر لفظوں کے سکوں میں نہ ڈھالا جائے تو وہ اپنی تابانی کھو دیتے ہیں۔" کچھ توقف کے بعد وہ پھر سے گویا ہوا "میں چاہتا ہوں تم میری فتح اور عظمت کے گیت گاؤ۔ میں اینیس ہو جاؤں اور تم میرے ورجل بنو۔ کیا تم خود کو اس منصب کے اہل سمجھتے ہو جو ہم دونوں کو جاوداں بنا دے گا۔"

"ہاں میرے بادشاہ، میں پر اعتماد ہوں۔" شاعر نے کہا "میں اولان ہوں۔ میں نے بارہ موسم سرما عروض کا علم سیکھنے میں صرف کیے ہیں۔ مجھے تین سو ساٹھ دیو مالائی قصے زبانی یاد ہیں جو سچی شاعری کی بنیاد ہیں۔ السٹر اور منسٹر چکروں کی آئرستانی داستانیں میرے بربط کی تاروں میں قید ہیں۔ قواعد نے مجھے استناد بخشا ہے کہ میں اپنی زبان کے قدیم ترین الفاظ اور انتہائی پیچیدہ استعارے بے تکلف استعمال کروں۔ میں نے خفیہ رسم الخط پر عبور حاصل کیا ہے جو ہمارے علم کو عوام الناس کی ناقدر شناس نظروں سے محفوظ رکھتا ہے۔

میں محبتوں، مویشی چوروں کی کارستانیوں، سیاحتوں اور جنگوں کے گیت گا سکتا ہوں۔ میں آئرلینڈ کے تمام شاہی گھرانوں کے مابعد الطبیعاتی حسب نسب سے آگاہ ہوں۔ مجھے جڑی بوٹیوں، جوتش، ریاضیات اور شریعت کا مخفی علم حاصل ہے۔ میں نے عوامی مقابلوں میں اپنے حریفوں کو مات دی ہے۔ میں نے ہجویہ پر عبور حاصل کیا جو جزام سمیت مختلف جلدی امراض

کا باعث بنتا ہے۔ مجھے تلوار پر گرفت رکھنی آتی ہے جیسا کہ میں نے آپ کی جنگ میں ثابت بھی کیا۔ بس ایک ہی بات ایسی ہے جسے میں ڈھنگ سے نہیں کر سکا کہ کیسے آپ کی ان عنایات کا شکریہ ادا کروں۔''

بادشاہ، جو دوسروں کے طویل خطبات سے جلد بے زار ہو جاتا تھا، بڑے سکون سے شاعر سے بولا'' مجھے ان سب باتوں کا اچھی طرح سے علم ہے۔ مجھے ابھی اطلاع ملی ہے کہ حال ہی میں انگلستان میں بلبل نے اپنے نغمے بکھیرنے شروع کیے ہیں۔ جب بارشوں اور برف باری کا موسم گزر جائے گا اور بلبل جنوبی سرزمینوں کے سفر سے لوٹ آئیں تو تم اپنا قصیدہ دربار اور شعرا کی مجلس میں پڑھنا۔ میں تمھیں ایک سال کی مہلت دیتا ہوں۔ ہر حرف اور ہر لفظ کو تم رگڑ کر چمکا دینا۔ اس کا انعام جیسا کہ تم جانتے ہو، میرے شاہی دستور کے مطابق کم نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ تمھاری تفکر سے بھری بے نیند راتوں سے کم ہوگا۔''

''بادشاہ سلامت آپ کے چہرہ پرنور کا دیدار ہی میرا اجر ہے۔'' شاعر نے کہا جو ایک درباری بھی تھا۔ پھر جھک کر کورنش بجالایا اور رخصت ہوا۔ چند ایک اشعار اس کے ذہن میں ابھی سے گردش کرنے لگے تھے۔

متعینہ سال گزر گیا جو وباؤں اور بغاوتوں کا دور تھا۔ شاعر نے قصیدہ پیش کیا۔ اس نے اسے آہستہ روی اور اعتماد کے ساتھ مسودے پر نگاہ ڈالے بغیر پڑھا۔ قرات کے دوران بادشاہ نے سر کے اشارے سے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ ہر کسی نے بادشاہ کے اشارے کی پیروی کی۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے بھی، جو باہر دروازوں میں ہجوم کیے کھڑے ہونے کے باعث، اس بارے میں ایک لفظ ادا کرنے سے بھی قاصر تھے۔ آخر میں بادشاہ نے خطاب کیا۔

'' مجھے تمھاری محنتوں کا اعتراف ہے۔ یہ ہماری دوسری فتح ہے۔ تم نے ہر لفظ کو اس کے حقیقی معنی اور ہر اسم ذات کو وہی وصف تفویض کیا جو قدیم زمانوں کے شعرا نے اس سے منسوب کیا۔ تمھارے تمام قصیدے میں ایک تخیل بھی ایسا نہیں جو ادبیات عالیہ کے لیے ناشناسا ہو۔ جنگ

مردوں کا خوبصورت پارچہ ہے اور خون تلوار کا گھونٹ ہے۔ سمندر کے مخصوص دیوتا ہیں اور بادل مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ تم نے بڑی فن کاری کے ساتھ قافیہ، تجنیس خطی، ردیف، اوزان اور فاضلانہ فن خطابت کی تراکیب کو نبھایا ہے۔ اگر آئر لینڈ کا تمام ادب فنا ہو جائے جو ایک بدشگون امر ہوگا' تو اسے بغیر کسی نقصان کے محض تمہاری اس عظیم نظم کی بنا پر از سر نو تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ تیس کاتب اسے بارہ بارہ مرتبہ لکھیں گے۔''

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ تب وہ پھر سے گویا ہوا'' ہر چیز ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود کہیں کچھ نہیں ہوا۔ ہماری شریانوں میں خون کی گردش تیز نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاتھ ہماری کمانوں کی طرف نہیں بڑھے۔ کسی کے رخسار زرد نہیں ہوئے۔ کسی نے جنگ کی چیخ بلند نہیں کی، نہ کوئی وائکنگز کے حملے کے خلاف ہی سینہ سپر ہوا۔ اگلا سال ختم ہونے سے پہلے اے شاعر ہم تمہاری مزید ایک نظم کی داد دینا چاہیں گے۔ ہماری شکر گزاری کے اظہار کے طور پر تم یہ آئینہ رکھو جو چاندی کا بنا ہوا ہے۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں اور کوئی بات میری سمجھ کے احاطہ سے باہر نہیں رہی اور میں آپ کی ہدایت کی پیروی کروں گا۔'' شاعر نے کہا۔

آسمان پر ستارے اپنے روشن راستوں پر محو گردش رہے۔ ایک بار پھر بلبلوں نے سیکسن کے جنگلوں میں اپنے سُر بکھیرے۔ شاعر اپنے مسودے کے ساتھ لوٹا جو پہلے سے نسبتاً مختصر تھا۔ اس نے اسے یادداشت کے بل پر نہیں گایا بلکہ اسے پڑھا۔ واضح طور پر ہچکچاتے ہوئے، خاص خاص قطعات عمداً حذف کرتے ہوئے جیسے وہ خود بھی انہیں کلی طور پر سمجھ نہیں پایا تھا یا انہیں پڑھ کر اس کی بے حرمتی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اشعار عجیب تھے۔ وہ جنگ کی روداد نہیں تھے بلکہ خود ایک جنگ تھے۔ مصرعوں کے جنگجوانہ انتشار میں موجود ہے ایک خدا جو بیک وقت تین ہے اور ایک بھی، آئر لینڈ کے دیوی دیوتا، اور وہ بھی جو صدیوں بعد 'Elder Edda' کے آغاز پر جنگ شروع کریں گے۔ نظم کی ہیئت بھی کچھ کم عجیب نہیں تھی۔ ایک انوکھا اسم ایک فعل جمع پر غالب تھا۔ حرف جار عام

استعمال سے مختلف تھا۔ درشتی ملائمت سے بدل گئی۔ استعارے بے قاعدہ تھے یا پھر ایسے معلوم ہوتے تھے۔

بادشاہ نے اپنے گرد موجود صاحبان دانش و بینش سے کچھ دیر صلاح و مشورہ کیا، اور پھر شاعر سے مخاطب ہوا۔

''تمہاری پہلی نظم کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ آئر لینڈ میں گائی گئی تمام نظموں کا موزوں خلاصہ تھی۔ لیکن یہ ان سب پر سبقت لے گئی ہے بلکہ یہ ہر اس شاہکار کو فنا کر دینے کے لیے کافی ہے جس سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ یہ ششدر کرتی ہے، آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ یہ حیرت پیدا کرتی ہے۔ کم علم لوگ اس کی وقعت سے لاعلم رہیں گے، نہ ان کی ستائش ہی تمہارے فن کے لیے ہوگی۔ صرف فضلا جو تعداد میں مختصر ہیں' اس کے محاسن سے کما حقہ آگاہ ہیں۔ واہ، اس کی واحد جلد کے لیے بہترین جگہ ہاتھی دانت کا صندوقچہ ہے۔ جس قلم سے ایسا عظیم کارنامہ انجام پذیر ہوا، ہم اس سے ایک اور مزید عالی مرتبہ نظم کی توقع کرتے ہیں۔'' بادشاہ مسکرایا اور گویا ہوا'' ہم ایک حکایت کے کردار ہیں۔ اور حکایات میں تین کا عدد سب پر غالب ہوتا ہے۔''

''جادوگر کے تین تحفے، تین مصرعی نظمیں اور ناقابل شک تثلیث۔'' شاعر سرگوشی میں اتنی جرات کا مظاہرہ کر پایا۔

بادشاہ نے بیان جاری رکھا'' ہماری خوشنودی کی نشانی کے طور پر یہ نقاب لو۔ یہ سونے کا بنا ہے۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں اور ساری بات سمجھ گیا ہوں اور اس کی تعمیل کروں گا۔'' شاعر نے جھک کر عرض کیا۔

سال بعد پھر سے یہ موقع آیا۔ محل کے سپاہیوں نے دیکھا کہ اس بار شاعر کے ہاتھ میں کوئی مسودہ نہیں تھا۔ ایک طرح کی حیرت کے ساتھ بادشاہ نے اسے دیکھا۔ شاعر ایک مختلف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ امتداد زمانہ کی بجائے کسی دوسری قوت نے جس کے نقوش کو بگاڑ اور بدل دیا

ہو۔ اسکی آنکھیں فاصلے پر کہیں ٹکی ہوئی یا بے نور معلوم ہوتی تھیں۔ شاعر نے التجا کی کہ وہ تخلیہ میں بادشاہ سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ غلام حجرے سے چلے گئے۔

''کیا تم نے نظم نہیں لکھی؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''ہاں لکھی ہے۔'' شاعر نے دکھ کے ساتھ جواب دیا، ''لیکن شاید ہمارے آقا عیسیٰ مسیح مجھے اس سے منع فرمائیں۔''

''کیا تم اسے دہرا سکتے ہو۔''

''اتنی جرات نہیں کر سکتا۔''

''میں تمہیں یہ جرات دوں گا جس کی تمھیں ضرورت ہے۔'' بادشاہ نے اعلان کیا۔

شاعر نے وہ نظم پڑھی۔ یہ یک مصرعی تھی۔ اسے باآواز بلند دہرانے کی جسارت کیے بغیر شاعر اور بادشاہ نے اسے پڑھا جیسے یہ کوئی خفیہ عبادت یا کلمہ کفر ہو۔ شاعر ہی کی مانند بادشاہ بھی دہشت زدہ اور مغلوب ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، زرد چہروں کے ساتھ۔

''اپنی جوانی میں'' بادشاہ نے کہا ''میں غروب آفتاب کی سمت کشتی چلاتا چلا گیا۔ ایک جزیرے پر میں نے چاندی کے شکاری کتے دیکھے جنھوں نے طلائی سوروں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ایک دوسرے جزیرے پر طلسمی سیبوں کی مہک نے ہمارا استقبال کیا۔ تیسرے جزیرے پر میں نے آگ کی دیواریں دیکھیں۔ ان جزیروں میں سب سے دور واقع جزیرے پر ایک محرابی اور معلق دریا آسمان کو کاٹتا بہہ رہا تھا اور اس کے پانیوں میں مچھلیاں اور کشتیاں بہتی تھیں۔ یہ تحیر خیز مناظر تھے، لیکن ان کی حیرت کا تمہاری نظم کے تحیر سے کوئی مقابلہ نہیں ہے جو ایک اعتبار سے ان تمام کا احاطہ کرتی ہے۔ کس سحر کی بدولت تم نے اسے پایا؟''

''صبح سویرے میں یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے بیدار ہوا جنہیں اول میں نہیں سمجھ سکا۔'' شاعر بولا ''وہ الفاظ یہی نظم ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ شاید ایسا گناہ جسے خدائے بزرگ و برتر کبھی معاف نہیں فرمائیں گے۔''

''ایسا گناہ جس میں اب ہم دونوں ملوث ہیں'' بادشاہ نے سرگوشی میں کہا۔ ''حسن کو جان لینے کا گناہ، جو ایسا راز ہے جسے انسان سے پردے میں رکھا گیا۔ اب ہم پر کفارہ فرض ہے۔ میں نے تمہیں ایک آئینہ اور ایک طلائی نقاب دیا تھا۔ یہ میرا تیسرا تحفہ ہے جو آخری بھی ہوگا''۔ ایک خنجر اس نے شاعر کے دائیں ہاتھ میں تھما دیا۔

شاعر کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ اس نے محل سے نکلتے ہی خود کو قتل کر ڈالا۔ جبکہ بادشاہ اب ایک گداگر ہے اور آئرلینڈ کے طول و عرض میں بھٹکتا پھرتا ہے جو کبھی اس کی بادشاہت تھی، اور یہ کہ اس نے کبھی وہ نظم نہیں دہرائی۔

# بابل میں قرعہ اندازی

بابل کے تمام افراد کی طرح میں صوبہ دار رہ چکا ہوں۔ سبھی کی طرح ایک غلام بھی۔ مجھے قدرت کاملہ، فضیحت، اسیری جیسی کیفیات کا تجربہ ہے۔ دیکھیے، میرے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت غائب ہے۔ دیکھیے، میری قبا کے چاک میں سے آپ کو میرے پیٹ پر ایک سرخ ٹیٹو گودا ہوا دکھائی دے گا۔ یہ دوسری علامت 'ب' ہے۔

پورے چاند کی راتوں میں یہ نشان مجھے 'ج' نشان والوں پر غلبہ عطا کرتا ہے۔ لیکن 'الف' نشان والوں کے زیر دست بھی کر دیتا ہے، جو بے چاند راتوں میں 'ج' نشان کے طابع ہوتے ہیں۔ صبح کے نیم اجالے میں ایک تہہ خانے میں سیاہ قربان گاہ کے سامنے میں نے مقدس سانڈوں کی شہ رگیں کاٹی تھیں۔ ایک پورے قمری سال کے لیے مجھے غیر مرئی قرار دیا گیا۔ میں چلاتا رہا مگر کوئی مجھے جواب نہیں دیتا تھا۔ میں روٹی چراتا لیکن انھوں نے میرا سر قلم نہیں کیا۔ میں وہ کچھ جان چکا ہوں جس سے یونانی بھی لاعلم تھے یعنی غیر یقینی پن۔ ایک کانسی کے کمرے میں گلا گھوٹنے والے کے خاموش دستی رومال کے آگے بھی امید نے مجھ سے حق وفاداری نبھایا۔ مسرت و انبساط کے تلاطم میں بھی میرے قدم نہیں ڈگمگائے۔ ہیر قلائیڈس پونٹیکس توصیفی انداز میں بتاتا ہے کہ فیثا غورث کو یاد تھا کہ وہ پہلے فائیرس رہ چکا تھا۔ اس سے پہلے یوفوربس تھا اور اس سے بھی پہلے کوئی دوسری فانی جون۔ ایسی ہی متغیر صورتوں کو یاد کرنے کے لیے مجھے موت یا حتی کہ کسی فریب سے رجوع کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

میں اس وحشیانہ تنوع کو ایک ادارے کا مرہون منت قرار دیتا ہوں جس سے دیگر جمہوری ریاستیں بے خبر ہیں یا جوان میں غیر پختہ اور مخفی انداز میں سرگرم رہتا ہے، یعنی قرعہ اندازی۔ میں اس ادارے کی تاریخ کھنگالنے کی کوشش نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ اہل دانش اس بارے میں اختلاف رائے کا شکار ہیں۔ اس کے طاقت ور مقاصد سے میں اتنا ہی آگاہ ہوں، جتنا کوئی ایسا شخص چاند کے بارے میں آگاہی رکھتا ہے جسے علم نجوم سے واقفیت نہ ہو۔ میں ایسے ملک سے آیا ہوں جہاں قرعہ اندازی حقیقت کی جز و لاینفک ہے۔ آج کے دن تک میں نے اس بارے میں اتنا ہی کم سوچا جتنا میں نے لاتنجل احکام ربانی کے اطوار یا اپنے دل کے بارے میں سوچا ہوگا۔

بابل اور اس کے محبوب ریت رواج مجھ سے بہت دور ہیں۔ اس لیے میں کچھ تعجب کے ساتھ قرعہ اندازی اور ان ملحدانہ منتروں کے بارے میں سوچتا ہوں جنھیں نقاب پوش افراد صبح یا شام کے نیم اجالے میں بڑبڑاتے ہیں۔

میرے والد بتاتے ہیں کہ ازمنہ قدیم میں (صدیوں پہلے؟ یا برسوں پہلے) بابل میں قرعہ اندازی ایک کھیل تھی جسے عام لوگ کھیلتے تھے۔ انھیں یاد تھا (میں نہیں جانتا کہ سچ یا جھوٹ) کہ کیسے حجام تانبے کے سکوں کے عوض ہڈی یا چرمی کاغذ سے بنے اور علامتوں سے مزین مستطیل ٹکڑے دیتے تھے۔ نصف النہار کے وقت قرعہ اندازی ہوتی۔ جن پر تقدیر مہربان ہوتی، وہ اتفاق کی مزید کسی آزمائش کے بغیر چاندی کے سکے وصول کرتے۔ جیسا کہ آپ محسوس کر سکتے ہیں، یہ نظام خام تھا۔

قدرتی طور پر یہ نام نہاد قرعہ اندازیاں ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ ان کی اخلاقی وقعت صفر تھی۔ ان کا انسان کی جملہ اہلیتوں سے تعلق نہیں تھا، سوائے امید کے۔ عوام کی عدم دلچسپی کے سبب تجار، جنھوں نے ان زرانداوز قرعہ اندازیوں کی داغ بیل ڈالی تھی، گھاٹے کی گرفت میں آئے۔ کسی نے اس میں اختراع کی کوشش کی۔ یعنی موافق اعداد کے درمیان چند غیر موافق اعداد کا اضافہ کر دیا۔ اس اختراع سے اعداد والے مستطیلوں کے خریدار رقم جیتنے یا جرمانہ ادا کرنے کے

دو گنے احتمال کا سامنا کرتے۔ ہوسکتا تھا وہ رقم جیت لیں یا جرمانہ ادا کریں۔ بعض اوقات کافی زیادہ۔ جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی کہ اس معمولی احتمال نے (کہ ہر تیس موافق اعداد میں ایک عدد غیر موافق ہوتا) عوام کی دلچسپی کو بیدار کیا۔

اہل بابل نے خود کو اس کھیل میں جھونک دیا۔ جو قسمت آزمائی نہ کرتے، انھیں کم تر بزدل، مہم جوئی کی صفت سے تہی انسان سمجھا جاتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس باجواز نفرت نے ایک اور ہدف حاصل کیا۔ نہ صرف وہ لوگ جو کھیل میں حصہ نہیں لیتے تھے، بلکہ وہ بھی جو ہار جاتے اور جرمانہ ادا کرتے۔ کمپنی (جس نام سے یہ تب پکاری جانے لگی تھی) کو جیتنے والوں کے مفادات کا تحفظ کرنا پڑتا جنھیں انعامات کی رقم ادا نہیں کی جاسکتی تھی، اگر جرمانے کی کُل رقم موصول نہ ہو۔ ہارنے والوں کے خلاف مقدمات کا آغاز ہوا۔ جج نے انھیں سزا سنائی کہ جرمانہ ادا کریں اور عدالتی اخراجات بھی، یا پھر جیل کی ہوا کھائیں۔ تو کمپنی کو چکمہ دینے کے لیے سبھی نے جیل جانے کو ترجیح دی۔ یوں ان چند لوگوں کی دلیری کمپنی کی موجودہ قادر مطلق اور اس کی مابعد الطبیعی اور کلیسائی قوت کا منبع بنی۔

اس سے تھوڑا عرصہ بعد قرعہ اندازی کی فہرستوں میں سے جرمانوں کی رقمیں منہا کر دی گئیں۔ یہ فہرستیں اسیری کی میعاد کی اشاعت تک محدود ہوگئیں جو ہر غیر موافق عدد کے ساتھ منتھی ہوتی تھی۔ اختصار پسندی کا یہ رجحان، جیسا کہ یہ تھا، جس پر تب کچھ توجہ نہیں دی گئی، بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ قرعہ اندازی کے کھیل میں غیر مالیاتی عناصر کا اولین ظہور تھا۔ ان اقدام کو عدیم المثال مقبولیت حاصل ہوئی۔ خریداروں کے اصرار پر کمپنی غیر موافق اعداد کی تعداد بڑھانے پر مجبور ہو گئی۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں اہل بابل منطق اور حتی کہ موزونیت کے بہت شائق ہیں۔ انھیں یہ بات غیر منطقی معلوم ہوئی کہ خوش بخت اعداد کو تو گول سکوں میں تولا جائے اور بد بخت اعداد کا نتیجہ اسیری کے دن اور رات ہوں۔ چند معلمین اخلاق نے استدلال کیا کہ ملکیت زر ہمیشہ مسرت کا

باعث نہیں ہوتی اور یہ کہ قسمت کی دیگر صورتیں زیادہ فوری ہیں۔

شہر کے مفلوک الحال عوام نے ایک مختلف شکایت درج کرائی۔ راہبوں کے مدرسہ کے اراکین نے قرعہ اندازی کے لیے رقمیں کئی گنا بڑھا لیں۔ وہ امید اور خوف کے سبھی نشیب و فراز سے محظوظ ہونے لگے۔ غریب عوام نے قابل فہم یا ناگزیر حسد کے ساتھ جان لیا کہ انھیں اس بدنام اور لذت بھرے نشیب و فراز سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس جائز اور معقول خواہش نے کہ سبھی عورتوں اور مردوں، امیروں اور غریبوں کو قرعہ اندازی میں شامل ہونا چاہیے، غضب ناک احتجاج کو ہوا دی جس کی یاد برسوں بعد بھی ذہن سے محو نہیں ہوئی۔

چند متمرّد لوگوں نے یہ بات نہیں سمجھی یا ایسا ظاہر کیا کہ وہ نہیں سمجھے کہ ان کا معاملہ ایک نئی تنظیم، تاریخ کی ایک نئی ضروری منزل سے تھا۔ ایک غلام نے قرمزی رنگ کا ٹکٹ چرایا۔ ایک ٹکٹ جس نے اگلی قرعہ اندازی میں اس پر یہ جرمانہ عائد کرایا کہ ٹکٹ کے حامل کی زبان جلا دی جائے۔ تعزیری ضابطے میں یہی سزا ٹکٹ چوری کے لیے بھی طے کر دی گئی۔ اہل بابل کی ایک بڑی تعداد نے دلیل دی کہ غلام کو چوری کی سزا آگ میں تپی ہوئی آہنی سلاخیں داغنے کی صورت میں دی جانی چاہیے۔ چند ایک، جو زیادہ فراخدل تھے، بولے کہ جلاّد کو لوہا داغنے کی سزا دینی چاہیے کیوں کہ یہی اس کا مقدر ہے۔

شورشوں نے سر اُٹھایا، خون ریزی کے افسوسناک واقعات ہوئے۔ لیکن اہل بابل نے امرا کی مخالفت کے باوجود بالآخر اپنے ارادے کو منوا لیا اور ان کے فراخدالانہ مقاصد پورے ہوئے۔

پہلے انھوں نے کمپنی کو مجبور کیا کہ وہ مکمل عوامی قوت حاصل کرے۔ (نئی سرگرمیوں کی پیچیدگی اور پھیلاؤ کے پیش نظر ایسا اتحاد ضروری تھا)۔ دوم قرعہ اندازی کو خفیہ، عوامی اور بلا قیمت بنا دیا گیا۔ ٹکٹوں کی نقد فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔ بعل کے اسرار کے طور پر شروع ہونے والی مقدس قرعہ اندازیوں میں ہر آزاد انسان خود بخود شریک ہو جاتا جو ہر ساٹھویں رات کو دیوتا کی

بھول بھلیوں میں رونما ہوتی اور اگلی قرعہ اندازی تک ہر شخص کی تقدیر کا تعین کرتی تھیں۔ نتائج بعید از شمار تھے۔ ایک خوش بخت بازی کسی شخص کو ترقی دے کر دانش مندوں کی مجلس میں عہدہ دلا سکتی یا (خفیہ یا معروف) دشمن کی اسیری کا باعث بنتی یا ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ کسی مرد کو اپنے کمرے کی پرسکون تاریکی میں ایک عورت ملتی جو اسے جنسی ترغیب دیتی یا جس سے دوبارہ ملاقات کی وہ توقع نہ کر رہا ہوتا تھا۔

ایک سیہ بخت بازی عُضو بدن قطع کیے جانے، مختلف انداز کی روسیاہی یا موت پر منتج ہوسکتی تھی۔ بعض اوقات واحد واقعہ، 'ج' کا کسی سرائے میں قتل، 'ب' کا پراسرار طور پر دیوتا کے درجے پر تقرر، تیس یا چالیس قرعہ اندازیوں کا ایک خوش گوار نتیجہ ہوسکتا تھا۔ بازیوں کو اکٹھا کرنا مشکل ہوتا لیکن یاد رکھنے کی بات یہ تھی کہ کمپنی کے اہل کار قادر مطلق اور عیار تھے (اور اب بھی ہیں۔) کئی صورتوں میں یہ آگاہی کہ خاص خوشگوار نتائج محض اتفاق کے باعث تھے، ان نتائج کی اخلاقی وقعت ختم کرنے کا موجب بنتی۔

اس مسئلے سے قبل از وقت باخبر ہونے کے لیے کمپنی کے اہل کار اندازے اور جادو کی طاقت بروئے کار لاتے۔ جو تدابیر وہ اختیار کرتے، جو چالیں وہ چلتے، وہ ہمیشہ خفیہ ہوتی تھیں۔ ہر کسی کی ذاتی اُمیدوں اور خوف سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے علم نجوم کے ماہروں اور جاسوسوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ پتھر کے خاص شیر، ایک مقدس جگہ ''قفقہ''، ایک گرد آلود پکے نالے میں موجود درزیں وغیرہ ایسی جگہیں تھیں جو عمومی رائے کے مطابق کمپنی کو لوگوں تک رسائی فراہم کرتی تھیں۔ کینہ تو زیا کریم النفس لوگ ان جگہوں پر آکر معلومات درج کرواتے۔ حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی گئی فائلوں میں ان مختلف درجہ کی صداقت کی حامل معلومات کو اکٹھا کیا جاتا۔

غیر معمولی اقربا پرستی اور بدعنوانی سے متعلق شکایات کا طومار بندھ گیا۔ اپنی روایتی صوابدید کے تحت کمپنی ان کا براہ راست جواب نہیں دیتی تھی۔ اس کے بجائے نقاب بنانے والے ایک کارخانے کے ملبے پر ایک مختصر معقول توجیہ لکھ کر رکھ دی جاتی۔ یہ وضاحتی تحریریں اب مقدس

صحائف کا حصہ تصور کی جاتی ہیں۔اس تحریر میں پورے ایقان کے ساتھ درج کیا گیا ہوتا کہ قرعہ اندازی دنیا کی تنظیم میں 'اتفاق' کے اضافے کا نام ہے اور یہ کہ غلطیوں کا اعتراف 'اتفاق' کی تردید نہیں بلکہ اس کی توثیق قرار دی جاسکتی ہے۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ پتھر کے شیر اور مقدس نشیبی جگہیں، جنھیں اگرچہ کمپنی نے مسترد بھی نہیں کیا ( کہ وہ ان سے رجوع کرنے کے عوام کے حق کی تردید نہیں کرسکتی تھی )، سرکاری منتخب کردہ جگہیں نہیں تھیں، جیسا کہ ان کے بارے میں تصور کیا جاتا تھا۔

اس اعلان نے عوام کی بے چینی کو ختم کیا۔لیکن اس سے اور بھی نتائج برآمد ہوئے جو شاید اعلان کرنے والے کے گمان میں بھی نہیں تھے۔اس نے کمپنی کی سرگرمیوں اور مزاج کو بہت حد تک بدل کر رکھ دیا۔میرے پاس زیادہ وقت نہیں بچا۔ہمیں اطلاع دی گئی ہے کہ جہاز کا لنگر اٹھنے ہی والا ہے۔لیکن میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

چاہے یہ کیسا ہی غیر متوقع معلوم ہو لیکن تب تک کسی نے کھیل کا کوئی عمومی نظریہ وضع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اہل بابل قیاس پسند نہیں ہیں۔وہ اتفاق کے فیصلوں کی تعظیم کرتے، اپنی زندگیوں، اپنی امیدوں، اپنے بے نام خوف ان کے تابع کر دیتے ہیں۔لیکن انھیں کبھی خیال نہیں آیا کہ ان چیستانی قوانین اور چکردار گرّوں کی کھوج کریں جو ان میں بروئے کار ہوتے ہیں۔ اس نیم سرکاری اعلان سے، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، قانونی اور ریاضیاتی نوعیت کے کئی مباحث سامنے آئے۔ان میں سے ایک بحث سے درج ذیل قیاس پیدا ہوا: اگر قرعہ اندازی قسمت کی ایک سنگین صورت ہے، کائنات میں گاہے بگاہے پیدا ہونے والا نفوذ، تو کیا یہ مستحسن نہیں ہوگا کہ اتفاق قرعہ اندازی کے کسی ایک مرحلے میں نہیں بلکہ ہر مرحلے میں دخل در انداز ہو؟

کیا یہ مضحکہ خیز بات نہیں ہے کہ اتفاق کسی موت کا فیصلہ کرے لیکن اس موت کی صورت حال، چاہے یہ خفیہ ہو یا عمومی، چاہے یہ لمحہ بھر کے لیے ہو یا صدی بھر کے لیے، یہ سب کچھ اتفاق کے زمرے میں نہ آئے؟ یہ نہایت معقول اعتراضات بالآخر وسیع تر اصلاح کا موجب بنے۔ نئے

نظام کی پیچیدگیاں کو (جو اس کے صدیوں سے عمل پذیر ہونے کے باعث پیچیدہ تر ہوئیں) صرف معدودے چند ماہرین ہی سمجھ پائے۔ اگرچہ انھیں میں یہاں اجمالاً، گو علامتی انداز میں ہی سہی، بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہم پہلی قرعہ اندازی کا تصور کرتے ہیں جو ایک شخص کی موت کا موجب ہوئی۔ اس حکم کی تعمیل کی غرض سے ایک دوسری قرعہ اندازی ہوئی۔ اس دوسری قرعہ اندازی کے نتیجے میں فرض کیجیے نو ممکنہ جلاّ دوں کے نام تجویز ہوئے۔ ان نو جلاّ دوں میں سے چار جلاد تیسری قرعہ اندازی کا انعقاد کرتے ہیں تا کہ ایک حتمی جلاّ د کا نام متعین ہو۔ ہوسکتا ہے دو جلاد قرعہ اندازی کے بدترین نتیجے کو ایک خوش بخت نتیجے سے بدل دیں (مثلاً ایک خزانہ کی دریافت)، کوئی دوسری قرعہ اندازی موت کی سزا کو مزید سنگین بنا سکتی ہے (جیسے موت کو زیادہ تذلیل آمیز بنا دینا یا اس میں اذیت کاری کا اضافہ کرنا۔) جب کہ دیگر قرعہ اندازیاں اس سزا پر عمل درآمد کو یکسر مسترد کر سکتی ہیں۔

علامتی طور پر دیکھا جائے تو یہ قرعہ اندازی کی اصل ہیئت ہے۔ فی الحقیقت قرعہ اندازیوں کی تعداد لامحدود ہے۔ کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہے، ہر فیصلہ دوسرے میں ضم ہو جاتا ہے۔ بے خبر افراد فرض کر لیتے ہیں کہ غیر محدود قرعہ اندازیوں کے لیے غیر محدود وقت کی ضرورت ہے۔ جب کہ اتنا جاننا کافی ہے کہ وقت لامحدود طور پر قابل تقسیم ہو۔ جیسا ہرکیولیس اور کچھوے کی معروف حکایت ہمیں بتاتی ہے۔ لامحدودیت قابل تحسین انداز میں اتفاقات کی لچک دار تعداد اور قرعہ اندازی کے سماوی نمونے سے، جس کے افلاطونیت کے پیروکار مداح تھے، بہت موافق ہے۔

ہمارے اس ضابطے کی مسخ شدہ گونج ٹائبر کے کنارے تک سنائی دی: ایلیئس لیمپریڈس اپنی کتاب 'انتونینس ہیلیو گیبلس کی داستان حیات' میں بتاتا ہے کہ کیسے شہنشاہ گھونگوں کے خول پر قرعے لکھتا تھا جو رات کے کھانے پر مدعو اس کے مہمانوں کی قسمت متعین کرتے تھے کہ کسی کو سونے کے دس پاؤنڈ ملتے تو کسی کی قسمت میں دس مکھیاں، یا دس گلہریاں، یا دس ریچھ آتے۔ یہ یاد کرنا مناسب ہوگا کہ ہیلیو گیبلس نے اسی نام کے دیوتا کے پروہتوں کے درمیان ایشیائے کوچک میں

تربیت حاصل کی۔

غیر شخصی قرعہ اندازیاں بھی ہوتی تھیں جن کا مقصد غیر واضح ہوتا۔ کوئی ایک فیصلہ صادر کرتی کہ ٹیپر وبانا کا ایک یاقوت فرات کے پانیوں میں اچھال دیا جائے۔ کوئی دوسری طے کرتی کہ ایک پرندہ کسی خاص مینار کی چوٹی سے آزاد کیا جائے۔ کوئی یہ فیصلہ دیتی کہ ہر ایک صدی کے بعد کسی ساحل کے لاتعداد ریت کے ذرات میں سے ایک کی کمی (یا اضافہ) کر دیا جائے۔ کبھی کبھار نتائج خوفناک صورت اختیار کر لیتے۔

کمپنی کے صالح اثر کے تحت ہمارے ریت رواج میں اتفاق کا بے حد عمل دخل واقع ہوا ہے۔ دمشق کی شراب سے بھرے دو دستیوں والے درجن بھر برتن خریدنے والا اس اتفاق پر متعجب نہیں ہوگا، اگر ان میں اسے کوئی تعویذ یا ایک زہریلا سانپ ملے۔ معاہدے تحریر کرتے ہوئے کاتب اس میں ایک سہو کی گنجائش ہمیشہ رکھتا۔ میں نے اس عاقبت نااندیشانہ بیان میں خاص چمک دمک اور خاص پاجی پن بڑھا دیا ہے۔ غالباً کچھ پر اسرار عمومی پن بھی۔

ہمارے مورخین، دنیا کے سب سے بڑے دانش مندوں نے 'اتفاق' کی اصلاح کا ایک طریقہ کار وضع کیا ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اس طریقہ کار کے نتائج (عمومی طور پر) قابل اعتبار ہوتے ہیں۔ حالاں کہ انھیں کسی فریب دہی کے بغیر افشا نہیں کیا جاتا۔ بہر صورت کمپنی کی تاریخ سے بڑھ کر کوئی دوسری شے ایسی نہیں ہے جو اس قدر افسانویت سے آلودہ ہو۔

ایک معبد سے کھود کر نکالی گئی قدیم ترین زبان کی دستاویز، ہو سکتا ہے، گزشتہ روز یا گزشتہ صدی میں ہونے والی کسی قرعہ اندازی کا نتیجہ ہو۔ کوئی کتاب ایسی شائع نہیں ہوئی جس کی ہر جلد میں کچھ نہ کچھ فرق موجود ہو۔ کاتبین فروگذاشت کرنے، اضافہ کرنے اور فرق ڈالنے کا خفیہ حلف لیتے ہیں۔ بالواسطہ دروغ بھی عمل میں لایا جاتا ہے۔

الہامی انکساری کے ساتھ کمپنی ہر طرح کی تشہیر سے احتراز کرتی ہے۔ اس کے گماشتے خفیہ ہوتے ہیں۔ فرامین، جو یہ اکثر و بیشتر (اور غالباً پیہم) جاری کرتی ہے، فریب کاروں کے جاری

کردہ جعلی احکامات سے مختلف نہیں ہوتے۔ پھر یہ کہ کون ایک ٹھگ ہونے کی ڈینگ مار سکتا ہے؟ ایک شرابی جو ایک لغو فیصلے کی حمایت کرتا ہے، ایک خواب دیکھنے والا جو اچانک بیدار ہوتا اور اپنے ہاتھوں سے پہلو میں لیٹی عورت کو گلا گھونٹ کر مار دیتا ہے، تو کیا وہ دونوں غالباً کمپنی ہی کے کسی خفیہ فیصلے کی تعمیل نہیں کر رہے ہوتے؟

خدائی سرگرمیوں جیسی یہ خاموش کارروائی ہر طرح کے قیاسات کو جنم دیتی ہے۔ کسی نے توہین آمیز انداز میں یہ خیال ظاہر کیا کہ کمپنی تو صدیوں پہلے ختم ہو چکی تھی، اور یہ کہ ہماری زندگیوں کی مقدس بدنظمی خالصتاً موروثی اور روایتی ہے۔ کچھ یہ خیال کرتے ہیں کہ کمپنی لافانی ہے، اور یہ تبلیغ کرتے ہیں کہ یہ دنیا کی آخری رات تک باقی رہے گی جب آخری دیوتا دنیا کو معدوم کر دے گا۔ کسی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی قادر مطلق ہے لیکن اپنا اختیار محض ادنیٰ معاملات میں استعمال کرتی ہے جیسے ایک پرندے کی صدا، زنگ اور گرد کی دھندلاہٹیں، علی الصبح دکھائی دینے والے نیم خواب۔ نقاب پوش ملحدوں کا سرگوشیوں میں بیان کیا جانے والا ایک قیاس یوں ہے کہ کمپنی کبھی موجود ہی نہیں تھی اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔ کوئی ایسی ہی خباثت سے یہ دلیل دیتا کہ اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے کہ اس کمپنی کی حقیقت سے انکار یا اس کا اثبات کیا جائے، کہ بابل خود بھی اتفاق کے ایک لامحدود کھیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

# بابل کا کتب خانہ

اس فن کے ذریعے تم تئیس حروف کے فرق پر غور کر سکتے ہو۔
اداسی کا سائنسی تجزیہ، حصہ دوم، سیکشن II، یادداشت IV

یہ کائنات (جسے لوگ کتب خانہ کہتے ہیں) غیر متعین اور شاید لامحدود شش پہلوی راہ داریوں پر مشتمل ہے۔ ہر راہ داری کے وسط میں ہوا کے لیے کشادہ دریچے ہیں پستہ قد باڑوں میں گھرے ہوئے۔ کسی بھی شش پہلو سے بالائی اور زیریں منزلیں دیکھی جا سکتی ہیں، ایک کے بعد دوسری، نا مختتم۔ برآمدوں کی ترکیب ایک جیسی ہے۔ کتابوں کی بیس الماریاں، پانچ پانچ کے گروہوں میں شش پہلو کے چھ میں سے چار اطراف میں پھیلی ہوئیں۔ ان خانوں کی قامت جو فرش سے چھت تک ہے، عام منتظم کتب خانہ کے قد سے شاذ ہی کچھ بلند ہو۔

شش پہلو کی کھلی اطراف میں سے ایک راستہ تنگ ڈیوڑھی میں کھلتا ہے جو آگے ایک راہ داری سے جا ملتا ہے، پچھلے برآمدے سے مشابہ، بلکہ سبھی راہ داریوں سے مشابہ۔

ڈیوڑھی کے بائیں اور دائیں جانب دو بہت چھوٹی کوٹھڑیاں ہیں جن میں سے ایک میں کھڑے کھڑے سویا جا سکتا ہے اور دوسری بیت الخلا ہے۔ اس جگہ بھی ایک چکر دار زینہ ہے جو نیچے اترتا اور پھر بلند ہو کر دور نکل جاتا ہے۔ ڈیوڑھی میں ایک آئینہ بھی ہے جو بہت ایمان داری کے ساتھ سامنے موجود ہر شے کا عکس پیش کرتا ہے۔ لوگ عموماً اس آئینے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں

کہ کتب خانہ لامحدود نہیں ہے (اگر واقعی ایسا ہوتا تو پھر اس التباسی نقش ثانی کا مطلب؟) میں یہ خواب دیکھنے کو ترجیح دیتا ہوں کہ اس کی چمکدار سطح لامحدودیت کی نمائندگی اور اس کا وعدہ کرتی ہے۔ روشنی کسی دائروی پھل سے نکلتی ہے جسے لیمپ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر شش پہلو میں یہ دو دو لیمپ آڑے ترچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان سے پھوٹنے والی روشنی ناکافی مگر مسلسل ہے۔

کتب خانے کے دیگر افراد کی طرح میں نے بھی اپنی جوانی میں سفر کیا۔ میں ایک کتاب کی تلاش میں بھٹکتا پھرا، شاید 'فہرست الفہرست' کی تلاش میں۔ اب جب کہ میری آنکھیں بمشکل ہی وہ کچھ پڑھ پاتی ہیں جو میں لکھتا ہوں، میں اس شش پہلو سے چند میل کے فاصلے پر اس جگہ مرنے کی تیاری کر رہا ہوں جو میری جائے پیدائش ہے۔ میں مر گیا تو ایسے مہربان ہاتھوں کی کمی نہیں ہے جو مجھے باڑ کے اوپر سے پرے پھینک دیں گے۔ میری قبر بے پناہ گہری 'ہوا' ہوگی۔ میرا جسم مدتوں ڈوبتا رہے گا اور میرے گرنے کے عمل سے، جو لامحدود ہے، پیدا ہونے والی ہوا میں یہ شکستہ ہوتا اور گلتا سڑتا رہے گا۔

میں اعلان کرتا ہوں کہ کتب خانہ لامحدود ہے۔ تصوریت پسندوں کا کہنا ہے کہ یہ شش پہلوی کمرے، مطلق خلا یا کم از کم خلا سے متعلق ہمارے وجدان کی بنیادی شکلیں ہیں۔ وہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ ایک مثلثی یا پنج اضلاعی کمرہ قابل تصور نہیں ہے۔ (سریت پسند دعوی کرتے ہیں کہ ان کی حالت جذب ان پر ایک دائروی حجرے کا انکشاف کرتی ہے جس میں ایک عظیم الجثہ دائروی کتاب موجود ہے جس کا پشتہ مسلسل ہے اور دیواروں کے مکمل دائرے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ لیکن ان کا بیان مشکوک ہے۔ ان کے الفاظ مبہم ہیں۔ یہ دائروی کتاب خدا ہے۔) فی الوقت اس کلاسیکی مقولہ کو دہرانا کافی ہوگا کہ ''کتب خانہ ایک دائرہ ہے جس کا درست مرکز اس کے شش پہلوؤں میں سے کوئی ایک ہے اور جس کا قطر ناقابل رسائی ہے۔''

ہر شش پہلو کی دیواروں میں کتابوں کے پانچ خانے ہیں۔ ہر خانے میں ایک جیسی ساخت کی بتیس کتابیں ہیں۔ ہر کتاب چار سو دس صفحوں پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں چالیس سطریں ہیں، اور ہر

سطر میں تقریباً اسّی سیاہ الفاظ ہیں۔ ہر کتاب کے سرورق پر الفاظ درج ہیں۔ یہ الفاظ پہلے سے کچھ اشارہ یا نشان دہی نہیں کرتے کہ اندر صفحوں میں کیا لکھا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ عدم موافقت کبھی انسانوں کو پراسرار معلوم ہوتی تھی۔ اس اسرار کا حل پیش کرنے سے پہلے (جس کی دریافت، اس کے الم ناک نتائج کے باوجود، شاید مجموعی تاریخ کی سب سے اہم حقیقت ہے۔) میری خواہش ہے کہ چند مقولے دہراؤں۔

سب سے پہلا تو یہ کہ کتب خانہ ہمیشہ سے موجود ہے۔ اس صداقت پر، جس کا فوری منطقی نتیجہ دنیا کی ابدیت ہے، کوئی بھی سمجھدار انسان شک نہیں کرے گا۔ غیر پختہ ناظم کتب خانہ یعنی انسان، ہوسکتا ہے کسی اتفاق یا کسی بدخواہ دیوتا کا پیدا کردہ ہو۔ یہ کائنات، اپنے شان دار عجائبات کے ساتھ، جیسے کتابوں کے خانے، معماتی کتابیں، سیاحوں کے لیے نہ ختم ہونے والے زینے اور موجودہ ناظمین کتب خانہ کے لیے قائم شدہ بیت الخلا، کسی دیوتا ہی کا کمال ہوسکتے ہیں۔ خدا اور انسان کے درمیان موجود فاصلے کا ادراک کرنے کے لیے ان خام متذبذب استعاروں کا موازنہ، جنھیں میرے خطا کار ہاتھ ایک کتاب کے سرورق پر نقش کررہے ہیں، کتاب میں موجود قدرتی الفاظ سے کیا جانا کافی ہے۔ صاف ستھرے، نفیس، گہرے، اور بے مثال ہموار الفاظ۔

دوسرا مقولہ یہ ہے کہ لسانی صوتیات کے استعارے تعداد میں پچیس ہیں۔ (اصل مسودے میں اعداد اور جلی حروف نہیں ہیں۔ اوقاف کومے اور وقفے تک محدود ہیں۔ یہ دو اشارے، وقفہ اور حروف تہجی کے بائیس حروف مل کر پچیس استعارے بنتے ہیں جن کی طرف ہمارا یہ گمنام مصنف اشارہ کررہا ہے۔ مدیر کا نوٹ)

تین سو سال پہلے اس دریافت سے انسان کے لیے ممکن ہوا کہ کتب خانے کا ایک عمومی نظریہ وضع کیا جائے اور تسلی بخش انداز میں اس معمے کو حل کیا جائے کہ جس کے لیے کوئی قیاس کارآمد ثابت نہیں ہوسکا تھا، یعنی سبھی کتابوں کی بدوضع اور بے ڈھنگی ہیئت کا مسئلہ۔

ایک کتاب، جو میرے والد نے ایک شش پہلو میں 94-15 ویں دائرے میں دیکھی تھی، ان

حروف MCV سے مل کر بنی تھی، جنھیں پہلی سے آخری سطر تک بد سلیقگی سے دہرایا گیا تھا۔ ایک اور کتاب (جس سے اس علاقے میں بہت زیادہ رجوع کیا گیا) حروف کی بھول بھلیوں کے سوا کچھ نہیں تھی۔ لیکن جس کے آخری سے پہلے صفحے میں لکھا ہے کہ ''اوہ، وقت اہرام ہے۔''

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ہر معقول سطر یا راست بیان بے معنی صوتیات، لفظی لغویت اور بے ربط الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ (میں ایسے گنوار خطے سے آگاہ ہوں جہاں منتظمین کتب خانہ کتابوں میں معانی تلاش کرنے کی بے سود اور سطحی روایت سے انکار کرتے ہیں اور اسے خوابوں یا انسانی ہتھیلی کی منتشر لکیروں میں معانی تلاش کرنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ تحریر کے موجدوں نے پچیس قدرتی استعاروں کی نقالی کی لیکن یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ یہ اطلاق اتفاقی تھا اور یہ کہ کتابیں معانی کی حامل نہیں ہوتی ہیں۔ یہ رائے جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ مکمل طور پر غلط بھی نہیں ہے۔)

بہت برسوں تک یہ مانا جاتا رہا کہ یہ ناقابل فہم کتابیں ماضی کی یا دور دراز علاقوں میں بولی جانی والی زبانوں سے میل کھاتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انتہائی قدیم انسان، یعنی اولین ناظمین کتب خانہ ہماری موجودہ زبان سے یکسر مختلف زبان استعمال کرتے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دائیں سمت چند میل کے فاصلے پر زبان ایک مختلف بولی میں بدل جاتی ہے اور یہ کہ اوپر نوے منزلوں کے فاصلے پر یہ ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔ میں پھر سے کہوں گا کہ یہ تمام باتیں درست ہیں لیکن غیر متغیر MCV پر مشتمل چار سو دس صفحے کسی زبان سے موافق نہیں ہو سکتے چاہے وہ کیسی ہی مقامی یا سادہ ہو۔

چند ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ ہر حرف اپنے سے اگلے حرف پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہ کہ اکہترویں صفحے کی تیسری سطر میں لکھے MCV کی قدر وہ نہیں ہے جو کسی دوسرے صفحے میں کسی جگہ ان حروف کی ہوگی۔ لیکن یہ مبہم نظریہ کبھی قبول عام حاصل نہیں کر سکا۔ چند احباب خفیہ لغت کے امکان کی بات کرتے ہیں۔ عام طور پر اس قیاس کو تسلیم کیا جاتا ہے، گو ان معانی میں نہیں جن میں اس کے

بنیاد گزاروں نے اسے وضع کیا۔

پانچ سو سال پہلے بالائی شش پہلوؤں کے سربراہ نے ایک ایسی کتاب دیکھی جو اگرچہ دوسری کتابوں جیسی ہی الجھی ہوئی تھی لیکن جس میں تقریباً ایک جیسی سطروں والے دو صفحے تھے۔ (اس سے پیشتر ہر تین شش پہلوؤں کے لیے ایک فرد متعین ہوتا تھا۔ خودکشی اور پھیپھڑوں کی بیماریوں نے اس تناسب کو تہس نہس کر دیا۔ ایک ناگفتہ بہ اداسی کی یاد یوں ہے کہ میں کبھی کبھار کئی کئی راتیں برآمدوں اور پالش زدہ سیڑھیوں میں گھومتے گزار دیتا ہوں کسی بھی ناظم کتب خانہ سے مڈبھیڑ ہوئے بغیر۔)

اس ناظم کتب خانہ نے اپنی دریافت مشکل عبارتیں پڑھنے والے ایک جہاں گشت ماہر کو دکھائی جس نے اسے بتایا کہ وہ سطریں پرتگیزی زبان میں تحریر کی گئی تھیں۔ دوسروں نے اسے یدش زبان قرار دیا۔ ایک صدی کے اندر اندر ماہرین نے اندازہ لگا لیا کہ وہ زبان کون سی تھی۔ سمویدی قوم کی گورانی زبان کی ایک لیتھوِنی بولی، جس کا جھکاؤ کلاسیکی عربی زبان کی طرف تھا۔ متن بھی پڑھ لیا گیا: اتصال پذیر تجزیے کے چند نظریے جو لامحدود دہرائی کے عمل کے ساتھ تبدیلی کی چند مثالوں سے آراستہ تھے۔

ان مثالوں نے اس فطین ناظم کتب خانہ کے لیے یہ ممکن بنایا کہ وہ کتب خانے کا بنیادی قانون دریافت کر لے۔

اس مفکر نے غور کیا کہ سبھی کتابیں چاہے وہ ایک دوسرے کتنی ہی مختلف ہوں، ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ پھر بھی مماثل عناصر سے متشکل ہوئی ہوں۔ وقفہ، فاصلہ، علامت وقف، بائیس حروف تہجی۔ اس نے ایک اور حقیقت کی بھی نشان دہی کی جس کی تصدیق سبھی سیاحوں نے کی کہ 'سارے کتب خانے میں کوئی دو کتابیں ایک سی نہیں ہیں۔' ان دو غیر متنازعہ مفروضوں سے اس نے یہ اخذ کیا کہ کتب خانہ مکمل ہے، بے عیب، جامع اور بھرپور۔ اور یہ کہ اس کی الماریوں میں لسانی صوتیات کے بیس عجیب اشاروں کی سبھی ممکنہ ترکیبیں موجود ہیں (یہ بیس کا عدد اگرچہ غیر معمولی طور پر وسیع ہے

لیکن لامحدود نہیں ہے )۔ بالفاظ دیگر وہ سبھی کچھ جس کا اظہار کسی بھی زبان میں ممکن ہے۔

سبھی کچھ، مستقبل کی تفصیلی تاریخ، اعلیٰ تر فرشتوں کی سوانح عمریاں، کتب خانے کی درست اور لاکھوں غلط فہرستیں، ان غلط فہرستوں کے اسقام کا ثبوت، درست فہرست کی اغلاط کا ثبوت، باسیلائیڈز کی غناستی انجیل، اس انجیل کی شرح، اس انجیل کی شرح کی شرح، آپ کی موت کی سچی کہانی، تمام زبانوں میں ہر کتاب کا ترجمہ، تمام کتابوں میں ہر کتاب کی تحریفات، سیکسون لوگوں کی دیومالا پر ایک مقالہ جسے سینٹ بیڈ لکھ سکتا تھا (لیکن اس نے نہیں لکھا)، اور ٹیسیٹس کی گم شدہ کتابیں۔

جب یہ اعلان کیا گیا کہ کتب خانے میں سبھی کتابیں موجود ہیں تو پہلا تاثر غیر معمولی مسرت کا تھا۔ لوگوں نے خود کو ایک بڑے اور خفیہ خزانے کا مالک تصور کیا۔ کوئی ایسا ذاتی یا دنیاوی مسئلہ نہیں تھا جس کا ایک شاندار حل کسی شش پہلو میں موجود نہ ہو۔ کائنات کو اس کا جواز مل گیا۔ کائنات نے اچانک انسانی امید کی لامحدود وسعتوں سے موافقت پیدا کر لی۔ اس دور میں تب ایک 'مجموعہ برات' کا بہت چرچا ہوا۔ معذرت اور پیشین گوئی پر مشتمل کتابیں جو دنیا میں ہر انسانی فعل کو ہمیشہ کے لیے با جواز ثابت کر دیں گی اور جو انسانی مستقبلوں کے لیے زبردست اسرار کی حامل تھیں۔

ہزاروں حریصوں نے اپنے آبائی شش پہلوؤں کو خیر آباد کہا اور بالائی یا زیریں منزلوں میں اپنی اپنی کتاب برات تلاش کرنے کی بے کار خواہش میں ہر طرف بکھر گئے۔ یہ زائرین تنگ برآمدوں میں باہم الجھ پڑتے، ایک دوسرے کو سنگین بددعائیں دیتے، الوہی زینوں میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے، گمراہ کن کتابیں انھوں نے کھلے دریچوں سے باہر اچھالتے ہوئے، دور دراز خطوں کے باسیوں کی طرف سے بھیجی گئی موت سے ہم کنار ہوئے۔

باقی زائر دماغی توازن کھو بیٹھے۔ 'مجموعہ ہائے برات' واقعی موجود ہیں (میں ان میں سے دو کے بارے میں جانتا ہوں جو مستقبل کے انسانوں سے متعلق ہیں۔ ایسے انسان جو شاید فرضی نہیں ہیں۔) لیکن جو ان کی جستجو میں نکلے وہ یہ بات یاد نہیں رکھ پائے کہ اپنی کتاب برات یا اس کی کسی

نقلی کاپی کو پالینے کا امکان صفر ہی نکلتا ہے۔

اسی دور میں یہ امید بھی کی جاتی تھی کہ انسانیت کے بنیادی اسراروں جیسے کتب خانے اور وقت کے آغاز کے بارے میں انکشاف کیا جاسکتا ہے۔ یہ امکان بھی بہر طور موجود ہے کہ یہ گہرے اسرار لفظوں میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اگر فلاسفہ کی زبان کافی نہ ہو تو یہ ممکن ہے کہ کثیر الاشکال کتب خانے نے حسب ضرورت غیر معمولی زبان اختراع کی ہوگی، اس کی لغت الفاظ اور صرف و نحو کے ساتھ۔

چار صدیوں تک انسان شش پہلوؤں کو کھنگالتے رہے۔ وہاں سرکاری تحقیق کار بھی ہیں، جانچ کار بھی۔ میں نے انھیں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اپنے سفر سے تھکے ہارے لوٹتے اور ایک شکستہ زینے کی بات کرتے ہیں جن پر وہ مرتے مرتے بچے تھے کہ ان میں چند سیڑھیاں غائب تھیں۔ وہ ناظم کتب خانہ سے راہ داریوں اور سیڑھیوں کے بارے میں گفتگو کرتے اور کبھی کبھار قریب ہی پڑی کسی کتاب کو اٹھا لیتے اور اس کی ورق گردانی کرتے، غیر مہذب اور بدنام الفاظ کی تلاش میں۔ ظاہر ہے کچھ ملنے کی امید کے بغیر۔

جیسا کہ قدرتی تھا بے جا امید نے انتہائی مایوسی کے لیے راہ ہموار کی۔ یہ حقیقت، کہ کسی شش پہلو کی کسی ایک الماری میں ایسی گراں قدر کتابیں موجود تھیں جو ہمیشہ ناقابل رسائی رہیں، ناقابل برداشت معلوم ہوتی تھی۔ ایک کفریہ مسلک نے تجویز پیش کی کہ تحقیقات کو روک دینا چاہئے اور یہ کہ تحقیق کاروں کو ان حرفوں اور اشاروں کو آپس میں گڈمڈ کرتے رہنا چاہئے حتی کہ کسی بعید از قیاس اتفاق کے نتیجے میں یہ کلیسائی کتابیں متشکل ہو جائیں۔ حکام پر زور ڈالا گیا کہ وہ اس ضمن میں سخت احکامات جاری کریں۔ مسلک باقی نہیں رہا لیکن بچپن میں مجھے ایسے بوڑھوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، جو پانسہ پھینکنے والے ممنوعہ پیالے میں دھاتی گول قرص ڈالے دیر تک بیت الخلا میں چھپے رہتے اور مدھم انداز میں الوہی بدنظمی کا مذاق اڑاتے۔

اس کے بالکل برعکس کچھ کا خیال تھا کہ سب سے پہلے تو ہمیں ان بے کار کتابوں کو تلف کر دینا

چاہیے۔ وہ شش پہلوؤں میں داخل ہوتے، تصدیق نامے دکھاتے جو ہمیشہ غلط نہیں ہوتے تھے، حقارت کے ساتھ کسی کتاب کے صفحے پلٹتے اور کتابوں کے ڈھیر رد کر دیتے۔ ان کے اسی مثبت، نفس کشانہ جنون کے باعث ہم لاکھوں کتابوں کی بے معنی تباہی سے دوچار ہوئے۔ اب انھیں مطعون قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس جنون کی وجہ سے تباہی سے ہم کنار ہونے والے خزانوں پر کف افسوس ملنے والے دو اہم حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کتب خانہ اتنا وسیع ہے کہ انسانی عنصر کی کمی سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوسری بات یہ کہ ہر کتاب منفرد اور بے بدل ہے، (چوں کہ کتب خانہ مکمل ہے) وہاں ہمیشہ ان کی کئی لاکھ ناپختہ نقلیں موجود رہتی ہیں۔ ایسی کتابیں جن میں بس ایک حرف یا ایک علامت وقف ہی کا فرق ہوتا ہے۔

عمومی رائے کے برعکس میں یہ فرض کرتا ہوں کہ ان طہارت پسندوں کی لائی ہوئی تباہی کے نتائج اس خوف کی وجہ سے کئی چند ہوئے جسے ان جنونیوں نے پھیلایا تھا۔ انھیں ان تھک کوشش سے گہرے سرخ شش پہلو کی کتابوں تک رسائی حاصل کرنے کے الوہی جوش نے تحریک دی تھی۔ کتابیں جن کا حجم عمومی کتابوں سے چھوٹا ہے، لیکن وہ بہت طاقت ور، باتصویر اور طلسماتی ہیں۔

ہمیں اسی دور کے ایک اور توہّم سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے یعنی کتابی انسان پر ایمان۔ کسی شش پہلو میں (لوگوں کا خیال ہے کہ) کسی الماری میں ایسی کتاب موجود ہے جو باقی سبھی کتابوں کا بنیادی اصول اور مکمل خلاصہ ہے۔ کوئی ناظم کتب خانہ ایسا ہوگا جس نے اسے پڑھا ہو۔ وہ ناظم کتب خانہ خدا کا درجہ رکھتا ہے۔ اس علاقے کی زبان میں اس قدیم مسلک کے چند آثار ہنوز موجود ہیں جس کے پیروکار اسی غیر معلوم ناظم کتب خانہ کی پوجا کرتے تھے۔ بہت سوں نے اس کی تلاش میں مختلف علاقوں کی خاک چھانی۔ ایک صدی انھوں نے ہر ممکن کھوج کی جو بے سود ثابت ہوئی۔ کیسے کوئی اس مقدس خفیہ شش پہلو کا مقام جان سکتا تھا جس میں وہ موجود ہو؟

کسی نے ایک رجعت پسندانہ طریقہ کار تجویز کیا۔ کتاب A کو تلاش کرنے کے لیے پہلے کتاب B سے رجوع کیا جائے جو کتاب A کے مقام کی نشان دہی کر سکتی ہے۔ یوں کتاب B کا

مقام تلاش کرنے کے لیے کتاب C سے رہنمائی حاصل کی جائے، اور اسی طرح یہ سلسلہ لامحدود انداز میں جاری رہے گا۔

اس طرح کی مہمات تھیں جن میں میں نے اپنے بہت سے برس بے کار گزارے اور ضائع کر دیے۔ مجھے یہ بات خلاف توقع نہیں لگتی کہ کائنات کی کسی الماری میں کوئی مکمل کتاب موجود ہو (میں اپنی بات دہراتا ہوں کہ کسی کتاب کے موجود ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ایسا ممکن ہے۔صرف ناممکن ہی زیر بحث نہیں آتا۔ مثال کے طور پر کوئی کتاب ایسی نہیں جو ایک زینہ بھی ہو۔ حالاں کہ بلاشبہ ایسی کتابیں موجود ہیں جو اس امکان پر بات کرتی، اسے رد یا ثابت کرتی ہیں۔اور ایسی کتابیں بھی ہیں جن کی ہیئت کائنات کے کسی خانے میں ایک زینے سے موافق ہے۔)

میں ان جانے دیوتاؤں سے دعا کرتا ہوں کہ کوئی انسان، کوئی سا بھی ایک انسان ایسا ہو، چاہے ہزاروں سال پہلے، ایسا گزرا ہو، جس نے اس کتاب کو دیکھا اور پڑھا ہو۔ اگر اسے پڑھنے کی سعادت، اور دانش اور مسرت میرے مقدر میں نہیں ہے تو کیوں نہ یہ دوسروں ہی کے حصے میں آئے۔ یعنی جنت موجود رہے چاہے میرا مقام جہنم ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے مجھے اذیت دی جائے، زدوکوب اور مسترد کیا جائے، لیکن کسی ایک لمحے میں کسی ایک انسان میں تمہارا عظیم کتب خانہ اپنا جواز حاصل کر لے۔

چند زندیق یہ رائے رکھتے ہیں کہ کتب خانے میں معقولیت کا نہیں، غیر معقولیت کا راج ہے اور یہ کہ معقولیت (چاہے عاجزانہ اور خالص ہم آہنگی) ایک تقریباً معجزانہ استثنا ہے۔ وہ (میں جانتا ہوں کہ) 'ایک پرجوش کتب خانے کے بارے میں بات کرتے ہیں جس میں ادھر اُدھر پڑی کتابوں سے متعلق مستقل طور پر یہ کھٹکا رہتا ہے کہ وہ دوسری کتابوں میں بدل جائیں گی اور وہ ہر شے کی توثیق کریں گے، ہر شے کی تردید بھی، اور سب اشیاء کو غلط ثابت کریں گی اور انھیں الجھا دیں گی، کسی مجنون اور خوف زدہ الہامی ہستی کی طرح۔''

یہ الفاظ جو نہ صرف بدنظمی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اس کی مثال بھی بنتے ہیں، وہ جیسا کہ ہم سب دیکھ سکتے ہیں کہ زندیقوں کے افسوس ناک مزاج اور مایوس کن جہالت کا بین ثبوت ہیں۔ کیوں کہ اگر چہ کتب خانے میں سبھی لفظی سانچے، اور پچیس لسانی صوتیاتی اشاروں سے پیدا ہونے والی متغیر صورتیں موجود ہیں لیکن کسی حتمی غیر معقولیت کی ایک بھی مثال موجود نہیں۔

یہ جاننا غیر ضروری ہوگا کہ میرے زیر انتظام متعدد شش پہلوؤں میں سب سے بہتر کتاب 'بل دار طوفانی گرج' ہے جب کہ دوسری کتاب 'چپکا ہوا آنکڑا' جب کہ ایک اور کتاب 'Axaxaxas mlo' ہے۔ یہ تراکیب بادی النظر میں غیر ہم آہنگ ہیں۔ لیکن بلاشبہ انھیں خفیہ تحریری یا تمثیلی قرات کی صورت میں بامعنی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ قرات، الفاظ کی تنظیم اور موجودگی کا یہ جواز، بذاتہ زبانی ہے اور ایک مفروضہ ہے جو پہلے سے کتب خانے میں موجود ہے۔ حروف کی کوئی ترکیب جو کوئی وضع کر سکتا ہے، ایسی نہیں ہے، مثال کے طور پر یہ ترکیب dhcmrlchtdj، کہ جس کی پیشین گوئی الوہی کتب خانے میں پہلے سے نہ کی گئی ہو اور کتب خانے کی ایک یا زائد زبانوں میں جس کا ایک زبردست مفہوم مضمر نہ ہو۔ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جسے ادا کیا جا سکتا ہو، اور جو نرم خوئی اور دہشت سے مملو نہ ہو، اور جو ان زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں کسی دیوتا کا طاقت ور نام نہ ہو۔

بولنا فضول تکرار لفظی کے مترادف ہے۔ یہ لاحاصل اور کثیر الالفاظ مراسلہ، لاتعداد شش پہلوؤں میں سے ایک شش پہلو کی پانچ الماریوں میں رکھی گئی تیس جلدوں میں سے کسی ایک میں موجود ہے۔ اور اس کا استرداد بھی۔ (ممکنہ زبانوں کی ایک خاص تعداد ایک جیسے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ ان میں سے چند ایک میں علامتی کتب خانہ درست تعریفات کا حامل ہے، "شش پہلوی برآمدوں کا ہمہ گیر، پائیدار نظام"۔ جب کہ کتب خانہ، ایک شے، روٹی، ہرم یا کوئی اور شے ہے، اور جو چھ الفاظ اسے بیان کرتے ہیں، وہ خود بھی مختلف تعریفات کے حامل ہیں۔ آپ جو مجھے پڑھ رہے ہیں، کیا آپ پر یقین ہیں کہ آپ واقعی میری زبان سمجھ رہے ہیں؟) منہاجی ترکیب نوع

انسانی کی موجودہ صورت حال سے میری توجہ ہٹا سکتی ہے۔ یہ یقین کہ ہر شے پہلے سے لکھی موجود ہے، ہمیں رد کرتا ہے یا ہمیں خیالی لگتا ہے۔

یہ یقین کہ ہر واقعہ پہلے سے لکھا جا چکا ہے، ہماری نفی کرتا یا ہمیں خیالی بنا دیتا ہے۔ میں ایسے علاقوں کے بارے میں جانتا ہوں جن میں نوجوان کتابوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور وحشیانہ انداز میں ان کے صفحات پر بوسہ دیتے ہیں حالاں کہ وہ اس کا ایک لفظ پڑھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ وباؤں، بدعتی تنازعوں اور سیر و سیاحت نے، جو ناگزیر طور پر راہ زنی میں بدل جاتی ہے، انسانی آبادی کو نابود کر دیا ہے۔ میرا یقین ہے کہ میں نے جن خودکشیوں کا ذکر کیا تھا، وہ آنے والے برسوں میں زیادہ ہو جائیں گی۔ شاید میرا بڑھاپا اور خوف مجھے گم راہ کر رہا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ نوع انسانی، ایک بے نظیر نوع حیات، ختم ہونے کے قریب ہے لیکن کتب خانہ باقی رہے گا، تاباں، تنہا، لامحدود، مکمل طور پر جامد، قیمتی کتابوں سے آراستہ، بے کار، ناقابل تغیر، خفیہ۔

میں نے ابھی لفظ 'لامحدود' لکھا۔ اس اسم صفت کا یہاں اضافہ میں نے کسی شوق خطابت کے تحت نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ سوچنا غیر منطقی نہیں ہے کہ دنیا لامحدود ہے۔ جو اسے محدود تصور کرتے ہیں، وہ یہ فرض کرتے ہیں کہ دور کسی علاقے یا علاقوں میں راہ داری اور سیڑھیاں اور شش پہلو امکانی طور پر ختم ہو جائیں گے۔ یہ بات یکسر لغو ہے۔ جو لوگ اسے لامحدود تصور کرتے ہیں، وہ یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ممکنہ کتابوں کی تعداد ایک حد رکھتی ہے۔ میں اس دیرینہ مسئلے کا یہ حل تجویز کرنے کی جرات کروں گا: کتب خانہ لامحدود اور دائروی ہے۔ اگر ایک ابدی سیاح کسی بھی سمت میں اس میں سفر کرے، تو لامحدود صدیوں کے بعد وہ دیکھے گا کہ وہی کتابیں اسی بدنظمی سے دہرائی جا رہی ہیں۔ یہ بدنظمی دہرائے جانے سے ایک نظام بن جاتی ہے۔ ایک اعلیٰ نظام۔

میری تنہائی اس شان دار امید سے شاداں ہو جاتی ہے۔ (لیٹیز یا الواریز ڈی ٹولیڈو نے مشاہدہ کیا کہ یہ وسیع تر کتب خانہ بے کار ہے۔ صاف کہا جائے تو ایک ہی جلد کافی ہوگی، کوئی بھی

عام حجم کی جلد، نو یا دس پوائنٹ سائز میں چھپی ہوئی، لامحدود طور پر پتلے صفحوں کی لامحدود تعداد پر مشتمل۔

سترھویں صدی کے اوائل میں کیولیری نے کہا کہ سبھی ٹھوس اجسام سطحوں کی لامحدود تعداد کا انبار ہوتے ہیں۔

اس ریشمی حوالہ جاتی کتاب کی دیکھ ریکھ آسان نہیں ہے۔ ہر اوپری صفحہ اس سے مشابہ دوسرے صفحوں میں کھلے گا۔ نا قابل تصور درمیانی صفحے کی کوئی عقبی جانب نہیں ہوگی۔)

# یہودا کے تین رُوپ

ایسا لگتا ہے زوال ہی یقینی ہے۔
ٹی ای لارنس، دانش کے سات ستون، CIII

ایشیائے کوچک یا سکندریہ میں، مسیحی عقیدے کی دوسری صدی میں جب بیسلا ئیڈز نے اس خیال کو عام کیا کہ کائنات ناقص فرشتوں کی غیر محتاط اور ناگوارہ مگر برجستہ تخلیق ہے، تب نلز رونبرگ عجیب دانشوارانہ جذبے کے ساتھ باطنیہ کی غیر قانونی مجالس میں سے ایک کی رہنمائی کر رہا ہوگا۔ دانتے نے شاید اس کے لیے آتشیں قبر تفویض کی ہوگی۔ اس کا نام سیٹورنیلس اور کارپوکریٹس کے درمیانی درجے کے بدعتیوں کی فہرست میں شامل ہوگا۔ اس کی تعلیمات کا کچھ حصہ، گالیوں سے مزین، غیر مستند 'Liber adversus mones haereses' کی صورت میں آئندہ نسلوں کے لیے بچ گیا یا خانقاہ کے کتب خانے کی آتش زدگی میں 'Syntagma' کی آخری جلد کے جل کر بھسم ہو جانے سے فنا ہو گیا ہوگا۔

اس کے باوجود خدا نے رونبرگ کو بیسویں صدی اور لنڈ کے یونیورسٹی ٹاؤن کی نعمت سے سرفراز کیا۔ وہاں 1904 میں اس نے Kristus och judas کا پہلا ایڈیشن شائع کیا اور 1909 میں اس کا سب سے اہم کام Den hemlige Farlsaren شائع ہوا۔ (اس آخری بچ رہنے والی باعنوان کتاب میں اس کا جرمن زبان میں ایک روپ موجود ہے۔ یہ ترجمہ 1012 میں ایمل شرنگ نے کیا جو Der keimliche Heiland کے نام سے چھپا۔)

مذکورہ کتابوں پر تنقید لکھنے سے پہلے اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ نیشنل ایونگ لیکل یونین کا رکن نلز رونبرگ ایک کٹر مذہبی انسان تھا۔ پیرس یا حتی کہ بیونس ایریز کے علمی حلقے میں کوئی اہل علم رونبرگ کے تھیسز کو از سر نو دریافت کر سکتا ہے۔ یہ تھیسز، جو انھی حلقوں میں پیش ہوئے، غفلت یا بے حرمتی میں کی گئی معمولی اور بے کار کوششیں ہوں گے۔

رونبرگ کے لیے وہ الٰہیات کے بنیادی اسراروں کو آشکار کرنے کی کلید تھے۔ وہ تحقیق اور غور و فکر، تاریخی اور لسانیاتی تنازعے، افتخار، جشن اور دہشت کا موضوع تھے۔ انھوں نے اس کی زندگی کو باجواز بنایا اور اسے تباہی سے دوچار کیا۔ جنھوں نے اس مضمون کو پڑھا، ضرور یہ سوچیں گے کہ یہ صرف رونبرگ کے نتائج ہی پر مشتمل تھے، نہ کہ اس کے منطقی استدلال یا شواہد پر۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نتیجہ بلا شبہ ثبوت سے پہلے رونما ہوا۔ کون خود کو ایسی بات کا ثبوت تلاش کرنے کے جھنجھٹ میں ڈالے جس پر وہ یقین ہی نہیں رکھتا یا جس کی تبلیغ اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

'Kristus och judas' کے پہلے ایڈیشن پر یہ قابلِ فہم مقولہ درج ہے جس کے مفہوم میں رونبرگ نے اتنے بہت سے برسوں کے دوران بہت زیادہ اضافے کیے، 'کوئی ایک بات نہیں بلکہ وہ سبھی باتیں غلط ہیں جو تاریخ، یہودا آئز کیریٹ سے منسوب کرتی ہے۔' (ڈی کوئنسی، 1857)

اپنے کسی جرمن پیش رو ہی کی طرح ڈی کوئنسی نے یہ قیاس کیا کہ یہودا نے حکام سے یسوع مسیح کی مخبری اس لیے کی کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی نبوت کو آشکار کریں اور رومی آمروں کے خلاف وسیع تر پیمانے پر بغاوت کا آغاز ہو۔ رونبرگ اس ضمن میں ایک مابعد الطبیعاتی قسم کی دلیل پیش کرتا ہے۔ بہت مشاقی سے وہ یہودا کے فعل کے غیر ضروری پن پر زور دیتا ہے۔ اس کا مشاہدہ یہ ہے (جیسا رابرٹسن نے بھی کہا) کہ ایسے استاد کی نشان دہی کے لیے جو روزانہ عبادت گاہ میں تبلیغ کرتا اور ہزاروں لوگوں کے مجمع کے سامنے معجزے دکھاتا تھا، اس کے اپنے حواریوں میں سے کسی ایک سے غداری کرانا غیر ضروری تھا۔ لیکن واقعتاً ایسا ہی ہوا تھا۔

الہامی صحائف میں کسی غلطی کا تصور نا قابل تصور ہے۔لیکن یہ فرض کرنا تو اس سے بھی زیادہ نا قابل برداشت ہے کہ عالمی تاریخ کے اس انتہائی وقیع واقعہ میں ایک اتفاقی واردات رونما ہوئی۔ارگو، یہودا کی غداری اتفاقی نہیں تھی۔ یہ پہلے سے طے شدہ حقیقت تھی جسے نجات کے عمل میں پراسرار وقعت حاصل ہے۔رونبرگ اپنی دلیل جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ جب لفظ کی تجسیم ہوئی اور ذات باری تعالی سے یہ مکانی کیفیت میں داخل ہوا، یعنی ابدیت سے تاریخ میں، اور لامحدود مسرت اور سرور سے تبدیلی اور موت کی کیفیت میں وارد ہوا، تو ایسی قربانی سے موافق ہونے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایک انسان (بنی نوع انسان کی نمائندگی کرتے ہوئے) اسی درجہ کی قربانی دے۔

یہودا آئزیریٹ ہی وہ شخص تھا۔تمام حواریوں میں یہودا ہی تھا جس نے یسوع مسیح کی خفیہ الوہیت اور اعلی مقصد کو جان لیا۔لفظ اپنے استھان سے زیریں فانی درجے تک آیا۔ یہودا، اسی لفظ کا پیروکار، خود کو ایک مخبر کی سطح تک گرا سکتا (ایک ہولناک جرم جو بدنامی کی انتہا تک لے جا سکتا ہے۔) اور جہنم کی مستقل آگ میں غرق ہوسکتا تھا۔کم تر سطح ہی اعلی تر سطح کا آئینہ ہوتی ہے۔ زمین کی ساختیں آسمان کی ساختوں کے موافق ہیں۔ انسان کی جلد پر موجود دھبے نا قابل تغیر ترکیب کا نقشہ ہیں۔

یہودا ایک اعتبار سے یسوع مسیح ہی کا عکس تھا۔یہ ایک نتیجہ ہے جس سے چاندی کے تیس ٹکڑے اور ایک بوسہ حاصل ہوتا ہے، اس نتیجے سے رضا کارانہ موت راہ پاتی ہے، تاکہ الہامی مذمت کو زیادہ واضح انداز میں باجواز بنایا جا سکے۔یوں نلز رونبرگ اس معمے کو حل کرتا ہے جس کا نام یہودا ہے۔

سبھی مسلکوں کے الہیات کاروں نے اسے رد کیا۔لارز پیٹر انگسٹرم نے اسے اساسی وحدت کو نظر انداز کرنے کا الزام دیا۔ایکسل بورلیئس نے اسے ڈوسیٹسٹوں کی بدعت کو از سر نو جاری کرنے کا ملزم قرار دیا جو یسوع مسیح کے انسان ہونے سے انکار کرتے ہیں۔لنڈ کے کٹر بشپ

نے اسے سینٹ لیوک کی انجیل کے بائیسویں باب کی تیسری آیت سے اختلاف کے لیے مورد الزام ٹھہرایا۔

اس لعنت ملامت نے رونبرگ پر اثرات مرتب کیے۔ اس نے اس مطعون کتاب کو پھر سے لکھا اور اپنے نظریے میں ترمیم کی۔ اس نے الہیاتی پس منظر کے بیان کو اپنے حریفوں کے لیے چھوڑ دیا اور اخلاقی نوعیت کے الٹے سیدھے دلائل پیش کیے۔ اس نے تسلیم کیا کہ یسوع مسیح، جن کے پاس وہ سبھی قابل ذکر وسائل موجود تھے جو قادر مطلق کی ذات انھیں تفویض کر سکتی تھی، کو تمام انسانوں کی بخشیش کے لیے ایک انسان کی معاونت کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر اس نے ایسے ماہرین کو رد کیا جن کا خیال تھا کہ ہم ناقابل انکشاف غدار کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ حواریوں میں سے ایک تھا، ان میں سے ایک جنھیں آسمانی سلطنت کا اعلان کرنے، بیماروں کو شفا دینے، کوڑھیوں کو پاک کرنے، مردوں کو زندہ کرنے اور شیطانوں کی حوصلہ شکنی کے لیے منتخب کیا گیا تھا (میتھیو 10:7-8، لیوک 9:1)۔

ایسے شخص کے افعال، جسے بخشن ہار نے امتیاز عطا کیا ہو، ایسی انتہائی ہمدردانہ توجیہ کے سزاوار ہیں جو ہم سے ممکن ہو سکتی ہے۔ اس کے جرم کو لالچ پر محمول قرار دینا (جیسا کہ چند ایک نے جان 12:6 کا حوالہ دیتے ہوئے قرار بھی دیا ہے)، خود کو غیر اخلاقی مقصد کا تابع کر لینا ہے۔ نلز رونبرگ اس کے برعکس ایسا ہی ایک اعلی مقصد تجویز کرتا ہے، ایک غیر حقیقی، حتی کہ غیر محدود رہبانیت۔ ایک تارک الدنیا عظیم تر الوہی رفعت کے لیے اپنے جسم کو رد کرتا اور نفس کشی کرتا ہے۔ یہودا نے اپنی روح کو بے وقعت قرار دیا اور اسے رد کیا۔ اس نے عزت و افتخار، اچھائی، سکون اور آسمانی سلطنت کو رد کیا۔ دوسروں ہی کی طرح بھلے کم سورمائی انداز میں ہی سہی، اس نے مسرت کا انکار کیا۔ (بوریلئس مذاق اڑاتے ہوئے پوچھتا ہے، 'تو کیوں اس نے اس کی تردید کو رد نہیں کیا۔ یا کیوں تردید کی تردید کو رد نہیں کیا؟)

پوری صراحت کے ساتھ اس نے اپنے گناہوں کی پہلے سے منصوبہ بندی کر لی تھی۔

بدکاری میں عام طور پر لچک دار رویے اور تردید کے پہلو کارفرما ہوتے ہیں۔ انسانی قتل میں جرات، کفر والحاد اور توہین دین میں ایک طرح کا شیطانی جوش وخروش کارفرما ہوتا ہے۔ یہودا نے ایسے گناہوں کا انتخاب کیا جن کا کسی فضیلت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا جیسے بھروسے کا خاتمہ (جان 12:6) اور غداری۔ اس نے بے پناہ عاجزی کے ساتھ اس پر عمل درآمد کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایسا بے وقعت تھا کہ کبھی وقیع نہیں ہو سکتا تھا۔ پال نے لکھا، ''وہ جو عظیم تر تھا، اس نے اسے خدائی عظمت میں شامل ہونے دیا۔'' (کورنتھیئنز 1:31)۔ یہودا نے جہنم واصل ہونے کی خواہش کی کیوں کہ خدا کی خوش نودی جو اسے حاصل ہو چکی تھی، وہ اس کے لیے کافی تھی۔ اس نے سوچا کہ اچھائی کی طرح مسرت بھی ایک الہامی خصوصیت ہے جسے انسانوں سے دور ہی رکھنا چاہئے۔ (اقلیدس اپنی ایک کتاب میں، جس سے رونبرگ آگاہ تھا، لکھتا ہے کہ کینوڈوس کے بدعتی انتونیو کونسلہیرو کے نزدیک فضیلت ''لادینیت ہی ہے۔'' (ایک ارجنٹائنی قاری شاعر 'الما فیورتے' کی کتاب میں اس سے مماثل پیراگراف شناخت کرے گا۔)

ایک علامت پسند رسالے 'Sju Insegel' میں رونبرگ نے ایک جامع توضیحی نظم 'مخفی پانی' کے عنوان سے شائع کی۔ ابتدائی اشعار ایک ہنگامہ خیز دن کے واقعات کی روداد پیش کرتے ہیں جب کہ آخری بند میں ایک سرد تالاب کی دریافت کا ذکر ہے۔ شاعر تجویز کرتا ہے کہ ان خاموش پانیوں کی مستقل موجودگی ہمارے بے کار تشدد کی اصلاح کرتی ہے اور کسی حد تک اس کی گنجائش بناتی اور اسے جواز بھی فراہم کرتی ہے۔ نظم کا اختتام یوں ہوتا ہے: ''جنگل کے پانی مسرور ہیں۔ ہم برے اور اذیت میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔''

بہت سوں نے دریافت کیا کہ رونبرگ کی نظم کے بامعنی آغاز ہی میں اس کا غیر معمولی اختتام پنہاں ہے اور یہ کہ ڈین ہیملیگ فرالسرن محض 'کرسٹس اوچ یہودا' کی بگڑی ہوئی اور منتشر صورت ہے۔ 1907 کے اختتام کے قریب رونبرگ نے مسودہ مکمل کیا اور اس کے متن کی اصلاح کی۔ اس بات کو دو سال گزر چکے تھے جب اس نے اسے پرنٹر کو برائے اشاعت دیا۔ اکتوبر

1909 میں یہ کتاب ڈینش ہبریسٹ اریک ارفجورڈ کے (معماتی انداز میں بے دلی سے لکھے گئے) پیش لفظ اور اس کے اس غیر معتبر مقولے کے ساتھ شائع ہوئی: 'وہ دنیا میں موجود تھا۔ دنیا اسی نے تخلیق کی لیکن دنیا اس سے بے خبر تھی۔'' (جان 10:1) کتاب کا منطقی استدلال پیچیدہ نہیں ہے حالاں کہ اس کا نتیجہ غیر معمولی ہے۔ رونبرگ کہتا ہے کہ خدا انسانیت کی نجات کے لیے اپنی سطح سے نیچے جھکتا اور انسان بن جاتا ہے۔ ہم یہ گمان کرسکتے ہیں کہ اس کی قربانی مکمل تھی، نہ کہ اس کی کسی بھول کی وجہ سے ناجائز یا کم تر۔

اس کی اذیت کو اس ایک سہ پہر کے کرب تک محدود قرار دینا، بے حرمتی کے زمرے میں آتا ہے۔ اپنی کتاب 'Christelige Dogmatik' کے ضمیمہ III میں ارفجورڈ اس رائے کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کی تصلیب کا عمل ختم نہیں ہوا، کیوں کہ جو فعل ایک بار ہوا، وہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہودا چاندی کا سکہ پانے کے لیے ہاتھ پھیلاتا رہے گا، یسوع مسیح کے گال پر بوسہ دیتا رہے گا، عبادت گاہ میں چاندی کے سکے بکھیرتا رہے گا، خون کے میدان میں رسی میں گانٹھ لگاتا رہے گا۔ (ارفجورڈ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے جیرومر ہلادک کی کتاب 'ابدیت کا جواز' کی پہلی جلد کے آخری باب کا حوالہ دیتا ہے۔) یہ کہنا کہ یسوع مسیح انسان تھے اور یہ کہ گناہ ان سے سرزد ہو ہی نہیں سکتا، باہم متناقض ہے۔

کاملیت اور انسانیت باہم موافق خصوصیات نہیں ہیں۔ کمنز اعتراف کرتا ہے کہ بخشن ہارا تھکاوٹ، سردی، پریشانی، بھوک اور پیاس محسوس کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے بارے میں یہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ گناہ کرسکتا اور گمراہی کا شکار ہوسکتا ہے۔ بہت سوں کے لیے 'ایساہ 53: 3-2 کا یہ مشہور مقولہ ''وہ اس کے سامنے یوں پروان چڑھے گا، جیسے ایک نرم رو پودا اور جیسے خشک زمین سے باہر نکلتی ہوئی جڑ۔ نہ اس کی کوئی صورت ہے، نہ کوئی دلکشی۔ اور جب ہم اسے دیکھیں گے، تو کوئی خوب صورتی ایسی نہیں ہوگی جس کی ہم اس کے لیے خواہش کریں۔ وہ انسانوں میں مکروہ اور راندہ درگاہ ہے۔ غم زدہ انسان، دکھ سے آشنا۔'' نجات دہندہ کے مستقبل کا خاکہ پیش

کرتا ہے جو یسوع مسیح کو مصلوب کر کے شہید کیے جانے کی پیشین گوئی بھی ہے۔ دوسروں (مثال کے طور پر ہینز لیسن مارٹنسن) کے لیے ان سے مراد اس دل کشی سے انکار ہے جسے مسخ شدہ رائے کے مطابق یسوع مسیح سے منسوب کیا جاتا ہے۔ رونبرگ کے لیے وہ خصوصیات تفصیلی پیشین گوئیاں ہیں۔ وہ محض ایک لمحے کے لیے نہیں بلکہ زمان اور ابدیت کے تناظر میں یکسر ناخوش گوار مستقبل کی، مجسم ہونے والے لفظ کی پیشین گوئیاں ہیں۔

خدا نے خود کو مکمل طور پر ایک انسان کا روپ دیا لیکن ایک انسان جو بدنام ہے، ایک انسان جو قابل مذمت ہے اور جس سے کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ ہمیں بچانے کے لیے وہ ان میں سے کسی بھی ایک انسان کی صورت اختیار کرسکتا تھا جو تاریخ کے پیچیدہ جال کی تشکیل کرتے۔ وہ سکندر، یا فیثا غورث یا رورک یا یسوع مسیح ہو سکتا تھا۔ اس نے ارزل ترین وجود کو چنا۔ وہ یہودا بنا۔

بے کار ہی سٹاک ہوم اور لنڈ کے کتب خانوں نے عوام کے لیے اس الہام کو تجویز کیا۔ بے عقیدہ لوگوں نے اسے ایک قبل از تجربی، بے لطف اور دشوار الہیاتی کھیل قرار دیا۔ جب کہ ماہرین الہیات نے اسے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ رونبرگ نے اس کائناتی عدم دلچسپی کو ایک معجزاتی توثیق تصور کیا۔ خدا نے اس عدم دلچسپی کا فرمان جاری کیا تھا۔ خدا نہیں چاہتا تھا کہ اس کا ایسا سنگین راز سب پر آشکار ہو۔ رونبرگ نے سمجھ لیا کہ ابھی مناسب وقت نہیں آیا تھا۔

رونبرگ نے محسوس کیا کہ قدیم الوہی بددعائیں اس میں یکجا ہو گئی تھیں۔ اسے (حضرت) الیاس اور (حضرت) موسیٰ یاد تھے جنھوں نے پہاڑ پر اپنے چہروں کو اوٹ میں کر لیا تھا تا کہ وہ خدا کو نہ دیکھ پائیں۔ یسعیاہ اُسے دیکھ کر دہشت سے کانپ اٹھا جس کی عظمت و رفعت نے زمین کا احاطہ کر رکھا ہے۔ شاؤل، جس کی آنکھیں دمشق کو جاتے راستے میں بینائی سے محروم ہو گئی تھیں۔ ربی سائمون بن ازائی، جس نے بہشت کا نظارہ کیا اور مر گیا۔ معروف جادوگر وٹربو کا جان، جو تثلیث کے نظارے کو نہ سہار سکا اور حواس کھو بیٹھا۔ مڈراشم، جس نے ان گستاخوں کی

مذمت کی جو خدا کا خفیہ نام 'Shem Hamephorash' پکارتے تھے۔

کیا یہی وہ سنگین گناہ نہیں تھا جو رونبرگ سے سرزد ہوا؟ کیا یہ روح الامین کی بے حرمتی نہیں تھی، جسے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا؟ (میتھیو 12:31) ولیریس سورانس روم کا خفیہ نام افشا کرنے کے جرم کی پاداش میں ہلاک ہوا۔ تو خدا کا طاقتور نام دریافت اور افشا کرنے کے جرم کی رونبرگ کی سزا کیسی لامحدود ہوگی؟

بے خوابی اور پیچیدہ بولی میں غرق نلز رونبرگ مالمو کی گلیوں میں بھٹکتا پھرا، اونچی آواز میں بھیک مانگتا ہوا کہ اسے جہنم میں اپنے نجات دہندہ کے ساتھ شریک ہونے کا اعزاز بخشا جائے۔

وہ یکم مارچ 1912 کو دل کی بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہوا۔ بدعتی شاید اسے یاد رکھیں گے۔ خدائی بیٹے کے تصور میں، جو وقت کے بوجھ سے دبا ہوا تھا، اس نے شر اور بدقسمتی کی پیچیدیوں کا اضافہ کیا۔

# فونیقس کا مسلک

جولوگ فونیقس کے مسلک کا مبدا ہیلیو پولیس کو قرار دیتے ہیں اور یہ دعوی کرتے ہیں کہ مصلح امینوفس چہارم کی موت کے بعد پیدا ہونے والے مذہبی احیاء سے یہ مسلک متخرج ہوا، وہ ہیروڈوٹس اور ٹیسیٹس کی تحریروں اور مصر کے قدیم مخطوطات سے حوالے پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں، شاید جان بوجھ کر، کہ یہ مسلک ''فونیقس کا مسلک'' کی صورت میں ہرابنس مارس سے پہلے موجود نہیں تھا اور یہ کہ قدیم ترین مخطوطوں میں (مثال کے طور پر فلاویس جوزیفس کی کتاب Saturnales میں) صرف ''دستور کے پیروکاروں یا ''راز'' کے پیروکاروں کا ذکر ملتا ہے۔ گریگورویس نے فرارا کی خفیہ مذہبی مجلس گاہوں میں ملاحظہ کیا کہ عام گفتگو میں ''فونیقس'' کا لفظ شاذ ہی استعمال ہوتا۔ جنیوا میں مجھے ایسے دست کاروں سے بات کرنے کا موقع ملا جو تب میری بات بالکل نہیں سمجھ سکے جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ فونیقس کے ماننے والے تھے۔ لیکن یہ بات انہوں نے فوراً ہی مان لی کہ وہ ''راز'' کے پیروکار تھے۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ بات اسی انداز میں بدھ مت کے پیروکاروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی تھی۔ وہ نام، جس سے دنیا بھر میں ان کا چرچا ہے، وہ نہیں ہے جسے وہ خود اس مقصد کے لیے ادا کرتے ہیں۔

موکلوسش نے اپنی ایک تحریر میں، جسے بہت شہرت ملی، فونیقس کے فرقہ پرستوں کو خانہ بدوشوں کے مماثل قرار دیا ہے۔ چلی اور ہنگری میں خانہ بدوش بھی ہیں اور فرقہ پرست بھی۔ ان کی

اکثریت سے قطع نظر، ان دونوں میں اشتراک کی صورتیں نہایت کم ہیں۔ خانہ بدوش تاجر، ظروف ساز، لوہار اور قسمت شناس ہوتے ہیں۔ فونیقس کے ماننے والے عمومی طور پر آزاد پیشے کامیابی کے ساتھ اپناتے ہیں۔ خانہ بدوش مخصوص جسمانی ہیئت کے حامل اور ایک خفیہ زبان بولتے یا اسے بولنے کے عادی ہوتے ہیں۔ فرقہ پرست دوسروں سے علیحدہ شناخت نہیں ہو پاتے جب کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھیں کبھی اہانت آمیز رویے کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ خانہ بدوش دلآویز ہوتے ہیں اور اکثر برے شاعروں کو متاثر کرتے ہیں۔ گیتوں، گھٹیا تصویروں اور فوکس ٹروٹ ناچوں میں فرقہ پرستوں کا شاذ ہی ذکر ہوتا ہے۔۔۔۔

مارٹن ببر کا کہنا ہے کہ یہودی بنیادی طور پر غم پرست ہوتے ہیں۔ سبھی فرقہ پرست تو نہیں لیکن ان میں سے چند ایک غم پرستی سے خصوصاً نفرت کرتے ہیں۔ یہ عمومی اور معروف صداقت اس عمومی مغالطے کی بیخ کنی کے لیے کافی ہے (جس کا لغو انداز میں ارمان نے دفاع کیا) کہ فونیقس کے ڈانڈے اسرائیل سے جا ملتے ہیں۔

لوگ کم و بیش اس انداز میں دلیل دیتے ہیں کہ ارمان ایک ذکی الحس انسان تھا۔ ارمان ایک یہودی تھا۔ ارمان پراگ کے یہودی باڑوں میں فرقہ پرستوں سے مسلسل رابطے میں رہتا تھا۔ جس فطری ہم آہنگی کا ارمان نے وقوف کیا، وہ ایک حقیقی تعلق کو ثابت کرتی ہے۔ تمام تر احترام کے ساتھ میں اس مفروضہ سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ بات کہ صیہونی ماحول میں فرقہ پرست، یہودیوں سے مماثل دکھائی دیتے ہیں، کچھ بھی ثابت نہیں کرتی۔ یہاں ناقابل تردید بات یہ ہے کہ ہازلٹ کے لامحدود شیکسپیئر کی طرح، وہ دنیا کے سبھی انسانوں سے مشابہہ ہیں۔ وہ ہر کسی کے لیے ہر شے ہوتے ہیں، جیسے ہادی ہوتا ہے۔ چند دن پہلے پیسینڈو کے ڈاکٹر حوان فرانسسکو امارو نے ان کی اس صفت کی تحسین کی کہ کس سہولت سے وہ دوسروں میں ضم ہو جاتے اور کس آسانی سے خود کو فطرت کا حصہ بنا لیتے ہیں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ مسلک کی تاریخ میں کسی مذہبی سزا کا ذکر نہیں ہے۔ یہ سچ ہے لیکن چونکہ

کوئی ایسا انسانی گروہ موجود نہیں ہے جس میں مسلک کے اراکین کی نمائندگی موجود نہ ہو، سو یہ بھی سچ ہے کہ ایسی کوئی ایذا رسانی یا سختی نہیں ہے جس کے وہ شکار نہ ہوئے ہوں یا جس کا انھوں نے ارتکاب نہ کیا ہو۔ یورپی جنگوں یا دور دراز ہونے والی ایشیائی جنگوں میں مخالف فوجوں کے جھنڈے تلے صدیوں انھوں نے اپنا خون بہایا۔

کسی مقدس کتاب کے بغیر جو انہیں یکجا کرے جیسے الہامی صحائف نے اسرائیلیوں کو کیا، کسی عمومی یادداشت کے بغیر، یا کسی ایسی دوسری یادداشت کے بغیر جسے زبان کہتے ہیں، وہ دنیا کی چھاتی پر بکھرے ہوئے ہیں، اپنے رنگ اور نقوش میں متنوع۔ صرف ایک چیز 'راز' انہیں باندھ کر رکھے ہوئے ہے جو کائنات کے اختتام تک یونہی انھیں یکجا رکھے گا۔

کسی زمانے میں 'راز' کے علاوہ ان کے پاس ایک روایت بھی موجود تھی (غالباً نظریہ تخلیق سے متعلق ایک اسطورہ) لیکن فونیقس کے جاہل پیروکار اسے فراموش کر چکے ہیں اور اب تعزیر کی ایک مبہم اور موہوم روایت کے سوا ان کے پاس اور کچھ باقی نہیں بچا۔ ایک تعزیر، یا ایک عہدنامہ یا ایک استحقاق کی روایت، بیانات میں اختلاف ہے لیکن ان سے مبہم طور پر یہ ضرور دیکھا جا سکتا ہے کہ اس میں اس خدائی وعدے کی جھلک موجود ہے کہ ایک نوع انسانی کو حیات جاوداں ودیعت کی جائے گی اگر اس کے اراکین، نسل در نسل ایک خاص رسم ادا کرتے رہیں۔

میں نے سیاحوں کے بیانات سنے۔ مذہبی رہنماؤں اور ماہرین علم کلام سے مباحثے کیے۔ میں تصدیق کر سکتا ہوں کہ اس رسم کی ادائیگی ہی ایسی واحد مذہبی سرگرمی ہے جو اس فرقے کے لوگوں سے منسوب ہے۔ یہ رسم 'راز' ہے۔ یہ 'راز' جیسا کہ میں نے پہلے اشارتاً کہا ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا ہے۔ لیکن مذہبی روایت ماں کو باز رکھتی ہے کہ وہ اسے اپنے بچوں کو سکھائے، نہ ہی پروہتوں کو اس کی اجازت ہے۔ اس اسرار کی کھوج کرنا نیچ ذات کے لوگوں کا کام ہے۔ ایک غلام، ایک جزامی یا ایک گداگر، روحانی استاد کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ایک بچہ بھی دوسرے کو عقیدے کی تعلیم دے سکتا ہے۔

یہ عمل بذاتہہ ادنی ہے، ایک عارضی نوعیت کا معاملہ۔ نہ ہی اسے کسی تصریح کی ضرورت ہے۔اس کے لوازمات میں کاگ، موم یا گوند شامل ہوتی ہے۔(عشائے ربانی کی رسم میں کیچڑ کا ذکر ہے۔تالاب کا کیچڑ اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔)اس مسلک کی عبادات کے لیے کوئی معبد نہیں ہوتا۔خاص کھنڈرات، کوئی قید خانہ یا ایک داخلی ہال اس حوالے سے مناسب جگہیں تصور کی جاتی ہیں۔راز مقدس ہے لیکن اس سے یہ کسی حد تک مضحک ہونے کا بھی سزاوار رہا۔اس کی عبادت چھپ کر اور حتی کہ خفیہ انداز میں کی جاتی اور عبادت گزار کبھی اس کا تذکرہ نہیں کرتے۔ایسے مہذب الفاظ موجود نہیں ہیں جن سے اسے کوئی نام دیا جائے۔تاہم یہ سمجھا جاتا ہے کہ سبھی الفاظ اس کے نام ہیں یا پھر ناگزیر طور پر اسے کنایۃً بیان کرتے ہیں۔سو ہوسکتا ہے کہ گفتگو کے دوران میں کوئی بات کہوں اور پیروکار مسکرا دیں یا بے چین ہو جائیں کیوں کہ وہ محسوس کر لیتے ہیں کہ میں نے اس راز کو چھو لیا ہے۔

قدیم ٹیوٹنی زبان کے ادب میں اس مسلک کی پیروکاروں کی لکھی ہوئی نظمیں موجود ہیں جن کا عمومی موضوع سمندر یا شام کا جھٹپٹا ہوتا ہے۔ایک سے زائد مرتبہ میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ یہ نظمیں ایک اعتبار سے اسی 'راز' کے استعارے ہیں۔

"Orbis Terrarum est speculum Ludi" میں غیر مستند کہاوت بیان کی گئی ہے جسے ڈیو کانگی نے اپنی 'قاموس' میں رقم کیا۔ایک طرح کی مقدس دہشت چند باعقیدہ پیروکاروں کو اس سادہ رسم کی ادائیگی سے مانع رکھتی ہے۔باقی اراکین انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔لیکن وہ خود اپنے آپ سے اس سے بھی زیادہ نفرت کرتے ہیں۔دوسری طرف وہ لوگ جو عمداً اس رواج کا استرداد کرتے اور خدا سے براہ راست تعلق استوار کرتے ہیں، تحریم و تکریم کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ایسے لوگ خدا سے اس تعلق کے اظہار کی غرض سے اعشائے ربانی کی رسم سے لیے گئے ہند سے استعمال کرتے ہیں۔اسی لیے جان آف رُوڈ نے لکھا:

''سات آسمانوں سے سنو کہ خدا

اتنا خوشگوار ہے جتنا آگ اور پتلا کیچڑ''۔

میں نے تینوں براعظموں میں فونیقس کے کئی پیروکاروں سے دوستانہ مراسم قائم کیے۔ میں جانتا ہوں کہ 'راز' پہلے پہل انہیں پیش پا افتادہ، شرم ناک، فحش اور (جو بات سب سے عجیب ہے) غیر معتبر معلوم ہوا۔ وہ خود کو یہ یقین نہیں دلا پائے کہ ان کے والدین ایسے عجیب ضابطے کے اطاعت گزار تھے۔ انوکھی بات یہ ہے کہ 'راز' عرصہ دراز سے گم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ کائنات میں ہونے والی ناخوش گوار تبدیلیوں کے باوجود، جنگوں اور ہجرتوں کے باوجود، اپنے تمام تر عجب کے ساتھ یہ سبھی معتقدین تک پہنچتا ہے۔ کسی نے جرات مندی کے ساتھ یہاں تک دعوی کیا ہے کہ یہ اب جبلی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

# فیونز کی یاد میں

مجھے یاد ہے (ہر چند کہ مجھے یہ مقدس جملہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس روئے زمین پر صرف ایک ہی فرد یہ حق رکھتا تھا اور وہ مر چکا ہے۔) وہ اپنے ہاتھ میں گہرے رنگ کا گل صلیبی لیے، اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے کبھی دیکھا ہی نہ گیا ہو، جیسے وہ اسے صبح کے اجالے سے شام کے جھٹپٹے تک تمام عمر دیکھ سکتا ہو۔

مجھے یاد ہے، سگریٹ کے پیچھے اس کا کم سخن چہرہ، اس کے سرخ ہندیوں جیسے نقوش اور عجیب بے نیازی۔ (میرے خیال میں) مجھے یاد ہے اس کی چمڑے کو گوندھنے والی پتلی انگلیاں۔ مجھے یاد ہے ان ہاتھوں کے نزدیک ماتے کا پیالہ تھا، یوراگوئے کی ڈھال والا۔ مجھے اس کے گھر کی کھڑکی پر ٹنگا جھیل کے مبہم منظر والا زرد تنکوں والا اندھا پردہ بھی یاد ہے۔ مجھے اس کی آواز صاف یاد ہے، مدھم، خفگی بھری، مضافات میں طویل زمانوں سے رہنے والوں جیسی ناک سے نکلتی ہوئی، اطالوی انداز کی ان سسکاریوں کے بغیر، جیسی آج سننے کو ملتی ہیں۔

میں نے اسے تین ہی مرتبہ دیکھا۔ آخری مرتبہ 1887 میں۔ یہ بات قابل اطمینان ہے کہ جو کوئی اسے جانتا ہے، اس کے بارے میں ضرور لکھے گا۔ میرا بیان شاید مختصر ترین اور بلاشبہ کمزور ترین ہوگا لیکن اس کتاب میں جو آپ شائع کریں گے، یہ شاید غیر جانب دارانہ ہوگا۔ بدقسمتی سے میں ارجنٹائن کا باشندہ ہوں اور اس لیے پیدائشی طور پر اس جذباتیت کو ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہوں جو یوراگوئے کے لوگوں کی ایک لازمی خصوصیت ہے خاص طور پر جب آپ

یورا گوئے کے کسی باشندے کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔

نک چڑھا، خوش لباس، شہری شاطر انسان۔ فیونز نے کبھی ایسے زہریلے الفاظ استعمال نہیں کیے لیکن میں خاصے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اس کے لیے ان بری عادتوں کا نمائندہ ہوں۔ پیڈرو لینڈرو آئی پوچی نے لکھا ہے کہ فیونز فوق الفطرت انسانوں کا پیش رو تھا یعنی ایک 'مقامی اور ان گھڑ زردتشت'۔ میں اس معاملے میں کوئی رائے نہیں دوں گا لیکن ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ وہ چند نا قابل ترامیم حد بندیوں کے ساتھ فرے بینٹوس کا سخت جان انسان تھا۔

فیونز سے متعلق میری اولین یاد بہت واضح ہے۔ میں اسے 1884 کے مارچ یا فروری کے مہینے کی ایک سہ پہر کے پس منظر میں دیکھ سکتا ہوں۔ اس سال میرے والد گرمیاں گزارنے کے لیے مجھے فرے بینٹوس لے گئے۔ میں اپنے کزن برنارڈو ہیڈو کے ساتھ سان فرانسسکو کے جانوروں کے باڑے سے لوٹ رہا تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار خوشی سے گاتے ہوئے آرہے تھے ۔ ہماری خوشی کی وجہ صرف گھوڑوں پر سوار ہونا ہی نہیں تھی۔ ہوا درختوں کو بری طرح جھلا رہی تھی اور میں اس امید سے معمور تھا کہ زوردار بارش غیر متوقع طور پر ہمیں باہر ہی آلے گی۔ ہم نے ایک طرح سے طوفان کے ساتھ دوڑ لگا رکھی تھی۔

ہم ایک تنگ گلی کے نشیبی حصے میں داخل ہوئے تھے جو اطراف میں اینٹوں سے بنے اونچے راستوں کے درمیان گزرتی تھی کہ اچانک تاریکی چھا گئی۔ مجھے سامنے سے آتے ہوئے تیز مگر خاموشی سے اٹھائے جانے والے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا کہ ایک لڑکا اس اونچے تنگ اور شکستہ راستے پر یوں بھاگ رہا تھا جیسے کسی پتلی اور کمزور دیوار کے اوپر بھاگ رہا ہو۔ مجھے اس کی چرواہوں جیسی ڈھیلی چھوٹی پتلون جو اس نے پہنی ہوئی تھی، رسی کے تلووں والے جوتے، لامحدود طوفانی گھٹا کے سامنے اس کے ہونٹوں میں پھنسا ہوا سگریٹ یاد ہے۔ برنارڈو غیر متوقع طور پر چلایا۔ ''آئرنیو، کیا بجا ہے؟''

آسمان کی طرف دیکھے اور رُکے بغیر اس نے جواب دیا، ”آٹھ بجنے میں چار منٹ۔عزیزم برنارڈوحوان فرانسسکو۔“

اس کی آواز تیز تھی، اور چبھتی ہوئی۔

میری توجہ ایسی بٹی ہوئی تھی کہ اس مکالمے پر، جو میں نے ابھی بیان کیا، ذرا بھی دھیان نہ دے پاتا، اگر میرا کزن (میرے خیال میں) مخصوص مقامی افتخار اور یہ ظاہر کرنے کی خواہش کے تحت کہ وہ دوسروں کے سہ حرفی جوابات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، میری توجہ اس کی طرف مبذول نہ کراتا۔

اس نے مجھے بتایا کہ تنگ راستے میں ملنے والا لڑکا آئرنیو فیونز تھا اور یہ کہ وہ چند مخصوص عجیب عادات کی وجہ سے معروف تھا جن میں ایک تو دوسروں سے میل ملاپ سے اجتناب برتنا اور کسی گھڑی کی طرح ہمیشہ وقت کے بارے میں باخبر رہنا تھا۔اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ کپڑے استری کرنے والی عورت ماریا کلیمینٹینا کا بیٹا تھا اور یہ کہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کا باپ گوشت کو نمک لگانے والے مرکز میں ڈاکٹر (اوکونر نامی ایک انگریز) تھا۔کچھ کا کہنا تھا کہ وہ گھوڑے سدھانے والا یا سالٹو میں بیل گاڑی چلاتا تھا۔میرے کزن نے بتایا کہ فیونز لاس لاریلز کے ایک گھر کی نکڑ میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔

سن 85 اور 86 کی گرمیاں ہم نے مونٹی ویڈو میں گزاریں۔ 1987 میں ہی کہیں میں فرے بینٹوس دوبارہ جا سکا۔قدرتی طور پر میں نے اپنے سبھی واقف کاروں کے بارے میں استفسار کیا اور آخر میں گھڑی جیسے فیونز کے بارے میں بھی۔ مجھے بتایا گیا کہ سان فرانسسکو کے جانوروں کے باڑے میں ایک نیم سدھے ہوئے گھوڑے نے اسے زمین پر دے پٹخا تھا اور اب وہ فالج زدہ جسم کے ساتھ بے کسی کی حالت میں تھا۔ مجھے وہ ناگوار جادو جیسی حسیت اب بھی یاد ہے جو اس خبر نے مجھ میں بیدار کی تھی۔

ایک ہی بار میں نے اسے دیکھا تھا جب ہم سان فرانسسکو سے گھوڑوں پر سوار واپس

آرہے تھےاور وہ ایک اونچی جگہ پر بھاگ رہا تھا۔ یہ نئی خبر، جو میرے کزن برنارڈو نے سنائی تھی، مجھے ماضی کے واقعات کی آمیزش سے ایک خواب جیسی لگی۔ مجھے اطلاع دی گئی کہ وہ اپنے بستر سے نہیں اٹھتا۔ اس کی نظریں گھر کے عقبی حصے میں موجود انجیر کے درخت یا مکڑی کے جالے میں ٹکی رہتی تھیں۔ سہ پہر کے قریب اسے کھڑکی کے پاس بٹھا دیا جاتا تھا۔

وہ ایسا نخوت پسند نوجوان ہے کہ یوں ظاہر کرتا ہے جیسے یہ ہولناک حادثہ اس کے لیے سودمند تھا۔ دوسری مرتبہ میں نے اسے کھڑکی کی آہنی جالی کے پیچھے اپنے بستر پر دیکھا جو اس کی قیدیوں جیسی صورت حال کی سفاکی کو بڑھاتی تھی۔ پہلی بار دیکھا کہ بند آنکھوں کے ساتھ بالکل ساکت لیٹا ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی ویسی ہی ساکت حالت میں لیٹا اور ناگدون کی مہک دار ٹہنی پر توجہ جمائے ہوئے تھا۔ یہ بات خود کو اہمیت دینے کے جذبے سے تہی نہیں ہے کہ انھی دنوں میں نے لاطینی زبان کا باقاعدگی سے مطالعہ شروع کیا۔ میری پیٹی میں لومونڈ کی ' De viris illustribus'، کوئچرٹ کا تھیسارس، جولیس سیزر کی ناقدانہ آرا اور پلائنی کی طاق اعداد والی کتاب 'Naturalis historia' تھی جو لاطینی زبان میں واجبی مہارت ہونے کے باعث میرے لیے قابل فہم نہیں تھی (اور اب بھی ایسا ہی ہے۔)

ایک چھوٹے قصبے میں کوئی بات دوسروں سے چھپی نہیں رہتی۔ مضافات میں اپنے گھر میں رہنے والے آئیرنیو کو ان بدیسی کتابوں کی آمد کی اطلاع ملنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے مجھے ایک لچھے دار رسمی خط بھیجا جس میں اس نے '1884 کی فروری کے ساتویں دن' کی ہماری ملاقات کا ذکر کیا جو بدقسمتی سے مختصر تھی۔ اس نے مختصراً تعزیت کے انداز میں میرے انکل جارجیو ہیڈو، جو اسی برس فوت ہوئے تھے، کی گراں قدر خدمات کو سراہا جو انھوں نے 'آئی ٹیوزینگو' کی جرات آزما جنگ میں ہماری سرزمینوں کے لیے سرانجام دی تھیں، اور پھر ان کتابوں میں سے ایک کتاب مستعار لینے کی درخواست کی، ہمراہ لغت "تاکہ اصل متن مناسب طور پر سمجھ میں آسکے کیوں کہ لاطینی کی مجھے کوئی شد بد نہیں ہے۔"

اس نے وعدہ کیا کہ یہ کتابیں وہ اچھی حالت میں لوٹائے گا، تقریباً جلد ہی۔ اس کی لکھائی بہترین تھی، حروف واضح طور پر نکھرے ہوئے۔ املا وہی، ایڈریز بیلو کی تجویز کردہ یعنی y کی جگہ i، j کی جگہ g۔ پہلے واقعی مجھے لگا کہ یہ ایک مذاق تھا۔ میرے کزنز نے مجھے سمجھایا کہ ایسا نہیں تھا۔ یہ آئرنیو کی عجیب خصوصیات ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس بات کو میں گستاخانہ رویے پر محمول قرار دوں، یا جہالت یا حماقت پر کہ صبر آزما لاطینی کو سیکھنے کے لیے کوئی اور شے نہیں بس ایک لغت کافی تھی۔ فیونز کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے میں نے اسے کوئچرٹ کی' Gradus ad Parnassum' اور پلینی کی کتاب بھیج دی۔

فروری کی چودہ تاریخ کو مجھے بیونس ایریز سے ایک ٹیلی گرام وصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ میں فوراً گھر لوٹ آؤں کیوں کہ میرے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ 'خدا مجھے معاف کرے،' ایک ہنگامی ٹیلی گرام وصول کرنے کی خصوصی حیثیت، اور فرے بینٹوس کے رہائشیوں کو اس خبر کی منفی صورت اور اس کی حتمی صورت کے بیچ تضاد کو بیان کرنے کی خواہش اور اپنے دکھ کو گہری رواقیت پسندی کو بہانہ بنا کر ڈرامائی انداز میں بیان کرنے کی ترغیب نے مل کر شاید اصل دکھ کی شدت سے میری توجہ ہٹا دی۔

میں نے اپنی پیٹی سمیٹی تو محسوس کیا کہ ان کتابوں میں 'Gradus' اور 'Naturalis historia' کی پہلی جلد موجود نہیں تھی۔ بحری جہاز 'سیٹرن' کو اگلے دن صبح روانہ ہونا تھا۔ اسی رات کھانے کے بعد میں فیونز کے گھر کی طرف ہولیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ رات، گزرے ہوئے دن سے کہیں کم اُمس زدہ تھی۔

اس معزز چھوٹے گھر میں فیونز کی والدہ نے دروازہ کھولا۔ اس نے بتایا کہ آئرنیو پچھلے کمرے میں رہتا تھا اور مزید کہا کہ مجھے اس کو اندھیرے میں دیکھ کر حیران نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ اسے اپنا بے کار وقت روشنی کیے بغیر گزارنے میں لطف آتا تھا۔ میں نے ٹائلوں سے بنے صحن کو عبور کیا اور اس سے آگے چھوٹے دالان کے بعد اگلے مختصر صحن میں پہنچا۔ وہاں انگور کی بیل تھی۔ تاریکی

بہت گہری تھی۔ اچانک آئرنیو کی بلند آہنگ چبھتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ لاطینی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز (جو اندھیرے سے آرہی تھی) بے زار کن مسرت کے ساتھ تقریر کر رہی، یا دعا یا منتر پڑھ رہی تھی۔ رومن الفاظ اس سخت فرش والے صحن میں گونج رہے تھے۔ میرے خوف نے انھیں میرے لیے نا قابل فہم اور نا مختتم بنا دیا۔ بعد ازاں اس رات کے طویل مکالمے میں مجھے علم ہوا کہ وہ الفاظ پلینی کی کتاب 'Naturalis historia' کی ساتویں کتاب کے چوبیسویں باب کے اولین پیراگراف سے لیے گئے تھے۔ اس باب کا موضوع 'یادداشت' ہے۔ آخری الفاظ یوں تھے، "ut nihil non iisdem verbis redderetur auditum"۔

اپنی آواز معمولی سی بھی بدلے بغیر آئرنیو نے مجھے اندر چلے آنے کو کہا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا تھا، تمبا کو نوشی کرتے ہوئے۔ مجھے نہیں یاد کہ صبح سورج طلوع ہونے تک میں اس کا چہرہ دیکھ پایا ہوں گا۔ اب یاد کرتا ہوں تو یقین آتا ہے کہ اس کے سگریٹ کا وقفے وقفے سے جلتا شعلہ ہی بس یاد رہا۔ کمرے میں سیلن کی عجیب بُو پھیلی تھی۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے ٹیلی گرام اور میرے والد کی بیماری سے متعلق کہانی دہرائی۔ میں اب اپنی کہانی کے سب سے دشوار مقام تک پہنچ گیا ہوں۔ یہ کہانی جس کا سب سے اہم نقطہ (جیسا کہ مجھے قارئین کو شروع میں ہی بتا دینا چاہیے تھا) نصف صدی پہلے رونما ہونے والے اس مکالمے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں سبھی الفاظ پھر سے دہرانے کی کوشش نہیں کروں گا جو کہ اب یاد بھی نہیں آسکتے۔ اس کے بجائے میں پوری ایمان داری سے ان بہت سی باتوں کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا جو آئرنیو نے مجھ سے کیں۔

بالواسطہ مکالمہ غیریت بھرا اور کمزور ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اپنے بیان کی اثر انگیزی کی قربانی دینی ہوگی۔ میں چاہوں گا کہ میرے قارئین اپنے تخیل میں ان شکستہ اور جدا جدا دورانیوں کو خود ہی جمالیں جنھوں نے اس رات مجھے ششدر کیا۔ آئرنیو نے اپنے مکالمے کا آغاز 'Naturalis historia' میں درج غیر معمولی یادداشت سے متعلق واقعات کے لاطینی اور

ہسپانوی زبانوں میں بیان سے کیا۔ سائرس، ایرانیوں کا بادشاہ اپنی فوجوں میں ہر سپاہی کو اس کے نام سے جانتا تھا۔ میتھر یڈیٹس یوپیٹر نے اپنی سلطنت کی بائیس زبانوں میں قانون نافذ کیا تھا۔ سائمونیڈز، یادداشت کے علم کا بانی۔ میٹر ڈورس جو وہ سب کچھ ایمان داری کے ساتھ دہرا دینے کے اہل تھا جو اس نے سنا ہوتا، چاہے ایک بار ہی سہی۔ آئرنیو نے اس بات پر صدق دل سے حیرت کا اظہار کیا کہ ایسے واقعات کو حیران کن سمجھا جائے۔

آئرنیو نے بتایا کہ اس بارش والی سہ پہر سے پہلے جب نیلے بھورے گھوڑے نے اسے نیچے پٹخا، وہ ویسا ہی تھا جیسے سبھی انسان ہوتے ہیں، اندھا، بہرہ، کند ذہن اور واقعتاً یادداشت سے تہی۔ (میں نے وقت کے بارے میں اس کے درست اندازوں، اور خاص ناموں سے متعلق اس کی یادداشت کے بارے میں اسے یاد دلانے کی کوشش کی لیکن اس نے میری بات کو باعث اعتنا نہیں سمجھا۔) پھر بولا کہ وہ انیس برسوں سے کسی خواب کی کیفیت میں رہ رہا تھا۔ وہ دیکھے بغیر دیکھتا تھا، سنے بغیر سنتا تھا، ہر بات بھول چکا تھا، تقریباً ہر بات۔ جب وہ گھوڑے سے گرا تو بے ہوش ہو گیا۔ پھر ہوش میں آیا تو اس کا 'حال' بہت فراواں تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی اسے معلوم ہوا کہ وہ معذور ہو چکا تھا۔ اس بات کو اس نے معمولی سی بھی اہمیت نہیں دی۔ اس نے اس کی یہ وجہ پیش کی (یا محسوس کیا) کہ اس کی بے حرکتی وہ کم سے کم قیمت تھی جو دی گئی تھی۔ اب اس کا وقت سے متعلق ادراک اور اس کی یادداشت حتمی تھے۔

فوری مشاہدے سے ہم میز پر تین گلاسوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ فیونز ان سبھی انگوروں کا ادراک کر سکتا تھا جنھیں نچوڑ کر وائن بنائی گئی تھی اور سبھی ٹہنیوں اور بیلوں کا جو وائن بنانے میں استعمال ہوئیں۔ اسے یاد تھا 1882 کی اپریل کی تیس تاریخ کو صبح جنوبی آسمان پر بادلوں کی کیا شکلیں تھیں۔ اور وہ اپنی یادداشت میں ان شکلوں کا موازنہ ہسپانوی جلد بندی میں ایک کتاب پر کھنچی دھبے دار دھاریوں سے کر سکتا تھا جسے اس نے بس ایک ہی بار دیکھا تھا، اور اس جھاگ کی شکلوں سے کر سکتا تھا جو کیوبراچو کی جنگ سے پہلے ریونیگرو میں ایک چپو کی حرکت سے پانی میں پیدا

ہوئی تھیں۔

یہ یادیں سادہ نہیں تھیں۔ ہر بصری تصور، اعصابی حسیات، حراری حسیات سے جڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے سبھی خوابوں، اپنے سبھی نیم خوابوں کو، جو اس نے کبھی دیکھے پھر سے متشکل کر سکتا تھا۔ دو یا تین مرتبہ اس نے اپنے پورے دن کو پھر سے اپنی یاد میں متشکل کیا۔ اس میں کبھی اس سے غلطی نہیں ہوئی نہ کوئی دشواری محسوس ہوئی جب کہ ہر تشکیل میں مزید ایک دن صرف ہوا۔

اس نے مجھے بتایا، ''اس کے پاس اتنی یادیں ہیں جتنی تمام بنی نوع انسان کے پاس آفرینش حیات سے اب تک موجود ہوں گی۔''

پھر مزید بولا ''میرے خواب دوسروں کی بیداری کے لمحوں جیسے ہیں۔''

ایک اور موقع پر کہا، ''جناب میری یادداشت ایک کوڑے کے ڈھیر جیسی ہے۔''

بلیک بورڈ پر کھنچا ایک دائرہ، ایک درست مثلث، ایک شکل معین، یہ سب ایسی شکلیں ہیں جنھیں ہم خود بخود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آئرنیوا ایسا ہی سب کچھ ایک گھوڑے کی گردن کے بالوں، کسی پہاڑی پر موجود مویشیوں کے ریوڑ، متغیر آگ اور اس کی لاتعداد راکھ، کے ساتھ کر سکتا تھا۔ میں نہیں جانتا آسمان پر اس نے کتنے ستاروں کا مشاہدہ کیا تھا۔

یہ سب باتیں اس نے مجھے بتائیں۔ نہ تب اور نہ بعد ہی میں کبھی مجھے ان پر کچھ شک گزرا۔ ان دنوں سینما یا فوٹو گرافی موجود نہیں تھی۔ تاہم مجھے یہ بات ناقابل یقین بلکہ غیر معمولی معلوم ہوئی کہ کسی نے کبھی فیونز پر تجربہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اپنی زندگیاں اس سب کچھ کو ملتوی کرنے میں گزاری ہیں جنھیں ملتوی کیا جا سکتا تھا۔ شاید اندر ہی اندر ہم سب یقین رکھتے ہیں کہ ہم لافانی ہیں اور جلد یا بدیر سبھی انسان وہ سبھی کچھ کر لیں یا جان لیں گے جو وہ جان سکتے یا کر سکتے ہیں۔

تاریکی میں فیونز کی آواز مجھ سے مخاطب رہی۔ اس نے بتایا کہ 1886 میں اس نے اعداد کا اپنا ذاتی نظام وضع کیا تھا اور یہ کہ چند ہی دنوں میں وہ چوبیس ہزار کے عدد سے آگے بڑھ گیا

تھا۔ اس نے اسے کہیں لکھا نہیں کیوں کہ جو بات ایک بار وہ سوچ لے، وہ اسے کبھی بھولتی نہیں تھی۔ میرے خیال میں اس کام کی تحریک اسے اپنی اس پریشانی سے ملی ہوگی کہ یوراگوئے کی تاریخ کے معروف تیئیس کاڈبوائے چرواہوں کے لیے ایک لفظ اور اشارے کے بجائے دو الفاظ اور دو اشارے ہونے چاہئیں۔ اپنا یہ عجیب اصول اس نے دوسرے اعداد پر بھی لاگو کیا۔ سات ہزار تیرہ کے بجائے وہ (مثال کے طور پر) کہے گا میکسیمو پیریز۔ سات ہزار چودہ کی جگہ ریل کی پٹڑی کہے گا۔ دوسرے اعداد لوئیس میلئن لیفنر، اولیمر، گندھک، باگیں، وہیل مچھلی، گیس، ایک دیگ، نپولین، آگسٹین دی ویڈیا کہلائیں گے۔ پانچ سو کی جگہ وہ 'نو' بولے گا۔ ہر لفظ کی خاص ہیئت ہوتی ہے جو اس سے منسلک ہوتی ہے، ایک طرح کا نشان۔ یہ نشانات انتہائی پیچیدہ تھے۔

میں نے فیونز کو وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ غیر مربوط الفاظ پر مشتمل اس کی یہ رجز یہ نظم اعدادی نظام کے یکسر متضاد تھی۔ اسے بتایا کہ 365 کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سو تین مرتبہ، دس چھ مرتبہ، اور ایک پانچ مرتبہ۔ جب کہ یہ تجزیہ 'اعداد' کا نہیں کیا جا سکتا ہے جیسے نیگر ٹیموٹو یا گوشت کا ایک کمبل۔ فیونز میری بات نہیں سمجھا یا اسے سمجھنے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی۔

سترھویں صدی میں لاک نے ایک ناممکن زبان وضع کی (اور پھر رد کر دی) جس میں ہر انفرادی شے، ہر پتھر، ہر پرندے اور ہر شاخ کے لیے علیحدہ نام ہوگا۔ فیونز نے ایک بار ایسی ہی مماثل زبان کا نقشہ سوچا لیکن پھر اسے رد کر دیا کیوں کہ یہ بات اسے بہت عمومی لگی، بہت مبہم بھی۔ اصل میں فیونز کو نہ صرف ہر جنگل کے ہر گوشے میں ہر درخت کا ہر پتہ یاد تھا بلکہ یہ بھی کہ کتنی مرتبہ اس نے اسے دیکھا یا تصور کیا۔ اس نے اپنے ماضی کے ہر دن کو ستر ہزار یادوں تک گھٹانے کا فیصلہ کیا جنھیں وہ پھر اعداد کے ذریعے بیان کرے گا۔ دو طرح کی سوچوں نے اسے اس خیال سے باز رکھا، ایک تو یہ آگاہی کہ یہ کام لامختتم تھا، اور دوسرا یہ شعور کہ یہ لاحاصل بھی تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنی موت کے لمحے تک وہ بچپن کی یادوں کی ہی درجہ بندی نہیں کر پائے گا۔

یہ دونوں منصوبے، جن کی میں نے نشان دہی کی، (اعداد کے قدرتی سلسلے کی ایک

لامحدود لغت، اور فیونز کی یادداشت میں موجود سبھی شبیہوں کی ایک بے کار ذہنی فہرست ) احمقانہ، حتی کہ بیوقوفانہ ہیں لیکن ان سے مخصوص متزلزل رعب داب جھلکتا ہے۔ یہ ہمیں موقع دیتے ہیں کہ فیونز کی پیچ دار دنیا کی جھلک دیکھیں یا اس بارے میں کوئی اندازہ لگائیں۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ وہ عمومی، افلاطونی قسم کے تصورات کے اہل نہیں تھا۔ نہ صرف اس کے لیے یہی مشکل تھا کہ وہ یہ سمجھے کہ ایک عمومی استعارہ 'کتا' مختلف جسم اور ہیئت کے کتنے ہی کتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ بلکہ اسے یہ بات بھی پریشان کرتی کہ کسی سہ پہر کو ایک رُخ سے دکھائی دینے والے تین چودہ اعداد والے کتے کو اسی اسم سے پکارا جائے جس سے سامنے کے رخ سے دکھائی دینے والے کسی تین پندرہ اعداد والے کتے کو پکارا جاتا ہے۔ حتی کہ ہر بار آئینے میں دکھائی دینے والا اس کا اپنا چہرہ اور ہاتھ اسے حیرت میں مبتلا کرتے۔

سوئفٹ نے لکھا ہے کہ للی پُٹ کا شہنشاہ گھڑیال کی ننھی سوئیوں کی حرکات کا ادراک کرسکتا تھا۔ فیونز بھی بدعنوانی، دانتوں کے زوال، تھکاوٹ کی خاموش پیش رفت کا ادراک کرنے کے اہل تھا۔ اس نے موت اور سیلن کی پیش رفت کا مشاہدہ کیا۔ وہ کثیرالاشکال، لمحاتی اور تقریباً ناقابل برداشت حد تک واضح دنیا کا تنہا اور سادہ تماشائی تھا۔ بابل، لندن اور نیویارک نے اپنی جارحانہ شان وشوکت سے انسانی تخیل کو اپنا اسیر کیا۔ ان شہروں کے آباد میناروں یا اہم راستوں میں سے کسی نے اس حقیقت کی حدت اور دباؤ کو یوں نامختتم انداز میں محسوس نہیں کیا ہوگا جیسا جنوبی امریکہ کے خستہ حال مضافات میں اس بدقسمت آئرنیو نے دن رات اسے جھیلا۔ اس کے لیے نیند لینا مشکل تھی۔ سونے سے مراد اپنے ذہن کو دنیا سے ہٹالینا تھا۔

فیونز اپنے بستر پر پشت کے بل لیٹا اپنے کمرے کی تاریکی میں دیوار میں ہر درز اور اپنے اردگرد موجود واضح گھروں کے ہر سجاوٹی حاشیے کا تصور کرسکتا تھا۔ ( میں اپنی بات کو دہراتا ہوں کہ اس کی یادوں میں موجود سب سے کم اہم یاد بھی جسمانی تلذذ اور جسمانی تکلیف کے ہمارے احساس سے کہیں زیادہ تفصیلی اور واضح تھی۔ ) مشرق کی سمت ایک علاقے میں، جسے ابھی

بلاکوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا، چند نئے گھر تعمیر ہوئے تھے جن سے فیونز لاعلم تھا۔ اس نے اپنے طور پر تصور کیا کہ وہ سیاہ رنگ کے، پختہ اور باہم مماثل سایوں سے بنے تھے۔ وہ سونے کے لیے ان کی سمت چہرہ پھیر لیتا۔ وہ خود کو دریا کی تہہ میں تصور کرتا، اس کے بہاؤ کے زور پر بہتا اور ختم ہوتا ہوا۔

اس نے بغیر کسی کوشش کے انگریزی، فرانسیسی، پرتگیزی اور لاطینی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ مجھے شک ہے کہ فکری معاملات میں وہ بالکل پیدل تھا۔ سوچنے سے مراد اختلافات کو نظر انداز یا فراموش کرنا تھا، انھیں عمومی اور تجریدی صورت دینا تھی۔ فیونز کی گنجان آباد دنیا میں صرف جزئیات موجود تھیں۔ ایسی جزئیات جو اپنی نوعیت میں اہم ترین تھیں۔

صبح کی محتاط روشنی زمینی صحن میں داخل ہوئی۔ تبھی میں نے اُس آواز سے جڑا ہوا چہرہ دیکھا جو میں تمام رات سنتا رہا تھا۔ آئرینو صرف انیس سال کا تھا۔ وہ 1868 میں پیدا ہوا۔ وہ مجھے کانسی سے زیادہ شان دار، مصر سے زیادہ قدیم، پیشین گوئیوں اور اہراموں سے زیادہ عمر رسیدہ معلوم ہوا۔ اس خیال نے مجھے ششدر کیا کہ میرا کہا ہوا ہر لفظ، میرے چہرے کا ہر تاثر یا میرے ہاتھ کی ہر جنبش اس کی ناقابل تغیر یادداشت میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس خوف سے کہ کتنے بے ڈھنگے تاثرات ظاہر کیے ہوں گے، میرا دل بوجھل ہو گیا۔ آئرینو فیونز 1889 میں پھیپھڑوں میں بندش کی وجہ سے فوت ہوا۔

# نالائق

شہر کی شبیہ جو ہمارے ذہن میں ہوتی ہے، ہمیشہ کچھ فرسودہ ہوتی ہے۔ کیفے انحطاط کا شکار ہوکر ایک شراب خانے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ ڈیوڑھی، جو ہمیں صحن اور انگور کی بیل کی جھلک دکھاتی تھی، ایک مبہم برآمدے میں بدل چکی ہوتی ہے جس میں بہت نیچے جاتی ایک لفٹ بنی ہوتی ہے۔

یونہی سال ہا سال تک میں سوچتا رہا کہ کتابوں کی ایک خاص دکان 'لائبریریا بیونس ایریز'، 'کیلی ٹالکا ہیونو ایک خاص مقام پر میری منتظر ہوگی لیکن تب ایک صبح مجھے معلوم ہوا کہ نوادرات کی ایک دکان کتابوں کی دکان کی جگہ کھل گئی تھی اور مجھے بتایا گیا کہ کتابوں کی دکان کا مالک ڈان سانتیاگو فش بین مر چکا تھا۔

فش بین فربہ مائل شخص تھا۔ اس سے ہونے والی گفتگوؤں سے کہیں زیادہ اس کے خدوخال میری یادداشت میں دھندلے ہیں۔ حتمی مگر پرسکون انداز میں وہ صیہونیت کی مذمت کرتا۔ وہ کہتا کہ یہ مذہب یہودیوں کو عام انسانوں کی طرح ایک ہی روایت اور ایک ہی ملک سے جوڑتا اور ان پیچیدگیوں اور عدم مطابقتوں سے تہی کر دیتا ہے جو اب اسے آراستہ کیے ہوئے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے ایک بار مجھے بتایا کہ باروچ سپینوزا کی تحریروں کا ایک نیا ایڈیشن تیار کیا جا رہا تھا جو اس اقلیدسی منہاج کو ختم کر دے گا جو سپینوزا کی تحریر کو مشکل بنا دیتا اور حیران کن نظریے میں تخئی کا التباسی احساس پیدا کرتا ہے۔ فیش بین نے روزن روتھ کی کتاب ' Kabbala

'De-nudata' کی ایک عجیب نقل دکھائی (جسے اس نے بیچنے سے انکار کردیا) لیکن میرے کتب خانے میں گنز برگ اور ویٹ کی چند کتابیں موجود ہیں جن پر فیش بین کی مہر لگی ہوئی ہے۔

ایک سہ پہر جب ہم دونوں اکیلے تھے، اس نے مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنایا۔ آج میں اسے تمھیں سناتا ہوں۔ میں اس کی اتفاقی تفصیلات کو بدل دوں گا جس کی کہ توقع بھی کی جا سکتی ہے۔ میں آپ کو کچھ خاص بتانا چاہتا ہوں (فیش بین نے اپنا بیان یوں شروع کیا) کہ یہ بات میں نے کبھی کسی سے بیان نہیں کی۔ میری بیوی اینا بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی، نہ ہی میرے قریب ترین دوستوں کو اس کی کچھ خبر ہے۔ یہ واقعہ بہت سال پہلے ہوا تھا کہ اب یہ مجھے اپنا تجربہ معلوم نہیں ہوتا۔ شاید تمھیں یہ کسی کہانی کی بنت کاری میں مدد دے۔

بلاشبہ تم اسے چاقو کی لڑائی جیسا ہی کوئی واقعہ سمجھو گے۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے کبھی یہ ذکر کیا تھا کہ میرا تعلق اینٹر ریئوس سے ہے۔ میں نے تمھیں نہیں بتایا ہو گا کہ ہم یہودی چرواہے ہیں۔ وہاں کبھی یہودی چرواہے نہیں دیکھے گئے۔ ہم تاجر اور چھوٹے کسان تھے۔ میں اردینیرین میں پیدا ہوا جس کے بارے میں بہت کم مجھے اب یاد ہے۔ میرے والدین بیونس ایریز آئے تھے تاکہ یہاں ایک دکان کھولیں۔ میں تب چھوٹا سا بچہ تھا۔ مالڈونیڈو ہم سے چند بلاکس کے فاصلے پر تھا۔ اور پھر آگے خالی پلاٹس تھے۔

کارلائل نے لکھا ہے کہ انسانوں کو ہیروؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گروسو کی 'تاریخ' میں تجویز کیا گیا ہے کہ سان مارٹن ایسی پرستش کے لیے بہت موزوں تھا لیکن وہاں سان مارٹن میں میں نے یہی دیکھا کہ ایک سپاہی تھا جس نے چلی میں جنگ لڑی اور جواب ایک کانسی کے بت کی صورت میں تھا اور اس سے ایک پلازہ کو نام ملا۔ لیکن اتفاق نے ہم دونوں کی بدقسمتی سے مجھے ایک بہت مختلف قسم کے ہیرو سے ملایا یعنی فرانسسکو فراری سے۔ یہ غالباً پہلا موقع ہو گا کہ تم نے اس کا نام سنا ہو۔ ہمارے قرب و جوار کا علاقہ برا نہیں تھا جیسا لاس کورالیز اور ایل باجو کے بارے میں کہا جاتا تھا، لیکن ہر نکڑ میں پنساری کی دکان اور شراب خانے میں بدمعاشوں کا گروہ موجود تھا۔ فراری

ٹریون وراٹا اور تھیمز میں پایا جاتا تھا۔ وہیں یہ واقعہ ہوا جس نے مجھے اس کے پیروکاروں میں شامل کیا۔ میں وہاں ماتے کے لیے جڑی بوٹی خریدنے گیا تھا۔ لمبے بالوں اور مونچھوں والا ایک اجنبی وہاں آیا اور اس نے ایک جن کا آرڈر دیا۔

''تو کیا میں نے تمھیں خولیانہ کے رقص کی تقریب میں نہیں دیکھا'' فراری کی آواز ریشم جیسی ملائم تھی۔ ''تم کہاں سے ہو؟''

''سان کرسٹوبال سے'' دوسرے شخص نے جواب دیا۔

''تمھیں تمھاری بھلائی کے لیے بتاتا ہوں۔'' فراری اس سے بولا، ''تمھیں وہیں ٹھہرنا چاہئے۔ وہاں ایسے لوگ ہیں جو تمھیں آرام سے نہیں رہنے دیں گے۔''

سان کرسٹوبال سے آیا شخص چلا گیا، مونچھوں وغیرہ سمیت۔ وہ فراری سے کم جسیم مرد نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ سارا گروہ اس کے خلاف تھا۔

اس سہ پہر کے بعد سے فرانسسکو فراری ہی وہ ہیرو تھا جس کی تلاش میرا پندرہ سالہ دل کررہا تھا۔ اس کے سیاہ بال تھے اور وہ دراز قد اور خوش شکل تھا۔ اس زمانے کے مطابق دل کش۔ ہمیشہ سیاہ لباس میں ملبوس ہوتا۔ لیکن ایک دوسرا واقعہ ہوا جس نے ہمیں قریب کیا۔ میں اپنی والدہ اور آنٹی کے ساتھ جارہا تھا جب ایک گلی میں ہمارا ٹاکرہ چند لفنگوں سے ہوا جن میں سے ایک اونچی آواز میں دوسروں سے بولا، ''بوڑھی مرغیوں کو جانے دو۔ یہ گوشت اتنا مزے دار نہیں کہ اسے کھایا جائے۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ کیا کروں۔ لیکن فراری جو اس وقت اپنے گھر سے نکل رہا تھا، آگے بڑھا۔ وہ اس لفنگے کے روبرو آیا جس نے یہ بات کہی تھی اور بولا، ''لڑکو اگر تم کسی سے لڑنا چاہتے ہو تو کیوں نہیں مجھ سے دو دو ہاتھ کرتے۔''

وہ شخص آگے بڑھ گیا، بہت آہستگی سے اور سبھی ایک ایک کرکے چل دیئے کوئی ایک لفظ کہے بغیر۔

وہ اسے جانتے تھے۔ اس نے کندھوں کو جھٹکا، خیر مقدمی کے انداز میں ہماری طرف ہاتھ ہلایا اور چلا گیا۔ لیکن جانے سے پہلے مجھ سے گویا ہوا، ''اگر تمھیں اس کے بعد کوئی مصروفیت نہیں ہے تو ریستوران میں چلے آنا۔''

میں وہاں مضطرب اور ہیجان میں مبتلا کھڑا رہا۔

''ایک معزز شخص جسے عورتوں کی قدر ہے۔'' میری آنٹی سارا نے اپنا فیصلہ سنایا۔ مجھے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے جس میں میں مبتلا تھا، میری والدہ نے اس کی یوں اصلاح کی، ''میں کہوں گی کہ ایک بدمعاش جس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔''

میں نہیں جانتا کہ اس واقعہ کو کیسے تم پر واضح کروں۔ آج جب میں نے اپنے لیے ایک مقام حاصل کرلیا ہے، میرے پاس یہ کتابوں کی دکان ہے جہاں میں مزے میں ہوں اور کتابیں پڑھتا ہوں، میرے مجھ جیسے ہی کئی دوست ہیں۔ میری بیوی اور بچے ہیں۔ میں سوشلسٹ پارٹی کا رکن ہوں۔ میں ارجنٹائن کا اچھا شہری ہوں اور ایک معزز یہودی۔ میری عزت وتوقیر ہے۔

جس شخص کو تم اب دیکھتے ہو، وہ گنجا ہے۔ اس وقت میں شہر کے مضافات میں موالیوں سے بھرے علاقے میں رہنے والا سرخ بالوں والا یہودی بچہ تھا۔ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے سبھی نوجوانوں کی طرح کوشش کی کہ دوسروں کی طرح ہو جاؤں۔ میں نے خود کو سانتیا گو کہلوانا شروع کیا تاکہ جیکوب کو بھگا سکوں۔ لیکن میں فیش بین کے معاملے میں بے بس تھا۔ ہم ویسے ہی ہو جاتے ہیں جیسا لوگ ہمارے بارے میں سوچتے ہیں۔ میں لوگوں کی اپنے بارے میں نفرت کو محسوس کرتا تھا۔ اور میں خود اپنے لیے بھی نفرت محسوس کرتا تھا۔ اس وقت اور خاص کر اس ماحول میں بہادر ہونا ضروری تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک بزدل انسان ہوں۔ عورتیں مجھے خوف زدہ کر دیتی تھیں۔ بہت اندر میں اپنی کانپتے دل کی معصومیت پر شرمندہ تھا۔ میری عمر کے لوگ میرے دوست نہیں تھے۔

اس رات میں نکڑ والے شراب خانے میں نہیں گیا۔ میری خواہش ہے کہ میں وہاں کبھی

نہ گیا ہوتا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں اس بات پر قائل ہوگیا کہ وہ دعوت اصل میں ایک حکم تھی۔ ایک دن ہفتے کی رات کھانے کے بعد میں وہاں گیا۔ فراری ایک طرف بیٹھا سب سے نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ میں دوسروں کو پہچانتا تھا۔ وہ شاید کل سات تھے اور سبھی دراز قد۔ فراری ان میں سب سے عمر رسیدہ تھا سوائے کم گو اور تھکے ماندے ایک بوڑھے کے، جس کا نام ہی ایسا ہے جو میری یادداشت سے کبھی محو نہیں ہوا، ڈان ایلیسیو امارو۔ چاقو کا ایک زخم اس کے چہرے پر کھدا ہوا تھا جو بہت چوڑا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی باعث جیل میں بھی رہا تھا۔

فراری نے مجھے اپنے بائیں جانب بٹھالیا۔ ڈان ایلیسیو کو میرے لیے اپنی جگہ چھوڑنی پڑی۔ میں پریشان تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں فراری اس منحوس واقعے کا ذکر نہ کرے جو چند دن پہلے ہوا تھا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ عورتوں، تاش کے پتوں، انتخابات، ایک خانہ بدوش گلوکار کے بارے میں بات کرتے رہے جس کی یہاں آمد متوقع تھی لیکن وہ اس روز نہیں آیا۔ یہی سب کچھ اس علاقے میں ہو رہا تھا۔ پہلے پہل انھیں سرخ بالوں والے یہودی بچے کو برداشت کرنا دشوار معلوم ہوا۔ لیکن آخر انھوں نے ایسا کر ہی لیا کیوں کہ فراری ایسا چاہتا تھا۔

ان کے ناموں کے باوجود، جو زیادہ اطالوی تھے، وہ خود کو ارجنٹائن کے جدی پشتی حتیٰ کہ چرواہے سمجھتے تھے (اور انھیں ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔) ان میں چند ایک لاریاں یا چھکڑے چلانے والے تھے، اور ہو سکتا ہے ان میں کوئی قصائی بھی ہو۔ جانوروں سے جڑے ہوئے ان کے کام نے انھیں دیہاتی لوگوں سے بھی جوڑ دیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ ان کی سب سے بڑی خواہش شاید یہ تھی کہ وہ حوان موریرا کی جون میں پیدا ہوتے۔ آخر وہ مجھے ننھا شینی پکارنے لگے۔ لیکن اس عرفیت میں بھی کوئی مذاقیہ نہیں تھا۔ انھی لوگوں سے میں نے سگریٹ پینا اور دوسرے کام سیکھے۔

ایک رات کالی حونین کے گھروں میں سے کسی ایک گھر والے نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں فرانسسکو فراری کا دوست ہوں؟ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں ہاں کرتا تو ضرور شیخی مارتا۔ ایک رات پولیس شراب خانے میں آئی اور انھوں نے سبھی کی جامہ تلاشی

لی۔ ہم میں سے کئی ایک کو تھانے لے جایا گیا۔ لیکن فراری سے انھوں نے کوئی پنگا نہیں لیا۔ دو ہفتے بعد یہی سب کچھ پھر سے دہرایا گیا۔ اس بار انھوں نے فراری کو بھی گرفتار کر لیا۔ اس کے کمر بند میں ایک خنجر اڑسا ہوا تھا۔ شاید وہ مقامی سیاسی رہنما کی سرپرستی سے محروم ہو گیا تھا۔ اس روز میں نے فراری کو ایک بے بس بچے کی صورت میں دیکھا جسے گمراہ کیا گیا اور اس سے دھوکہ کیا گیا ہو۔ تب میرے لیے وہ ایک دیوتا جیسا ہی تھا۔

دوستی، آپ جانتے ہیں کہ اتنی ہی پراسرار شے ہے جتنی محبت یا کوئی بھی دوسری الجھاؤ بھری کیفیت جسے ہم زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ درحقیقت میں کبھی شک کرتا ہوں کہ واحد شے جو ہر اسرار سے پاک ہے، وہ مسرت ہے، کیوں کہ یہ اپنا جواز خود رکھتی ہے۔ تاہم ایسا ہو سکتا ہے کہ حقیقت حال یہ ہو کہ فرانسسکو فراری جرات مند، مضبوط فراری میرے لیے دوستی کا جذبہ محسوس کرتا ہو، میں جو قابل نفرت ہوں۔ مجھے لگا وہ غلطی پر تھا کیوں کہ میں اس کی دوستی کے لائق نہیں تھا۔ میں نے اس سے احتراز کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس بات کو خاطر میں نہ لایا۔ میری بے چینی کو میری والدہ کی ناپسندیدگی نے بڑھا وا دیا۔ وہ میری اس سے، جسے وہ 'نیچ بدمعاش' پکارتی تھی، میل ملاپ سے خوش نہیں تھی۔ نہ ہی وہ اس بات سے مطمئن تھی کہ میں نے ان جیسا بننے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ یہ کہانی جو میں تمھیں سنا رہا ہوں، اس میں سب سے اہم بات تو فراری سے میرا تعلق ہی ہے نہ کہ ایسے ناخوش گوار واقعات، جن پر اب مجھے پشیمانی ہے۔ جب تک پشیمانی باقی رہتی ہے، احساس جرم باقی رہتا ہے۔''

ایک رات میں شراب خانے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ بوڑھا ساتھی ڈان ایلیسیو، جس نے پھر سے فراری کے پہلو میں جگہ حاصل کر لی تھی، سرگوشی میں اس سے کوئی بات کر رہا تھا۔ وہ کسی سازش کے تانے بانے بُن رہے تھے۔ میز کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے مجھے لگا کہ مجھے کوئی نام ویڈمان سنائی دیا تھا۔ ویڈمان کا کپڑا بننے کا کارخانہ اس علاقے کے مضافات میں واقع تھا۔ چند منٹ بعد ہی فراری اور ڈون ایلیسیو نے مجھے کہا کہ جا کر کارخانے کے آس پاس علاقے کا معائنہ

کروں۔ مزید کوئی وضاحت مجھے پیش نہ کی گئی۔ بس اتنا کہا گیا کہ دروازوں پر خاص دھیان رکھوں۔

رات گہری ہو رہی تھی جب میں نے مالڈوناڈو اور ریل کی پٹڑیوں کو عبور کیا۔ مجھے یاد ہے وہاں چند بکھرے ہوئے گھر تھے، بید مجنوں کے درخت تھے اور خالی جگہیں۔ کارخانہ نوتعمیر شدہ تھا لیکن اس میں ویرانی اور کج روی کا تاثر تھا۔ اب میری یادداشت میں اس کا سرخی مائل رنگ غروب ہوتے ہوئے سورج کی رنگت کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔ اس کے گرداگرد ایک جنگلا تھا۔ صدر دروازے کے برابر پچھلی جانب دو دروازے تھے جنوب کے رخ پر، جو براہ راست ورکشاپوں میں کھلتے تھے۔

مجھے اعتراف ہے کہ وہ سب کچھ سمجھنے میں مجھے کچھ وقت لگا جو میرے خیال میں تم اب تک سمجھ چکے ہوگے۔ میں نے انھیں رپورٹ دی جس کی تصدیق دوسرے لڑکوں میں سے ایک نے کی کیوں کہ اس کی بہن کارخانے میں کام کرتی تھی۔

اگر پورا جتھہ ہفتے کو غیر حاضر ہوتا تو سبھی کی نظر میں آتا۔ اس لیے فراری نے فیصلہ کیا کہ واردات اگلے جمعہ کو کی جائے۔ مجھے ہر شے پر نظر رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس دوران بہتر تھا کہ کوئی ہمیں اکٹھے نہ دیکھے۔

جب ہم گلی میں اکیلے ہوئے تو میں نے فراری سے پوچھا کیا اس منصوبے میں وہ واقعی مجھ پر بھروسہ کرتا تھا۔

''ہاں'' وہ بولا، ''میں جانتا ہوں کہ تم ایک مرد کی طرح کام کرو گے۔''

اس رات میں خوب سویا اور اس کے بعد کی راتوں میں بھی۔ بدھ کے روز میں نے والدہ سے کہا کہ شہر کے مرکزی حصے میں نئی کاؤبوائے فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ میں نے اپنا بہترین لباس پہنا اور کالی مورینو کی طرف چل پڑا۔

سٹریٹ کار کا سفر طویل تھا۔ پولیس سٹیشن میں انھوں نے مجھے انتظار کرنے کو کہا۔ لیکن

آخر کلرکوں میں سے ایک، جس کا نام ایلڈیا آلٹ تھا، مجھ سے آ کر ملا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ایک خفیہ معاملے پر بات کرنے آیا ہوں۔

اس نے مجھ سے کہا کہ میں اعتماد کے ساتھ بات کر سکتا ہوں۔ میں نے اسے فراری کے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے لیے یہ نام اجنبی تھا۔ لیکن ڈان ایلیسیو کا نام لیا تو اس کا ردعمل مختلف تھا۔

''آہا'' وہ بولا، ''وہ پوراگوئے کے جتھے میں شامل ہے۔''

ایلڈیا ایلٹ نے ایک دوسرے افسر کو بلوا بھیجا جو میرے ہی علاقے میں متعین تھا۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کسی طنز کے بغیر۔ ''کیا تم یہ سب کچھ ہمیں بتا رہے ہو کیوں کہ تم سمجھتے ہو کہ تم ایک اچھے شہری ہو؟ کیا یہی بات ہے؟''

مجھے لگا کہ اسے میری بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں نے جواب دیا، ''ہاں، جناب۔ میں ایک اچھا ارجنٹائنی ہوں۔''

انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ گروہ کا سرغنہ مجھے جو بھی حکم دے میں اسے بجا لاؤں۔ سوائے اس حکم کے کہ پولیس کو آتا دیکھ کر فوراً سیٹی بجا دوں۔ میں وہاں سے نکل رہا تھا تو ان میں سے ایک نے مجھے تنبیہ کی 'محتاط رہو۔ تم جانتے ہو کہ غداروں کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے ہیں۔' چوتھے درجے کے اہل کاروں کی طرح پولیس افسر اپنی بولی لن فارڈو کا رعب جمانا پسند کرتے ہیں۔

''مجھے شک ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔'' میں نے جواب دیا، ''اس سے بڑھ کر اور کیا میرے ساتھ ہو سکتا ہے۔''

جمعہ کی صبح سے، اس دن کے اختتام تک میں گہرے اطمینان میں ڈوبا رہا کہ آخر وہ دن آ پہنچا تھا۔ اور اس بات پر احساس پشیمانی میں بھی کہ کوئی احساس پشیمانی ہی نہیں تھا۔ وقت گزر کر ہی نہیں دیتا تھا۔ اس دن بس معمولی سا ہی کھانا کھایا۔ رات کو دس بجے ہم کارخانے سے کوئی ایک

بلاک سے بھی کم فاصلے پر اکٹھا ہونا شروع ہوئے۔ ہم میں سے ایک نہیں آیا تھا۔ ڈان ایلیسیو نے کہا کہ ہمیشہ ایک غائب ہو جاتا ہے۔ مجھے خیال گزرا کہ جو کچھ ہونے والا تھا، اس کا الزام غیر حاضر شخص پر ہی آئے گا۔ بارش ہونے والی تھی۔ مجھے خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی میرے پیچھے کھڑا ہوگا لیکن مجھے عقبی دروازوں میں سے ایک کے پیچھے اکیلے ہی کھڑے رہنے کو کہا گیا۔ جلد ہی پولیس وہاں پہنچ گئی۔ ایک افسر اور کئی سپاہی۔ وہ پیدل ہی آئے تھے دبے پاؤں۔ اپنے گھوڑے انھوں نے پرے کھیتوں میں چھوڑ دیے تھے۔

فراری نے زور لگا کر کارخانے کا دروازہ کھولا تھا۔ اسی سے پولیس کوئی کھڑاک کیے بغیر اندر داخل ہوگئی۔ مجھے چار گولیوں کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھا کہ وہاں گہرے اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ تب میں نے پولیس کو باہر آتے دیکھا ہمراہ ہتھکڑیاں پہنے گروہ کے لوگ تھے۔ تب مزید دو پولیس والے باہر آئے۔ وہ فرانسسکو فراری اور ڈان ایلیسیو امارو کی نعشیں گھسیٹ کر لا رہے تھے جنھیں بہت قریب سے گولی ماری گئی تھی۔

اپنی رپورٹ میں پولیس نے لکھا کہ ڈاکوؤں کو رکنے کو کہا گیا تھا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اور یہ کہ فراری اور ڈان ایلیسیو نے پہلے گولی چلائی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سفید جھوٹ تھا۔ کیوں کہ میں نے ان میں سے کسی کے پاس کبھی پستول نہیں دیکھے تھے۔ پولیس نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پرانے حساب برابر کیے تھے۔ بہت دنوں کے بعد مجھے بتایا گیا کہ فراری نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ایک ہی گولی چلی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ اخباروں میں اسے ہیرو قرار دیا گیا جو کہ وہ نہیں تھا لیکن ایسا میں نے تصور کیا تھا۔

مجھے بھی دوسروں کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد انھوں نے مجھے جانے دیا۔

# ظاہر

بیونس ایریز میں ظاہر بیس سینٹو کی مالیت کا ایک سکہ ہے جس پر کسی استرے یا خط کھولنے والے چاقو سے حروف NT اور عدد 2 کھرچے ہوئے ہیں۔ سامنی رُخ پر 1929 کا سن کندہ ہے۔ (گجرات میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ظاہر ایک شیر تھا۔ جاوا میں سرا کرتا کی مسجد میں یہ ایک اندھا آدمی تھا جس پر باعقیدہ لوگوں نے پتھر برسائے۔ ایران میں یہ زاویاتی فاصلے ماپنے والا آلہ تھا جسے نادر شاہ کے حکم پر سمندر میں غرقاب کیا گیا۔ مہدی کے قید خانوں میں 1892 کے قریب یہ ایک چھوٹا قطب نما تھا جسے روڈولف کارل وان سلاطین نے چھوا، اور اسے اپنی پگڑی میں اڑس لیا۔ زوٹنبرگ کے مطابق مسجد قرطبہ میں یہ بارہ سوستونوں میں سے ایک ستون کے سنگ مرمر کی ایک رگ تھا۔ ٹیٹوان کی یہودی بستی میں یہ ایک کنویں کا پیندا تھا۔)

آج نومبر کی تیرا تاریخ ہے۔ جون کی سترہ کو ظاہر میری تحویل میں آیا۔ میں اس کہانی میں اب مزید 'میں' نہیں رہا۔ لیکن میرے لیے اب بھی یاد رکھنا ممکن ہے کہ کیا ہوا تھا، اور شاید اسے بیان بھی کر پاؤں۔ میں اب بھی جزوی طور پر بورخیس ہوں۔

کلیمنٹینا ولر جون کی چھ تاریخ کو فوت ہوئی۔ 1930 کے لگ بھگ اس کی تصویریں سوسائٹی میگزینوں کی زینت بنتی تھیں۔ شاید اس کے بے حد معروف ہونے کی وجہ سے یہ بات عام ہوئی کہ وہ انتہائی خوب صورت تھی۔ حالاں کہ اس کی ہر تصویر اس خیال کو غیر مشروط طور پر درست ثابت نہیں کرتی تھی۔ بہر طور کلیمنٹا ولر خوب صورتی سے زیادہ کمال پسندی میں دلچسپی رکھتی تھی۔

عبرانی اور چینی مصنفین تمام قابل تصور انسانی ممکنات کو ضابطہ تحریر میں لائے۔ مشنا میں لکھا ہے کہ ایک درزی بھی سوئی لے کر باہر گلی میں نہیں جا سکتا سبت کے دن غروب آفتاب کے بعد۔ ہم کتاب رسوم میں پڑھتے ہیں کہ شراب کا پہلا جام پیش کیے جانے پر مہمان کو سنجیدہ ہو جانا چاہئے۔ اور دوسرے پیالے پر احتراماً قانع و مسرور۔

ایسا ہی غیر لچک دار کڑا معیار تھا، گو اس سے کہیں زیادہ دشواری اور تفصیل کے ساتھ، جس کی کلیمنٹینا ولر خود سے متقاضی تھی۔ کنفیوشس یا تلمود کے کسی عالم کی طرح اس نے اپنے ہر فعل میں ناقابل مذمت انداز میں درستگی کی کوشش کی۔ لیکن اس کا کام ان کی نسبت کہیں زیادہ قابل ستائش اور توجہ طلب ہوتا کیوں کہ اس کے اصول ابدی نہیں تھے بلکہ پیرس یا ہالی وڈ کے مزاج کی لہر کے ساتھ بدلتے۔

کلیمنٹینا ولر درست اوقات میں درست ساز و سامان کے ساتھ درست جگہوں پر نمودار ہوئی، درست دنیاوی بے زاری کے ساتھ۔ لیکن دنیاوی بے زاری، ساز و سامان، وقت اور جگہیں جلد ہی دقیانوسی ہو جاتی تھیں اور یوں وہ (کلیمنٹینا کی زبان میں) فرومایگی کی بہترین مثالیں بن جاتیں۔ وہ فلابیئر کی طرح 'مطلق' کی متلاشی تھی۔ صرف یہ کہ اس کا مطلق لمحاتی ہوتا۔ اس کی زندگی غیر معمولی تھی۔ لیکن پھر بھی داخلی مایوسی مستقل طور پر اسے نوچتی۔ وہ نا مختتم کایا کلپ کے عمل سے گزری جیسے خود ہی سے فرار چاہتی ہو۔ اس کے بالوں کا رنگ اور ان کی شکل معروف طور پر غیر مستقل تھی۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی جلد اور اس کی آنکھوں کا ترچھا پن بھی۔ 1932 سے وہ دانستہ طور پر نحیف ہو گئی تھی۔ جنگ نے اسے سوچنے کا بہت مواد دیا۔

چوں کہ پیرس جرمنوں کے قبضے میں تھا، تو پھر کیسے فیشن کا اندازہ لگایا جائے؟ ایک اجنبی جس پر وہ کبھی اعتماد نہ کر پائی تھی، اسے یوں غچہ دے گیا کہ اسے بڑی تعداد میں سلنڈر جیسی صورت کی ٹوپیاں بیچ گیا۔ ایک سال بعد ہی یہ بات افشا ہوئی کہ وہ مضحکہ خیز شکل کی ٹوپیاں پیرس میں کبھی استعمال میں ہی نہیں آئی تھیں۔ وہ سرے سے ٹوپیاں تھیں ہی نہیں۔ بلکہ عارضی اور غیر مستند انوکھی

اشیا تھیں۔

مصیبتیں کبھی تنہا نہیں آتیں۔ ڈاکٹر ولر کو اراؤز سٹریٹ میں منتقل ہونا پڑا اور اس کی بیٹی کی تصویریں اب سردیوں کی کریموں اور گاڑیوں کے اشتہاروں کی زینت بننے لگیں۔ (چہرے کی کریمیں جنھیں اس نے کبھی استعمال نہیں کیا اور گاڑیاں جن کی اب وہ مزید متحمل نہیں تھی۔) وہ جانتی تھی کہ اس کے فن کی مناسب نمو کے لیے بڑے چانس کی ضرورت تھی۔ اس نے غیر اہم مظاہروں کی نسبت منظر سے ہٹ جانے کو ترجیح دی۔ یہ بھی اس کے لیے تکلیف دہ تھا کہ وہ بے حیثیت ماڈل گرلز سے مسابقت پر مجبور ہو۔

اروز کا اداس اپارٹمنٹ اتنا بڑا تھا کہ اسے برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جون کی چھ تاریخ کو بیر یوسُر کے وسط میں کلیمنٹینا ولر نے خودکشی کی بے تکی حرکت کی۔ کیا میں اعتراف کروں کہ ارجنٹائنی جذبات اور نخوت کے مخلصانہ پن سے متاثر ہوتے ہوئے میں کلیمنٹینا کے عشق میں مبتلا تھا اور یہ کہ اس کی موت نے مجھے رلا دیا۔

شاید قاری اس بات کا پہلے ہی سے اندازہ لگا چکے ہوں گے۔ تعزیتی تقریب میں انحطاط کے عمل کے دوران یہ سامنے آیا کہ میت نے اپنی سابقہ صورتیں اختیار کرنی شروع کر دی تھیں۔ چھ تاریخ کی اس الجھی ہوئی رات کسی وقت کلیمنٹینا ولر جادوئی طور پر ویسی ہو گئی جیسی وہ بیس سال پہلے تھی۔ اس کے نقوش نے وہ حاکمانہ روپ اختیار کر لیا جو تمکنت، دولت، جوانی، ایک سلسلہ مراتب کو ختم کرنے کی آگاہی، قوت متخیلہ کی کمی، حدود و قیود، قوت تخیل کی کمی اور بے حسی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ میرے خیالات کم و بیش کچھ یوں تھے۔ اس چہرے کا کوئی دوسرا روپ، جو میرے حواس پر چھایا رہا، اتنی دیر میری یادداشت میں باقی نہیں رہا۔

چوں کہ یہ روپ آخری تھا، اس لیے یہی پہلا ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے پھولوں میں گھرا ہوا چھوڑا۔ دنیا سے اس کی نفرت موت کی صورت میں مکمل ہو رہی تھی۔ دن کے دو بجے کے قریب میں باہر نکلا۔ باہر ایک / دو منزلہ گھروں کی متوقع قطاریں وہی مجرد صورت اختیار کر چکی تھیں جو کہ

ان کی رات کو تھی، جب تاریکی اور سناٹا انھیں سادہ بنا دیتا ہے۔ میں ایک طرح کی غیر شخصی خدا ترسی کے احساس میں شرابور گلیوں میں گھومتا رہا۔

چلی اور ٹا کوری کی نکڑ پر میں نے ایک شراب خانہ بشمول کریانہ کی دکان کھلی ہوئی دیکھی۔ اس دکان میں شومئی قسمت تین افراد تاش کا کھیل ٹرو کو کھیل رہے تھے۔ خطابت کے فن میں کسی ایک لفظ میں ایسے خطابیہ لفظ سے ترمیم کی جاتی ہے جو اس کے مخالف معنی کا حامل ہو۔ باطنی علوم کے پیرو کار تاریک روشنی کی بات کرتے ہیں اور کیمیا دان سیاہ سورج کی۔ میرے لیے یہ بات ایسے اضداد لفظی جیسی ہی تھی کہ میں کلیمنٹینا ولر سے اپنی آخری ملاقات کے بعد ایک شراب خانہ، جس میں کریانہ کی دکان بھی تھی، میں شراب نوشی کے لیے گیا۔ اس بات کی لغویت اور سہل الفہمی نے مجھے ترغیب دی تھی۔ (یہ تضاد ان لوگوں کے وہاں تاش کھیلنے کے عمل سے مہمیز ہوا۔) میں نے برانڈی اور اورنج کے جوس کا آرڈر دیا۔ کاؤنٹر والے نے بقیہ رقم لوٹاتے ہوئے مجھے ظاہر تھما دیا۔ لمحہ بھر کو میں نے اسے دیکھا اور باہر گلی میں آ گیا شاید بخار کی ابتدائی علامات کے ساتھ۔

میں نے سوچا دنیا میں کوئی سکہ ایسا نہیں جو ان معروف سکوں کا استعارہ ہو جو لامختتم انداز میں تاریخ اور حکایات میں تاباں ہیں۔ میں نے چارون کے اوبول کے بارے میں سوچا۔ اس خیرات کے بارے میں جس کی بیلی سیریس نے بھیک مانگی تھی۔ یہودا کے تیس سکوں کے بارے میں، معروف داشتہ لائیس کے درہموں کے بارے میں، اس قدیم سکے کے بارے میں جسے اصحاب سفہ نے پیش کیا تھا، الف لیلہ ولیلہ کے جادوگر کے چمکدار سکوں کے بارے میں جو کاغذ کے ٹکڑوں میں بدل گئے تھے، اسحاق لیقیدم کے ختم نہ ہونے والے دیناروں کے بارے میں، چاندی کے ساٹھ ہزار سکوں کے بارے میں جن میں سے ہر سکہ نظم کے کسی ایک مصرع کا انعام تھا اور جنھیں فردوسی نے بادشاہ کو لوٹا دیا تھا کیوں کہ وہ سکے سونے کے نہیں چاندی کے تھے، ہسپانوی طلائی سکے کے بارے میں جسے اہب نے مستول میں ٹھونک دیا تھا، لیو پولڈ بلوم کے نا قابل واپسی فلورین کے بارے میں، طلائی لوئیس کے بارے میں جس کے تصویری چہرے نے مفرور لوئیس XVI کو

وارینس کے نزدیک گمراہ کیا تھا۔

جیسے میں کسی خواب میں تھا کہ یہ خیال، کہ ہر سکہ ایسے ہی تصویری اشاروں کا حامل ہوتا ہے، مجھے بھاری، وسیع تر، ناقابل فہم اہمیت کا حامل معلوم ہوا۔ غیر آباد گلیوں اور پلازوں سے گزرتے ہوئے میری رفتار بڑھ گئی۔ آخر کار تھکاوٹ نے مجھے ایک نکڑ میں رک جانے پر مجبور کیا۔ میری نظریں ایک زنگ آلود آہنی باڑ پر جا ٹکیں۔ اس کے پیچھے مجھے لا کونسپشن کے برآمدے میں سیاہ اور سفید پتھر کی سلیں دکھائی دیں۔ میں ایک دائرے میں گھوم رہا تھا اور اب اُس دکان سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھا جہاں مجھے ظاہر دیا گیا۔

میں واپس گھوما۔ تاریکی میں مسطح سطح کی رکاوٹ نے دور ہی سے مجھے خبر دی کہ دکان بند ہو چکی تھی۔ بلگرانو سٹریٹ میں میں نے ایک ٹیکسی کرایے پر لی۔ نیند سے عاری، دیوانگی کی زد میں تقریباً سرور کی کیفیت میں میں نے غور کیا کہ دولت سے کم مادی شے کوئی نہیں ہے کیوں کہ جتنی بھی مالیت کا سکہ ہو (فرض کیجیے بیس سینٹوز کا،) حقیقت میں وہ ممکنہ مستقبلوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ دولت مجرد شے ہے۔ میں نے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی کہ دولت مستقبل کا وقت ہے۔ یہ کسی مضافات میں ایک شام ہو سکتی ہے، یا برہمز کی موسیقی۔ یہ نقشے، یا شطرنج، یا کوفی ہو سکتی ہے، یا اپیکٹیٹس کے الفاظ، جو ہم میں سونے سے نفرت پیدا کرتے ہیں۔ یہ پروٹیئس ہے، فیروس کے جزیرے پر موجود پروٹیئس سے کہیں زیادہ ہمہ گیر۔ یہ پیشین گوئی نہ کیے جا سکنے والا وقت ہے، اسلام یا پورچ کا کٹر وقت نہیں بلکہ برگسانین وقت۔

جبریت کے ماننے والے اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ کوئی فعل ایسا ہے جو ممکنہ ہو جیسے کوئی ایسا فعل، جو ہو سکتا ہے۔ سکہ انسان کے آزاد ارادے کا استعارہ ہے۔ (مجھے تب یہ شک نہیں تھا کہ یہ خیالات ظاہر کے خلاف کسی چالاکی پر مبنی تھے اور اس کے شیطانی اثرات کی ابتدائی صورتیں۔) ان طویل اور سرکش خیالات میں غرق رہنے کے بعد میں سو گیا لیکن پھر خواب دیکھا کہ میں ایسے سکوں کا انبار تھا جن کی حفاظت پر افسانوی مخلوق گریفن مامور تھی۔ اگلے دن میں نے

محسوس کیا کہ میں نشے میں تھا۔ میں نے سکے سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کیا جس نے مجھے پریشانی میں مبتلا کرر کھا تھا۔ میں نے اسے بغور دیکھا۔ اس میں کوئی بات غیر معمولی نہیں تھی سوائے چند خراشوں کے۔

اس کا بہترین اہتمام یہ ہوسکتا تھا کہ اسے باغ میں دفن کر دیا جائے یا کتب خانے میں کسی کونے میں چھپا دیا جائے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ خود کو اس کے مدار سے باہر نکال لوں۔ اس لیے اسے کھو دینے کے متبادل کو ترجیح دی۔ اس صبح میں نہ ہی بیسیلیسا ڈیل پائیلر گیا نہ قبرستان۔ میں کانسٹی ٹیوشن تک جانے کے لیے زیر زمین ریل گاڑی میں سوار ہوا اور پھر کانسٹی ٹیوشن سے سان حوان اور بوڈو تک گیا۔ ایک جذباتی تحریک پر ارکیوزہ اترا اور پھر مغرب اور جنوب کی طرف چلنے لگا۔ کسی منصوبے کے بغیر کئی ایک کونوں سے میں بائیں اور دائیں گھوما، اور ایک گلی میں جو مجھے باقی سبھی گلیوں جیسی دکھائی دیتی تھی، ایک خستہ حال سرائے میں داخل ہوا، برانڈی کے جام کی درخواست کی اور ظاہر کے سکے سے ادائیگی کی۔ میں نے اپنے موٹے شیشوں والے چشمے کے پیچھے اپنی آنکھوں کو نیم وا کر لیا، تا کہ نہ گھروں کے نمبر ہی دیکھ پاؤں اور نہ گلی کا نام۔ اس رات میں نے خواب آور دوالی اور پرسکون نیند سویا۔

جون کے آخر تک میں نے خود کو ایک فنتاسیہ کی کہانی لکھنے میں مشغول رکھا۔ اس کہانی میں دو یا تین معماتی ہیر پھیر یا روایتی علامتی نام شامل تھے۔ مثال کے طور پر خون کے بجائے اس میں آب تلوار کا ذکر تھا۔ اور سونے کو سانپ کا بستر کہا گیا تھا۔ اسے صیغہ متکلم میں پیش کیا گیا تھا۔ راوی ایک تیاگی تھا جس نے انسانی معاشرے کو خیر آباد کہا اور ایک طرح کے ویرانے میں رہتا تھا۔ (اس جگہ کا نام گنی تاہیدر تھا)

تیاگی کی زندگی کی سادگی اور معصومیت کے پیش نظر ایسے لوگ بھی تھے جو اسے فرشتہ تصور کرتے تھے۔ لیکن یہ ایک سادہ نوع کا مبالغہ تھا کیوں کہ کوئی انسان گناہ سے آزاد نہیں ہے۔ (نزدیک ترین مثال یہ ہے کہ) اس نے اپنے ہی باپ کا گلا کاٹا تھا، جب کہ یہ سچ تھا کہ وہ بوڑھا

شخص ایک بدنام جادوگر تھا جس نے جادو کے زور سے لامحدود خزانہ حاصل کرلیا۔ اس خزانے کو انسانوں کی جنونی حرص سے محفوظ رکھنا ہی وہ مقصد تھا جس کے لیے ہمارے تیاگی نے اپنی زندگی وقف کی۔

دن اور رات وہ اس خزانے کی پہرے داری کرتا۔ جلد ہی، شاید بہت ہی جلد، اس کی پہرے داری اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔ ستاروں سے اسے خبر ملی کہ ایسی تلوار بن چکی تھی جو اسے ٹکڑوں میں کاٹ دے گی۔ (تلوار کا نام گرام تھا۔) مسلسل پیچیدہ ہوتے اسلوب میں راوی اپنے جسم کی عمدگی اور لچک پذیری کی توصیف کرتا ہے۔ ایک پیراگراف میں وہ بے دھیانی میں اپنی پپڑیوں کی بات کرتا ہے۔ ایک دوسرے پیراگراف میں وہ کہتا ہے کہ خزانہ، جس کی وہ حفاظت کررہا تھا، چمکتا ہوا سونا اور سرخ چھلوں کی صورت میں تھا۔ آخر میں ہم سمجھ جاتے ہیں کہ تیاگی فیفنر سانپ ہے اور یہ کہ جس خزانے کی وہ بل دار شکل میں لیٹا ہوا نگرانی کررہا تھا، وہ نائب لنگن کا خزانہ تھا۔ سگرڈ کا ظہور اس کہانی کو فوری اختتام سے دوچار کرتا ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ اس غیر معقول کہانی کی بنت کاری کی مصروفیت نے (جس دوران میں نے نام نہاد دانائی کے ساتھ فین فسمل کے ایک یا دو شعر نقل کیے) مجھے اس سکے کو فراموش کرنے کے قابل بنایا۔

ایسی راتیں بھی آئیں جب مجھے یقین ہوگیا کہ میں اسے یوں فراموش کرپاؤں گا کہ اسے یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور دینا پڑے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ان لمحات کو غلط استعمال کیا۔ کسی بات کو یاد کرنا، اس کے بارے میں سوچنے سے خود کو روکنے کی نسبت آسان معلوم ہوا۔ خود کو یہ سمجھانا البتہ بے سود تھا کہ نقلی چاندی کا یہ قابل نفرین سکہ ان سکوں سے مختلف نہیں تھا جو ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، ایک جیسے، لاتعداد، غیر مضر۔

اس خیال سے تحریک پاکر میں نے دیگر سکوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی۔ لیکن ایسا نہیں کرسکا۔ مجھے ایسے ہی ایک (مایوس کن) تجربے کے بارے میں یاد ہے جو میں نے چلی

کے پانچ اور دس سینٹو کے سکوں اور یوراگوئے کے ونٹن کے ساتھ کیا تھا۔ جولائی کی سولہ تاریخ کو مجھے ایک پاؤنڈ سٹرلنگ ملا۔ دن بھر مجھے اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن رات (اور بعد کی راتوں میں) میں نے اسے ایک مکبر عدسے کے نیچے رکھا اور بجلی کے طاقت ور لیمپ کی روشنی میں اس کا معائنہ کیا۔ پھر اسے رگڑا۔ روشنی کی شعاعیں، اور اژدھے اور سینٹ جارج کی تصویر میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دماغ میں پھنسے خیال سے چھٹکارا پانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

اگست کے مہینے میں میں نے فیصلہ کیا کہ کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کروں۔ لیکن اسے اپنی مضحکہ خیز کہانی نہیں سنائی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے بے خوابی کا مرض تھا۔ اور یہ کہ کسی شے کا خیال دماغ میں سمایا رہتا تھا، کوئی بھی شے، جیسے ایک سکہ۔ کچھ ہی عرصہ بعد سامیتھو سٹریٹ میں کتابوں کی ایک دکان میں مجھے جولیئس بارلاچ کی کتاب 'Urkunden zur Geschichte der Zahirsage- Breslau, 1899) ملی۔

اس کتاب میں میری بیماری کی تفصیل درج تھی۔ دیباچے میں مصنف نے ''ظاہر' کے توہم سے متعلق تمام دستیاب دستاویزات بشمول ہیچٹ کی کلیات میں سے چار مضامین اور فلپ میڈووز ٹیلر کی اس موضوع پر کتاب کے اصل مسودے کو ایک جاذب نظر جلد میں اکٹھا کرنے کی'' تجویز پیش کی تھی۔

ظاہر پر اعتقاد کا منبع اسلامی تہذیب ہے اور لگتا ہے اس کا آغاز اٹھارھویں صدی میں ہوا۔ (بارلاچ اس پیراگراف کی صداقت سے انکار کرتا ہے جو زوٹنبرگ ابوالفدہ سے منسوب کرتا ہے۔) عربی میں ظاہر سے مراد 'دکھائی دینے والا، واضح، اور صاف ہے۔ اس حوالے سے یہ خدا کے ننانوے ناموں میں سے ایک ہے اور (مسلمانوں کے علاقوں میں) لوگ اسے ایسی 'ہستیوں یا اشیا کے مظہر کے بیان کے لیے استعمال کرتے ہیں، ''جن میں فراموش نہ کیے جاسکنے کی غیر معمولی خصوصیت موجود ہوتی ہے، اور جس کا تصور بالآخر انسان کو مجنوں بنا دیتا ہے۔''

اس کی پہلی ناقابل تردید شہادت ایرانی عالم اور درویش لطف علی آذر سے ملتی ہے۔ 'آگ

کا معبد' نامی سوانحی انسائیکلوپیڈیا کے توثیقی صفحات میں یہ ہمہ جہت درویش لکھتا ہے کہ شیراز میں ایک سکول میں پیتل کا زاویاتی فاصلے ناپنے والا آلہ موجود ہے" جسے اس طرح بنایا گیا ہے کہ جو کوئی اسے ایک بار دیکھ لیتا ہے، وہ پھر کسی بھی اور شے کے بارے میں سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ اسی لیے بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے سمندر کے گہرے حصے میں غرقاب کر دیا جائے کہ کہیں لوگ دنیا ہی کو فراموش نہ کر بیٹھیں۔"

میڈوز ٹیلر کی تحقیق زیادہ تفصیلی ہے (وہ حیدر آباد کے ناظم کی ملازمت میں تھا اور اس نے معروف ناول 'ایک ٹھگ کے اعترافات' لکھا۔) لگ بھگ 1832 میں بھوج کے مضافات میں ٹیلر نے پاگل پن یا بزرگی کو بیان کرنے کے لیے ایک غیر معمولی جملہ سنا کہ "ضرور اس نے شیر کی طرف دیکھا ہوگا۔" اسے بتایا گیا کہ اس میں حوالہ ایک جادوئی شیر کا تھا کہ جو کوئی اسے دیکھے گا، چاہے کتنی ہی دور سے، وہ تباہ ہو جائے گا۔ کیوں کہ اسے دیکھنے والا زندگی کے آخری لمحے تک اس کے بارے میں سوچنے سے خود کو روک نہیں پائے گا۔ کسی نے بتایا کہ ان بدقسمت لوگوں میں سے ایک شخص میسور بھاگ گیا تھا جہاں اس نے کسی محل کی دیواروں پر شیر کی تصویر بنائی۔

برسوں بعد ٹیلر اس بادشاہت کے قید خانوں کی جانچ کر رہا تھا جہاں نگھور میں گورنر نے اسے ایک قید خانہ دکھایا جس کے فرش پر، دیواروں اور چھت پر تیز رنگوں سے جنھیں وقت محو کرنے سے پہلے زیادہ چمکدار بنا رہا تھا، ایک مسلمان فقیر کی بنائی ہوئی ایک طرح کے لامحدود شیر کی تصویر تھی۔ یہ شیر ایک انتہائی چکر دار انداز میں بہت سے شیروں سے مل کر بنا تھا۔ یہ بہت سے شیروں کو محیط تھا، شیروں میں گھرا ہوا اور اس میں سمندر اور کوہ ہمالیہ اور فوجیں شامل تھیں جو بہت سے شیروں سے مشابہہ تھیں۔ مصور، جو ایک فقیر تھا، کئی سال پہلے اسی قید خانے میں فوت ہوا۔ وہ سندھ سے یا شاید گجرات سے آیا تھا اور اس کا اصل مقصد دنیا کا ایک نقشہ تیار کرنا تھا۔ بے شک اس کی نشانیوں کو اس دیوہیکل تصویر میں شناخت کیا جا سکتا تھا۔

ٹیلر نے یہ کہانی فورٹ ولیم کے محمد الیمنی کو سنائی۔ محمد الیمنی نے اسے بتایا کہ دنیا میں کوئی

شے ایسی تخلیق نہیں ہوئی جس میں ظہیر (کہ ٹیلر نے اسے یونہی لکھا ہے) کی خصوصیات موجود نہ ہوں۔ لیکن ذات خداوندی دو اشیا کو بیک وقت موجود ہونے کی اجازت نہیں دیتی کہ اکیلی شے ہی انسانی گروہوں کو مسحور کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس نے کہا کہ ظاہر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ جہالت کے دور میں یہ ایک دیوتا 'یاہوق' تھا۔ بعد ازاں یہ ایک پیغمبر 'خوراسان' تھا جو پتھروں سے سجا نقاب یا ایک سنہری نقاب پہنا کرتا تھا (بارلاچ کی تحقیق تھی کہ یاہوق کا قرآن مجید میں بھی ذکر موجود ہے 23-71، اور وہ پیغمبر المکنہ (یعنی نقاب پوش) تھے۔ اور یہ کہ فلپ میڈوز ٹیلر جیسے حیران کن مخبر کے سوا کسی نے ان دو اشخاص کو ظاہر سے منسوب نہیں کیا۔)۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ خدا مخفی ہے۔

یہی نہیں، میں نے بارلاچ کا کتابچہ بھی پڑھا۔ بلکہ اسے بار بار پڑھا۔ میں اپنے احساسات بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی مایوسی یاد ہے جب میں نے محسوس کیا کہ اب میرا بچنا محال تھا۔ صرف یہ خیال میری داخلی اطمینان کا باعث تھا کہ اپنی خستہ حالی کے لیے میں اپنی بدقسمتی کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے ان سے حسد محسوس ہوا جن کا ظاہر سکہ نہیں تھا بلکہ سنگ مرمر کا ٹکڑہ، یا ایک شیر تھا۔ ایک شیر کے بارے میں نہ سوچنا کتنا آسان تھا۔ مجھے وہ غیر معمولی بے چینی یاد ہے جس سے میں نے یہ اقتباس پڑھا: ''گلستان راز کا ایک شارح کہتا ہے کہ جس کسی نے ظاہر کو دیکھ لیا، وہ جلد ہی گلاب کو بھی دیکھے گا۔ وہ عطار کے اسرار نامہ میں ایک شعر کا حوالہ دیتا ہے: 'ظاہر گلاب کا سایہ اور نقاب کا اوڑھنا ہے۔'''

کلیمنٹینا کے واقعہ کی رات میں وہاں موجود لوگوں میں اس کی چھوٹی بہن مسز ابا سکل کو نہ پا کر حیران ہوا۔ اکتوبر کے مہینے میں اس کی ایک سہیلی نے مجھے بتایا۔ ''بے چاری جولیا۔'' وہ عورت بولی، ''بہت عجیب ہو گئی تھی۔ انھیں اس کو اوپر کمرے میں بند کرنا پڑا۔ اسے چمچ سے خوراک پلانے والی نرسیں اسے مار ہی ڈالتیں۔ وہ مسلسل ایک سکے کے بارے میں گفتگو کرتی رہتی تھی، مورینا سیکمین کے شوفر کی طرح۔''

وقت جو عام طور پر یادوں کو پر گداز بنا دیتا ہے، ظاہر کی یاد کو الٹا گہرا کرتا ہے۔ ایسا وقت تھا جب میں اس کے سامنے کے اور پیچھے کے رخ کو دیکھ سکتا تھا۔ اب میں انھیں بیک وقت دیکھ پاتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ ظاہر شیشے کا بنا ہوا ہے بلکہ یہ کسی ایک رُخ کو دوسرے پر عائد کر دینے کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کے بجائے یہ کچھ یوں ہے کہ منظر گروی ہے جس کے وسط میں ظاہر لرزاں ہے۔ جو کچھ بھی ظاہر کے علاوہ ہے، وہ مجھ تک کسی چھلنی سے چھن کر پہنچتا ہے اور بہت فاصلے سے۔ جیسے کلیمنٹینا کا پر تمکنت امیج، جسمانی درد۔

ٹینی سن نے ایک بار کہا تھا کہ اگر ہم کسی ایک پھول کو سمجھ سکیں تو پھر ہم سمجھ لیں گے کہ ہم کیا ہیں اور یہ دنیا کیسی ہے۔ شاید اس کا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ایسی شے نہیں ہے، چاہے وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، جس میں عالمی تاریخ اور سبب وعلل کا لامحدود تسلسل موجود نہ ہو۔ شاید وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ظاہری دنیا ہر مظہر میں مضمر ہے جیسے شوپن ہار کے مطابق ارادہ ہر مرد اور عورت میں موجود ہے۔

یہودی عارفانہ روایت کبالہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ انسان ایک مختصر ترین اکائی ہے، کائنات کا ایک علامتی آئینہ۔ اگر ٹینی سن کی بات مانی جائے تو پھر ہر شے میں ہر شے ہوگی۔ حتی کہ ناقابل برداشت ظاہر بھی۔

1948 سے پہلے جولیا کی حالت مجھ جیسی ہوگی۔ انھیں مجھ کو خوراک دینی اور لباس پہنانا پڑے گا۔ میں نہیں جان پاؤں گا کہ آیا یہ سہ پہر ہے یا صبح۔ میں نہیں جان پاؤں گا کہ بورخیس کون تھا۔ اس مستقبل کو دہشت ناک کہنا ایک مغالطہ ہے کیوں کہ ان میں کوئی بھی صورت حال مجھ پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ انستھیز یا زدہ مریض کے درد کو بھی ہولناک کہا جا سکتا ہے جس کی کھوپڑی کھولی جا رہی ہو۔ میں کائنات کا مزید ادراک نہیں کر پاؤں گا۔ میں صرف ظاہر ہی کو دیکھ پاؤں گا۔

تصوریت پسندوں کی تعلیمات کے مطابق 'زندگی گزارنا' اور 'خواب دیکھنا' جیسے الفاظ ایک سطح پر باہم مماثل ہیں۔ میرے لیے ہزارہا شبیہیں ایک شبیہ میں شامل ہو جائیں گی۔ ایک

انتہائی پیچیدہ خواب ایک سادہ خواب میں شامل ہو جائے گا۔ دوسرے یہ خواب دیکھیں گے کہ میں پاگل ہوں۔ میں ظاہر کا خواب دیکھوں گا۔ جب کہ روئے عرض پر سبھی انسان دن رات ظاہر کے بارے میں سوچتے ہیں، تو کیا خواب رہے گا اور کیا حقیقت، زمین یا ظاہر؟

میں رات کے خالی لمحوں میں گلیوں میں چلنے پھرنے کے قابل ہوں۔ طلوع آفتاب مجھے گارے پارک کے کسی بنچ پر حیرت زدہ کرتا ہے، اسرار نامہ کے بند کے بارے میں سوچتے ہوئے (یا سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے) جس میں کہا گیا ہے کہ ظاہر گلاب کا سایہ اور نقاب کا اوڑھنا ہے، یہاں اسی سے جڑی ہوئی ایک بات کا اضافہ کرتا ہوں کہ خود کو خدا کی ذات میں گم کر دینے کے لیے صوفی اپنے ہی ناموں کا یا ننانوے خدائی ناموں کا ورد کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ ان کے لیے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ میں اس راستے پر سفر کرنے کا خواہش مند ہوں۔ شاید محض اسے مسلسل سوچنے کے عمل کے ذریعے ہی میں اس سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ شاید اس سکے کے پردے میں خدا موجود ہے۔

# لافانی

''سولومون نے کہا 'زمین پر کوئی شے نئی نہیں ہے'۔ جیسے افلاطون کا تخیل تھا کہ تمام علم بازیافت کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے ہی سولومون نے کہا تھا 'تمام انوکھاپن نسیان کے سوا کچھ نہیں۔''
(فرانسس بیکن۔ مضامین VIII)

لندن میں جون 1929ء کے ابتدائی عشرے میں سمیرنا کے قدیم کتب کے بیوپاری جوزف کارٹافیلس نے لیوسنج کی شہزادی کے حضور پوپ (1720-1715) کی ''ایلیڈ'' کی کاغذ کے چوتھائی تختے جتنے حجم کی چھ جلدیں پیش کیں۔ شہزادی نے کتابیں خرید لیں۔ کتابیں حاصل کرنے پر اس نے بیوپاری سے چند الفاظ کا تبادلہ کیا۔ شہزادی سے ہی ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر دلچسپ اور خستہ حال انسان تھا، بھوری آنکھوں اور بھوری داڑھی اور عجیب حد تک مبہم نقوش والا۔ وہ روانی اور بے نیازی کے ساتھ متعدد زبانوں میں اظہار مدعا کرسکتا تھا۔ محض چند منٹوں میں وہ فرانسیسی سے پہلو بدل کر انگریزی میں بات کرنے لگا اور پھر انگریزی سے سالونیکا ہسپانوی اور میکاؤ پرتگیزی کی ملی جلی معماتی زبان بولنے لگا۔ اکتوبر میں شہزادی کو زیوس کے ایک زائر سے معلوم ہوا کہ کارٹافیلس سمیرنا لوٹتے ہوئے بحری سفر کے دوران فوت ہوگیا اور یہ کہ اسے آئیوس کے جزیرے پر ہی دفنا دیا گیا۔ ایلیڈ کی آخری جلد میں شہزادی کو یہ مسودہ دستیاب ہوا۔

اصل مسودہ انگریزی میں لکھا گیا جو لاطینی محاوروں سے مزین تھا۔ جو ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے وہ حرف بہ حرف ہے۔

(1)

جہاں تک مجھے یاد ہے میری مشقتوں کا آغاز تھیبز ہیکاٹامپائیلس میں ایک باغ سے ہوا جب ڈائیوکلیٹین مسند اقتدار پر جلوہ افروز تھا۔ (مجھے اس پر کوئی افتخار نہیں ہے کہ) میں حالیہ مصری جنگوں میں شامل ہوا تھا۔ میں بیرینس میں سرخ سمندر کے ساحلی علاقے میں چار حصوں میں منقسم ایک لیجن دستے کا افسر تھا۔ بخار اور جادو نے بہت سے جوانوں کو نگل لیا جنھوں نے شان دار طریقے سے فولاد کی دھار سے مرنے کی خواہش کی تھی۔ موریطانیہ کی فوج شکست سے دوچار ہوئی۔ جو سرزمین پہلے باغی شہروں کے تسلط میں تھی، پلوطانی دیوتاؤں سے منسوب ہوگئی۔ مغلوب اسکندریہ نے بے کار ہی سیزر سے رحم کی درخواست کی۔ ایک سال کے اندر اندر سپاہیوں نے فتح کی نوید سنائی۔ لیکن میں تو جنگ کے دیوتا 'مریخ' کی جھلک دیکھنے سے محروم رہا۔ اس محرومی نے مجھے مبتلائے اذیت رکھا اور شاید یہی سبب تھا کہ میں خاموشی کے ساتھ ہولناک اور منتشر صحراؤں سے پرے لافانی انسانوں کے خفیہ شہر کی دریافت کی مہم پر نکل پڑا۔

جیسا کہ بیان کر چکا ہوں میری مشقتوں کا آغاز تھیبز میں ایک باغ میں ہوا۔ تمام رات میں سو نہیں سکا کیونکہ کوئی بات میرے دل میں ہنگامہ برپا کیے ہوئے تھی۔ میں علی الصبح سے کچھ دیر پہلے بیدار ہوا۔ میرے غلام سو رہے تھے۔ چاند کا رنگ ویسا ہی تھا جیسا غیر محدود ریت کا۔ ایک خون آلود گھڑسوار پژمردگی کے ساتھ مشرق کی سمت سے آیا۔ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر وہ گھوڑے سے نیچے گر پڑا اور ایک نقاہت آمیز اور غیر تسکین پذیر آواز میں لاطینی زبان میں اس دریا کا نام پوچھا جو شہر کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔

میں نے جواب دیا کہ یہ مصر کا دریا ہے جو بارشوں کے پانی سے بھرا ہوا تھا۔

''میں جس دریا کی کھوج میں ہوں وہ کوئی اور ہے''۔ اس نے یاس کے ساتھ جواب دیا ''ایک مخفی دریا جو انسان کو موت کی بندش سے مکت کر دیتا ہے''۔

سیاہ خون اس کی چھاتی میں سے بہہ رہا تھا۔ پھر بولا کہ اس کا آبائی قصبہ گنگا کی دوسری

جانب ایک پہاڑ پر واقعہ تھا اور یہ کہ اس پہاڑ کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر کوئی مغرب کی طرف سفر کرے، دنیا کے اختتام تک، تو وہ اس دریا تک پہنچ جائے گا جس کا پانی حیات جاوداں عطا کرتا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ دریا کے دور دراز کنارے پر لافانی انسانوں کا شہر آباد ہے جو برجوں، دائروی تماشا گاہوں اور مندروں سے مزین ہے۔ صبح ہونے سے پہلے وہ مر گیا۔ لیکن میں نے اس شہر اور اس کے دریا کو دریافت کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ جلاد نے تفتیش کی تو موریطانیہ کے چند قیدیوں نے مسافر کی اس داستان کی تصدیق کردی۔ ایک شخص کو ایلائیسین کا میدان یاد تھا جو زمین کے آخر میں واقع تھا جہاں انسانوں کی زندگیاں لافانی ہیں۔ ایک دوسرے شخص کو وہ چوٹیاں بھی یاد تھیں جو پاکٹولس دریا کا منبع تھیں جس کے باشندے ایک صدی لمبی عمر پاتے تھے۔ روم میں مجھے فلاسفہ سے مباحث کا موقع ملا جن کا خیال تھا کہ انسانی زندگی بڑھانے کا مطلب اس کی روحانی اذیت کو بڑھانا اور اس کی موت کو کئی چند کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا میں کبھی لافانی انسانوں کے شہر پر یقین قائم کر پاؤں گا یا نہیں۔ تب اس کو ڈھونڈنے کی کاوش ہی میرے لیے کافی تھی۔ گیٹولیا کے صوبے دار فلاویس نے اس مہم کے لیے دو سو سپاہیوں کا دستہ میرے ہمراہ کیا۔ میں نے چند بھاڑے کے سپاہی بھی ساتھ لیے جن کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام راستوں سے واقف تھے لیکن وہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے ہمارا ساتھ چھوڑا۔

بعد کے واقعات نے ہمارے سفر کے ابتدائی ایام کی یادداشت کو ناقابل شناخت بنا دیا کہ اب انھیں ایک ترتیب میں یاد کرنا ممکن نہیں۔ ہم آرسینو سے روانہ ہو کر جھلستے صحرا میں داخل ہوئے۔ پھر گوشہ نشینوں کے خطے میں سے گزرے جو سانپوں کو نگل جاتے اور باہمی لسانی رابطے سے ناآشنا تھے۔ گارامینٹز کے شہر سے گزرے جو اپنی عورتوں کا اشتراک کرتے اور شیروں کا گوشت کھاتے تھے۔ پھر آیوگائلوں کے شہر گئے جو ٹارٹرس کی پوجا کرتے تھے۔ مختلف صحراؤں میں مارے مارے پھرے، سیاہ ریت والے صحرا جہاں مسافر رات کا وقت سفر کے لیے استعمال کرتے کیوں کہ دن کی حرارت ناقابل برداشت ہوتی۔

بہت دور میں نے ایک پہاڑ کی جھلک دیکھی جس سے سمندر کو نام دیا گیا تھا۔ اس کے اطراف میں سپرج کے دودھیا رس والے پودے اگے تھے جو تریاق کا جوہر رکھتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر ساطیر رہتے تھے، کٹھور اور وحشی انسانوں کی قوم جو شہوت پرستی میں مبتلا تھی۔ ان وحشیانہ خطوں کے وسط میں جہاں زمین عفریتوں کو پالتی پوستی ہے، ایک معروف شہر پنہاں تھا جو ہم سب کو ناقابل ادراک معلوم ہوا۔ ہم نے اپنا سفر جاری رکھا کیونکہ تب واپسی کا سوچنا بھی باعث خجالت ہوتا۔ ہم لوگوں میں جو بے باک تھے، چاند کے رخ چہرے موڑ کر سوئے۔ بخار نے انہیں جلا ڈالا۔ تالابوں کے نجس پانیوں سے باقیوں نے پاگل پن اور موت کا زہر پی لیا۔

تب فرار کا عمل شروع ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہاں غدر مچ گیا جسے دبانے کے لیے میں نے بلاتردد سفاکانہ رویہ اپنایا اور اگرچہ کسی سے ناانصافی نہیں کی پھر بھی ایک فوجی کپتان کے ذریعے مجھے اطلاع ملی کہ باغی (جو اپنے ایک رفیق کے قتل کا انتقام لینا چاہتے تھے) میرے قتل کی سازش تیار کر رہے تھے۔ میں اپنے چند وفادار سپاہیوں کے ساتھ پڑاؤ سے فرار ہو گیا۔ لیکن صحرائی طوفان اور اندھی رات کے دوران میں انھیں کہیں کھو بیٹھا۔

کریٹن قبیلے کے لوگوں کے ایک تیر نے مجھے زخمی کیا۔ پانی کے بغیر میں کئی دن بھٹکتا رہا یا پھر ایک عظیم دن کو، سورج یا میری پیاس یا میری پیاس کے خوف نے کئی چند کر دیا۔ میں نے اپنے راستے کا انتخاب کلیتاً اپنے گھوڑے کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دیا۔ علی الصبح دور کا منظر معبدوں اور میناروں سے بھر گیا۔ میں نے ایک خفیف اور روشن بھول بھلیوں کا خواب دیکھا جس کے وسط میں ایک کنواں تھا۔ میرے ہاتھوں نے اسے چھوا، میری آنکھیں اسے دیکھ سکتی تھیں لیکن لہردار راستے اس قدر الجھے ہوئے اور پیچیدہ تھے کہ میں جان گیا کہ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاؤں گا۔

(۱۱)

آخر میں اس ڈراؤنے خواب کے الجھاؤ سے نکلا، تو خود کو کمر کے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ پتھر کے ایک مستطیل طاقچہ میں لیٹے ہوئے پایا جو ایک عام قبر سے زیادہ بڑا نہیں

تھا اور ایک پہاڑ کی سنگین ڈھلوان میں کھوکھلی جگہ میں بنایا گیا تھا۔ اس کی دیواریں سیلن زدہ تھیں جنھیں ہموار کرنے میں انسانی ہاتھوں ہی کا نہیں وقت کے گزران کا بھی کردار تھا۔ اپنے سینے میں مجھے پُر اذیت ٹیس محسوس ہوئی اور پیاس سے جھلسنے کا احساس ہوا۔ میں نے سر اٹھایا اور نحیف آواز میں چلایا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک آلودہ پانی کی جھیل خاموشی سے ملبے اور ریت سے مزاحم ہوتی ہوئی بہہ رہی تھی۔

دوسرے کنارے پر سورج کی آخری (یا اولین) کرنوں میں لافانی انسانوں کا واضح شہر اپنی چمک دکھا رہا تھا۔ میں نے مضبوط عمارتیں، محرابیں، عمارتوں کی پیشانیاں اور عوام گاہیں دیکھیں۔ شہر کی بنیاد ایک سنگلاخ سطح مرتفع پر قائم تھی۔ میرے طاقچہ سے مشابہہ سو یا اس سے بھی زیادہ بے قاعدہ طاقچوں نے پہاڑ اور وادی کو شکن آلود کر رکھا تھا۔ ریت میں کھوکھلے گڑھے کھدے تھے۔ ان آفت زدہ بلوں، ان طاقچوں سے بھوری چمڑی اور بے طرح بڑھی ہوئی داڑھیوں والے برہنہ انسان نمودار ہوئے۔ میں نے سوچا میں انہیں پہچانتا تھا۔ یہ ان گوشہ نشینوں کی نجس نسل سے تھے جو خلیج فارس کے ساحلوں اور ایتھوپیا کی گپھاؤں میں بگاڑ کا باعث بنے۔ میرے لیے یہ بات تعجب کا باعث نہیں تھی کہ یہ بول نہیں سکتے اور نہ ہی یہ بات کہ یہ سانپوں کو نگل جاتے تھے۔

میری پیاس کی شدت نے مجھے غیر محتاط بنا دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ریت سے تیس ایک قدموں کے فاصلے پر ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور خود کو سر کے بل پہاڑ سے نیچے گرا لیا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے خون آلود چہرے کو سیاہ پانی میں ڈبو لیا اور ایک جانور کی سی بے تابی سے پانی پیا۔ نیند اور ہذیان میں پھر سے مبتلا ہو جانے سے قبل میں نے یونانی زبان میں غیر واضح طور پر چند لفظ بولے ''زیلیا والے، ثروت مند کا رئیس ٹروجن جنھوں نے ایسپوس کا سیاہ پانی پیا۔''

میں نہیں جانتا کتنے دن اور راتیں مجھ پر سے گزر گئیں۔ درد سے کراہتے ہوئے، گپھا کے سائبان کے حصول نو سے قاصر، اجنبی ریت پر برہنہ لیٹے ہوئے میں چاند اور سورج کو میری

قسمت سے کھلواڑ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گوشہ نشینوں، جو اپنی وحشت میں بالکل طفلانہ تھے، نے زندہ رہنے یا مرجانے میں میری کوئی مدد نہیں کی۔ بے کار ہی میں نے ان سے استدعا کی کہ وہ مجھے مار دیں۔ ایک روز میں نے چقماق کے پتھر کی نوک سے اپنی رسیوں کو کاٹ ڈالا۔ اگلے دن میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس قابل تھا کہ خیرات مانگوں یا چوری کرسکوں۔ میں روم کے لیجن کے دستے کا فوجی افسر مارکیوس فلیمنیس روفوس، میں نے سانپ کے گوشت کا اپنا اولین قابل نفرت حصہ کھایا۔

غیر فانی انسانوں کو دیکھنے اور فوق الانسانی شہر کو چھونے کی حرص نے میری آنکھوں سے نیند چھین لی۔ جیسے ان گوشہ نشینوں نے میرے مقصد کو بھانپ لیا ہو، وہ بھی نہ سوئے۔ ابتداءً میں نے قیاس کیا کہ وہ میری نگرانی کر رہے تھے۔ بعدازاں فرض کیا کہ شاید میرے اضطراب سے ان کا دھیان بھرشٹ ہوا تھا، جیسا کہ کتوں کا وطیرہ ہے۔ اس وحشی قصبے سے روانگی کے لیے میں نے سب سے مصروف وقت کا انتخاب کیا یعنی شام کے آغاز کا وقت، جب تقریباً سبھی لوگ اپنے شگافوں اور گڑھوں سے برآمد ہوتے اور غروب ہوتے ہوئے سورج کا نظارہ کرتے تھے، اس کی طرف دیکھے بغیر۔ میں نے باآواز بلند عبادت کی، الہامی خوشنودی کے لیے کم اور اپنے مخصوص کلام سے اس قبیلے کو ڈرانے کے لیے زیادہ۔

میں نے ریت کے ٹیلوں سے مزاحم ندی کو پار کیا اور شہر کی طرف ہولیا۔ ذہنی پراگندگی کے ساتھ دو یا تین افراد نے میرا تعاقب کیا۔ وہ (اس نسل کے دیگر انسانوں کی مانند) دھان پان سے تھے۔ ان سے خوف زدہ ہونے کے بجائے مجھ میں ان کے لیے کراہت کا احساس پیدا ہوا۔ مجھے مختلف بے قاعدہ گھاٹیوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑا جو قدیم شکارگاہوں جیسی تھیں۔ شہر کی شان و شوکت کے زیر اثر مجھے لگا کہ یہ بالکل قریب ہی تو تھا۔ آدھی رات کے قریب میں نے اس کی دیواروں کے گہرے سایوں پر قدم رکھا جو زرد ریت پر مختلف شبیہوں سے اٹے پڑے تھے۔ میں ایک طرح کی مقدس دہشت میں مبتلا ہو کر ٹھٹھک گیا۔ انوکھا پن اور صحرا انسان کو اس قدر حقارت آمیز لگتا ہے کہ مجھے یہ بات مسرت بخش معلوم ہوئی کہ گوشہ نشینوں میں سے ایک فرد آخر تک

میرے تعاقب میں تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور (سوئے بغیر) دن کا اجالا پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ شہر کی بنیاد ایک پتھریلی سطح مرتفع پر قائم تھی۔ بلند اور ڈھلوانی اطراف والی اس سطح مرتفع پر چڑھنا دشوار تھا۔ بے کار ہی میں نے خود کو اس کے گرد پھراتے ہوئے تھکایا۔ سیاہ بنیادوں میں مجھے کوئی معمولی ترین رخنہ بھی نہ مل سکا۔ دیواریں ایسی ہموار تھیں کہ ان میں کوئی دروازہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سورج کی تپش نے مجھے ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور کیا جس کے پچھلے حصے میں ایک گڑھا تھا اور اس گڑھے میں ایک زینہ تھا جو نیچے تاریکی میں اتھاہ گہرائیوں میں اترتا تھا۔

میں اس زینے سے نیچے اترا، تنگ غلام گردش کے انتشار میں سے گزر کر ایک کشادہ دائروی حجرے میں پہنچا جو بدقت دکھائی دیتا تھا۔ نو دروازے اس کوٹھڑی نما جگہ میں کھلتے تھے۔ آٹھ دروازے بھول بھلیوں کو جاتے جو مکارانہ انداز میں پھر سے اسی حجرے کی طرف لوٹ آتی تھیں۔ نواں دروازہ (ایک اور بھول بھلیوں میں سے ہوتا ہوا) ایک دوسرے دائروی حجرے میں کھلتا تھا جو پہلے حجرے کے مشابہ تھا۔

میں ان حجروں کی کل تعداد سے لاعلم تھا۔ میری سیہ بختی اور گھبراہٹ نے انہیں کئی چند کر دیا تھا۔ سناٹا گمراہ کن تھا اور تقریباً مکمل۔ زیر زمین چلنے والی ہوا کے علاوہ، جس کا منبع میں دریافت نہیں کر سکا، پتھر کی گہری تہوں میں کوئی آواز نہیں تھی۔ حتیٰ کہ آہنی رنگت والے پانی کی مہین جھلیلیں جو پتھروں کی دراڑوں میں سے بہہ رہی تھیں، بے آواز تھیں۔ دہشت ناک انداز میں اس مشتبہ دنیا کا میں عادی ہو گیا۔ مجھے یہ بات غیر معمولی لگی کہ یہاں کچھ بھی ممکن تھا سوائے نو دروازوں والے حجرے اور طویل، شاخ در شاخ پھیلی زیر زمین غلام گردشوں کے۔ میں نہیں جانتا کتنا عرصہ میں زیر زمین دنیا میں بھٹکتا رہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ گھر کے ایک الجھے ہوئے خواب میں گاہے بگاہے ایک مرتبہ میں نے وحشیوں کے خبیث قصبے اور اپنے آبائی شہر کو انگوروں کے گچھوں کے درمیان

گڈمڈ کر دیا۔

ایک غلام گردش کے اختتام پر ایک متوقع دیوار نے میرا راستہ روکا۔ دور سے روشنی مجھ تک آ رہی تھی۔ میں نے اپنی الجھی ہوئی نگاہیں بلند کیں۔ اوپر، انتہائی بلندی پر مجھے آسمان کا حلقہ دکھائی دیا جو اتنا نیلا تھا کہ ارغوانی معلوم ہوتا تھا۔ ایک زینے کی چند آہنی سیڑھیاں اوپر دیوار تک جاتی تھیں۔ تھکاوٹ نے میرے اعصاب کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ لیکن میں اچک کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بس وقفے وقفے سے خوشی میں اناڑی پن سے سانس درست کرنے تھم جاتا۔ رفتہ رفتہ میں نے ستونوں کے بالائی سروں اور آرائشی حاشیوں، تکونی عمارتوں اور محرابوں، گرینائیٹ اور سنگ مرمر کے پیچیدہ پرشکوہ منظروں کی جھلک دیکھی۔ یوں لگتا تھا کہ میں باہم گندھی ہوئی تاریک بھول بھلیوں کے اندھے خطے سے نکل کر ایک درخشاں شہر میں داخل ہو رہا تھا۔

میں ایک مربع نما مختصر احاطہ، جسے بہتر انداز میں صحن کہا جا سکتا تھا، میں جا نکلا جو بے قاعدہ کونوں اور متغیر بلندی والی تنہا عمارت میں گھرا ہوا تھا۔ اسی مختلف الاضلاع عمارت سے مختلف گنبد اور ستون منسلک تھے۔ اس غیر معمولی تعمیر کی کسی دوسری خصوصیت کی نسبت، مجھے اس کی قدامت نے متاثر کیا۔ مجھے لگا کہ یہ انسان اور زمین کی آفرینش سے بھی پہلے سے موجود تھی۔ یہ واضح قدامت (جو ایک حد تک آنکھوں کو چبھتی معلوم ہوتی تھی) ان لافانی معماروں ہی کی کاوش تھی۔ اول اول احتیاط سے، لیکن بعد ازاں وقت گزرنے پر بے پرواہی سے، اور آخر میں مایوسی کے ساتھ میں اس پیچیدہ محل کی سیڑھیوں اور مرصع فرشوں پر بھٹکتا رہا۔ (ازاں بعد مجھے معلوم ہوا کہ زینوں میں سیڑھیوں کی اونچائی اور چوڑائی ایک سی نہیں تھی۔ اس سے مجھے اپنی غیر معمولی تھکن کو سمجھنے میں مدد ملی جو اس غیر ہمواری کے سبب پیدا ہوئی تھی۔)

''یہ محل دیوتاؤں کا کارنامہ ہے'' میری ابتدائی سوچ کچھ یوں تھی۔ میں نے اس کے غیر آباد حصوں میں سفر کیا اور اپنے خیال کی اصلاح کی۔ ''اسے تعمیر کرنے والے دیوتا مر چکے ہیں''۔ میں نے اس کے عجیب پہلوؤں پر غور کیا اور خود سے کہا ''جن دیوتاؤں نے اسے تعمیر کیا، وہ

پاگل تھے"۔

اس سن رسیدگی کے تاثر میں دیگر تاثرات بھی شامل ہوئے جیسے لامتناہیت کا احساس، اذیت اور دہشت کا احساس، پیچیدہ غیر معقولیت کا احساس۔ میں نے تاریک بھول بھلیوں کو عبور کیا۔ لافانی انسانوں کے درخشاں شہر نے میرے اندر سراسیمگی اور مغائرت پیدا کی۔ بھول بھلیاں انسانی ذہن کو الجھانے کے لیے ارادی طور پر تعمیر کردہ گھر ہیں۔ ان کا طرز تعمیر، جو ایسی مشابہتوں سے پُر ہے، دراصل اسی مقصد کے تابع ہے۔ محل، جسے میں نے خام انداز میں عبور کیا، کی طرز تعمیر میں کوئی منطق کارفرما دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بند کناروں والی غلام گردشیں، ناقابل رسائی بلند دریچے، شان دار پر پیچ دروازے جو راہبوں کی کوٹھڑیوں یا خالی گڑھوں میں جانکلتے تھے، غیر معمولی طور پر گڈ مڈ زینے جن میں سے کچھ میں سیڑھیاں اور کٹہرے تھے جب کہ باقی عالیشان دیوار کے پہلو میں ہوا میں ٹنگے ہوئے تھے اور دو یا تین سیڑھیوں کے بعد تنگ ہو جاتے اور گنبدوں کی اداس تاریکیوں میں چکر کاٹ کر کہیں بھی پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتے تھے۔ میں نہیں جانتا یہ تمام مناظر اس کی ہو بہو مثالیں ہیں جو میں نے یہاں بیان کیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ آئندہ کئی برس تک یہ میرے ڈراؤنے خوابوں کی ترکیب میں شامل رہے۔ میں اب مزید یہ جاننے کے قابل نہیں رہا کہ یہ خصوصیت حقیقت کا بیان ہے یا ان صورتوں کا، جنہوں نے میری راتوں کو بے مدار کیا۔

"یہ شہر" (میں نے سوچا) "اس قدر ہولناک ہے کہ محض اس کا وجود، اس کے باقی رہنے کی حقیقت، حتیٰ کہ اس خفیہ صحرا کے وسط میں اس کی ایستادگی، ماضی اور مستقبل کو نجس کرتی اور کسی حد تک ستاروں کے موافق ہے۔ جب تک یہ شہر موجود ہے، دنیا میں نہ کوئی خوش رہ سکتا ہے اور نہ کسی طرح کی دلیری کی توقع کی جاسکتی ہے۔" میں یہاں اسے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ بے میل الفاظ کا انتشار، ایک شیر یا بھینسے کا جسم جو دانتوں، اعضائے رئیسہ، اور سروں سے آلودہ تھا جنھیں وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے سے جوڑ دیا گیا تھا۔

مجھے اپنی واپسی کے مراحل یاد نہیں ہیں، نہ ہی گرد اور نم سے آلودہ زیر زمین راستہ، جس

سے میں گزرا۔ صرف اتنا علم ہے کہ اس تمام سفر میں یہ خوف مستقل طور پر ساتھ رہا کہ آخری بھول بھلیوں سے نکل کر میں کہیں پھر سے لافانی انسانوں کے گمراہ کن شہر میں نہ جا پھنسوں۔ اس کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں۔ یہ نسیان جواب نا قابل اصلاح ہے، اغلباً ارادی تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاید میرے فرار کے حالات اس قدر ناخوش گوار تھے کہ کسی دن، جس کی یاد بھی گم ہو چکی ہے، میں نے عہد کیا کہ ان حالات کی یاد کو فراموش کر دوں گا۔

(III)

جنہوں نے میری مشقتوں کا حال توجہ سے پڑھا ہے، انہیں یاد ہوگا کہ اس قبیلے کے ایک فرد نے ایک کتے کی مانند دیواروں کے بے قاعدہ سایوں میں میرا تعاقب کیا تھا۔ جب میں آخری کوٹھڑی سے باہر نکلا تو وہ غار کے دھانے پر دکھائی دیا۔ وہ ریت پر لیٹا تھا جہاں وہ بھونڈے پن سے انگلیاں چلا رہا اور ایسی علامات لکھ اور مٹا رہا تھا جو خوابوں میں دکھائی دینے والے حروف سے مشابہ تھیں کہ جنھیں انسان جونہی سمجھ لینے کے قریب ہوتا ہے وہ اچانک آپس میں گڈمڈ ہو کر پھر سے دھندلا جاتے ہیں۔

ابتداً میں نے سوچا کہ شاید یہ کسی قدیم ترین انسانی تحریر کا نمونہ تھے لیکن مجھے یہ خیال لغو معلوم ہوا کیوں کہ جو لوگ لفظ بولنے کی اہلیت نہیں رکھتے، وہ لکھنا کیسے جان سکتے تھے۔ نہ ہی ان علامتوں میں سے کوئی ایک علامت دوسری سے مشابہ تھی۔ یہ حقیقت اس بات کو رد کرتی (یا بعید از قیاس قرار دیتی تھی) کہ وہ با قاعدہ علامات تھیں۔ وہ انھیں بناتا، بغور انھیں دیکھتا، ان کی اصلاح کرتا۔ پھر اچانک جیسے اس کھیل سے اوب جاتا ہو، انہیں ہتھیلی اور کلائی پھیر کر مٹا دیتا۔

اس نے میری جانب دیکھا، جیسے مجھے پہچان نہ پایا ہو۔ مجھے ایسی گہری آسودگی محسوس ہوئی (یا اتنی شدید اور ہولناک میری تنہائی تھی) کہ میں نے واقعتاً فرض کر لیا کہ یہ قدیم گوشہ نشین، جو غار کے فرش پر لیٹا نظر اوپر اٹھائے مجھے دیکھ رہا تھا، میرا ہی منتظر تھا۔ سورج نے زمین کو جھلسا دیا تھا۔ ہم نے آغاز شب کے ستاروں تلے گاؤں کی جانب واپسی کا آغاز کیا تو ریت ہمارے

پیروں کے تلووں کو جھلسا رہی تھی۔

گوشہ نشین آگے آگے چل رہا تھا۔ اسی رات میں نے طے کیا کہ اسے چند الفاظ شناخت کرنا، اور انھیں دہرانا سکھاؤں گا۔ 'کتا اور گھوڑا' (میرے خیال میں) اول الذکر کام کے لیے موزوں ہیں جب کہ کئی پرندے جیسے سیزر کی بلبلیں موخر الذکر کام بھی موزوں انداز میں کر سکتے ہیں۔

ایک انسان کا ذہن چاہے کسی قدر خام ہو، ان بے عقل جانوروں سے بہر حال برتر ہوتا ہے۔ گوشہ نشین کی فرومائیگی اور خستہ حالی نے میرے ذہن میں اوڈیسی کے جان بلب بوڑھے کتے آرگس کی یاد تازہ کر دی۔ میں نے اسے آرگس نام دیا اور یہ نام اسے سکھانے کی کوشش کی۔ بار بار ناکامی ہوئی۔ بے جان آنکھوں کے ساتھ، بے حرکت، وہ لگتا تھا ان آوازوں کا ادراک بھی نہیں کر پا رہا تھا جو میں اسے سکھانے کا خواہش مند تھا۔ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہونے کے باوجود، وہ مجھے بہت دور معلوم ہوا۔ ریت پر، لاوے سے بنے ہوئے چھوٹے سفنقس کی مانند لیٹے ہوئے وہ آسمانوں پر اجرام فلکی کو صبح کے جھٹپٹے سے شام کے دھندلکے تک دیکھتا۔ ایسا ممکن نہیں تھا کہ انھیں میرے ارادوں کی کچھ خبر نہ ہو۔

مجھے یاد ہے ایتھوپیا کے باشندوں میں یہ مقولہ عام ہے کہ 'بندر شعوری طور پر صرف اس لیے نہیں بولتے مبادہ انہیں کام کرنا پڑے'۔ میں نے آرگس کی خاموشی کو شک یا خوف سے تعبیر کیا۔ اس واضح قیاس سے میں دوسرے قیاسات کی طرف راجع ہوا، کہیں زیادہ غیر محتاط قیاسات۔ میں نے سوچا کہ آرگس اور میں مختلف کائناتوں کے باشندے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے ادراکات اگرچہ ایک سے تھے لیکن آرگس انہیں ایک مختلف انداز میں یکجا کرتا اور ان سے کہیں مختلف اشیاء کا تصور قائم کرتا تھا۔ شاید اس کے لیے کوئی شے موجود ہی نہیں تھی، سوائے انتہائی مختصر تحسسات کے ایک چکر دار مسلسل کھیل کے۔

میں نے یادداشت سے تہی اور وقت سے تہی ایک دنیا کو تصور کیا۔ اسماء کے بغیر ایک

زبان کے امکان کے بارے میں سوچا، غیر شخصی افعال اور غیر متصرف اوصاف والی ایک زبان۔ انھی سوچوں میں بہت سے دن انجام پذیر ہوئے اور ان دنوں کے ساتھ ساتھ سال بھی۔ حتی کہ ایک دن مسرت آمیز ایک واقعہ رونما ہوا۔ آسمان سے آہستگی اور تسلسل کے ساتھ بارش برسی۔

صحرا کی راتیں یخ بھی ہوتی ہیں لیکن یہ رات آگ کی طرح گرم تھی۔ میں نے خواب دیکھا کہ تھیسلی کا ایک دریا (جس کے پانیوں کو میں نے ایک طلائی مچھلی لوٹائی تھی) میری اعانت کے لیے آیا تھا۔ سرخ ریت اور سیاہ چٹان پر میں اسے قریب آتے سن سکتا تھا۔ ہوا کی یخ بستگی اور بارش کی تیز سرسراہٹ نے مجھے بیدار کیا۔ میں برہنہ حالت ہی میں اس کی طرف بھاگا۔ رات مدہم ہو رہی تھی۔ زرد بادلوں کے تلے، قبیلے کے لوگوں نے جو مجھ سے کم مسرور نہیں تھے، وجد کی سی کیفیت میں خود کو اس چمکیلی بارش کی بوچھاڑ کے سپرد کر دیا۔ انھیں دیکھ کر کوریبینٹیز (Corybanter) کی یاد تازہ ہوئی جو دیوتا کے حصار میں آئے تھے۔ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے آرگس کراہنے لگا۔ پانی کی دھار اس کے چہرے پر بہہ رہی تھی۔ صرف بارش کے پانی کی ہی نہیں بلکہ (جیسا مجھے بعد میں معلوم ہوا) آنسوؤں کی دھار بھی۔۔ ''آرگس'' میں پکارا ''آرگس''۔

تب مہربان ستائشی لہجہ میں جیسے کئی برسوں سے گم شدہ اور فراموش شدہ کوئی شے دریافت ہو گئی ہو، آرگس نے ہکلاتے ہوئے یہ الفاظ کہے ''آرگس، یولیسز کا کتا''۔ اور پھر میری طرف دیکھے بغیر بولا ''یہ کتا گوبر کے ڈھیر پر لیٹا ہوا ہے۔''

ہم حقیقت کو آسانی سے قبول کر لیتے ہیں غالباً اس لیے کہ جان لیتے ہیں کہ کچھ بھی حقیقی نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ''اوڈیسی'' کے متعلق کیا جانتا تھا۔ یونانی زبان کی ادائیگی اس کے لیے دشوار تھی۔ مجھے اپنا سوال دہرانا پڑا۔

''بہت کم'' اس نے کہا ''ایک انتہائی فرومایہ رجز گو سے بھی کم۔ اس بات کو گیارہ سو

برس ہو چکے، جب میں نے اسے تخلیق کیا تھا۔“

(IV)

اس روز ہر بات مجھ پر آئینہ ہو گئی۔ یہ گوشہ نشین لافانی تھے۔ یہ نالہ اور اس کا ریتلا پانی، وہی دریا تھا جس کا وہ گھڑ سوار متلاشی تھا۔ جہاں تک اس شہر کا تعلق تھا، جس کا شہرہ گنگا تک پھیلا ہوا تھا، قریب نو سو برس ہوئے، لافانی انسانوں نے اسے منہدم کر دیا تھا۔ شہر کے کھنڈرات کی بکھری ہوئی باقیات سے انہوں نے یہ غیر مربوط شہر تعمیر کیا تھا جس کی میں سیاحت کر چکا تھا۔ یہ ان غیر معقول دیوتاؤں کا معبد بھی تھا جو دنیا پر حکومت کرتے تھے اور جن کے بارے میں ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ وہ انسان سے مشابہہ نہیں تھے۔ اس شہر کی تعمیر وہ آخری علامت تھی جس کی طرف لافانی انسان راغب ہوئے۔ یہ علامت اس وقت کی طرف ایک اشارہ بھی ہے جب ہر جسمانی محنت کو بے کار تصور کر کے، انھوں نے خیال کی سطح، خالص تفکر کی سطح پر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے یہ عماراتی ڈھانچہ کھڑا کیا، پھر اسے فراموش کر دیا اور غاروں میں رہنے چلے گئے۔ اپنے خیالات میں مستغرق ہو کر انہوں نے شاذ ہی کبھی خارجی دنیا کے مشاہدے پر توجہ کی۔

یہ باتیں مجھے ہومر نے بتائی تھیں جیسے کوئی بچے کو سبق دے۔ اس نے مجھے اپنے بڑھاپے اور اپنے آخری سفر کی روداد بھی بیان کی جو یولیسز ہی کی طرح اس مقصد کے تحت کیا گیا تھا کہ اس قوم تک رسائی حاصل کی جائے جو نہیں جانتے کہ سمندر کیسا مظہر ہے، نہ ہی نمک لگا ہوا گوشت کھاتے ہیں، نہ جنہیں یہ معلوم تھا کہ پتوار کس بلا کا نام ہے؟ وہ لافانی انسانوں کے شہر میں سو سال تک رہا۔ جب اسے مسمار کیا گیا تو وہی تھا جس نے تجویز پیش کی کہ ایک دوسرا شہر تعمیر کیا جائے۔ یہ بات ہمارے لیے تعجب خیز نہیں ہونی چاہئے کہ روایت مشہور ہے کہ ایلیون کی جنگ کی رجز گانے کے بعد اس نے مینڈکوں اور چوہوں کی جنگ کی رجز گائی۔ وہ ایک دیوتا جیسا تھا جس نے پہلے ایک کائنات تخلیق کی اور پھر اس میں انتشار بھر دیا۔

لافانی ہونا قطعاً غیر معمولی بات نہیں ہے۔ سوائے انسان کے سبھی مخلوقات لافانی ہیں

کیونکہ وہ موت سے لاعلم ہیں۔ الہامی، دہشت ناک اور نا قابل فہم بات انسان کا یہ جان لینا ہے کہ وہ لافانی ہے۔ میں نے غور کیا کہ مذاہب کی موجودگی کے باوجود انسانوں میں لافانیت پر اعتقاد غیر معمولی طور پر کم ہے۔ اسرائیلی، عیسائی اور مسلمان ابدیت کے قائل ہیں۔ لیکن جو تقدس مآبی وہ اس دنیا سے منسوب کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف اسی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ جب کہ ان کے نزدیک باقی سبھی دنیائیں جو لامحدود ہیں، اسی ایک دنیا کی جزا یا سزا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مخصوص ہندوستانی مذاہب کا ''چکر'' کا تصور مجھے زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس چکر میں، جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ اختتام، ہر زندگی گذشتہ زندگی سے اثر انداز ہوتی اور آئندہ زندگی کے ظہور کا سبب بنتی ہے۔ لیکن کوئی ایک زندگی مجموعی زندگی کا تعین نہیں کرتی۔

صدیوں زندہ رہنے کے نتیجے میں لافانی انسانوں کے اجتماع نے برداشت اور قریب قریب بے اعتنائی کے رویے میں کمال حاصل کیا۔ وہ جان گئے کہ وقت کے لامتناہی وقفہ میں سبھی واقعات سبھی انسانوں کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔ اپنے ماضی یا مستقبل کی نیکیوں کی جزا کے طور پر ہر انسان ساری اچھائی کا مستحق ہے، لیکن تمام تر گمراہی کا بھی جو کہ اس کے ماضی یا مستقبل کی بدکاریوں کی سزا ہے۔ جیسے اتفاقات پر مبنی کھیلوں میں ہوتا ہے کہ جفت اور طاق اعداد میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا، اسی طرح مشاقی اور بھونڈے پن کی اہلیتیں ایک دوسرے کی تردید اور تصیح کرتی ہیں۔

ہر گزراں خیال ایک غیر مرئی نظام کے تابع ہوتا اور کسی خفیہ ہیئت کو نمایاں یا اس کو جاری کر رہا ہوتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے برائی کا ارتکاب کیا تا کہ آنے والی صدیوں میں یہ خیر پر منتج ہو یا ہو سکتا ہے کہ وہ گزری ہوئی صدیوں میں ہونے والے واقعات کا نتیجہ ہوں۔ یوں دیکھا جائے تو ہمارے تمام افعال جائز ہیں گو وہ باہم لاتعلق بھی ہیں۔ کسی اخلاقی یا عقلی معیارات کا وجود نہیں ہے۔ ہومر نے اوڈیسی تخلیق کی۔ اگر ہم وقت کے لامتنہی دور کا تصور کریں جس میں لامحدود واقعات اور تبدیلیاں رونما ہوں تو پھر یہ ناممکن ہے کہ اوڈیسی کو کم از کم ایک

بار تخلیق نہ کیا جائے۔ کوئی انسان کچھ نہیں ہے۔ ایک لافانی انسان سب انسانوں کو محیط ہے۔ کارنیلیس اگریپا کی طرح، میں دیوتا ہوں، میں سورما ہوں، فلسفی ہوں، شیطان اور دنیا ہوں، جو یہ سب کچھ کہہ دینے کا ایک بیزار کن انداز ہے کہ میں موجود نہیں ہوں۔

دنیا کے اس تصور نے کہ یہ مکافاتِ عمل کا ایک نظام ہے، لافانی انسانوں پر شدید اثرات مرتب کیے۔ پہلا ردعمل یہ ہوا کہ ان میں ترحم کی حس عنقا ہوگئی۔ میں ان قدیم گڑھوں کا ذکر کر چکا ہوں جو جھیل کے پرلے کنارے کا علاقہ شکن آلود کیے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص ان میں سب سے گہرے گڑھے میں سر کے بل گرا۔ وہ زخمی نہیں ہو سکتا تھا نہ مر سکتا تھا، اس لیے پیاس سے جلتا رہا۔ جب تک اس کے لیے رسی نیچے پھینکی جاتی، ستر برس بیت چکے تھے۔ نہ ہی انھیں اپنی حالتِ زار کی اصلاح میں دلچسپی تھی۔ ان کا جسم ایک اطاعت شعار پالتو جانور تھا۔ ہر ماہ اسے جتنی خیرات کی ضرورت ہوتی تھی، وہ محض نیند کے چند گھنٹوں کے بھتے، کچھ پانی اور گوشت کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں تھی۔ کوئی ہمیں تیاگیوں کی حیثیت تک کیوں محدود کرے۔

خیال سے زیادہ پیچیدہ مسرت کوئی نہیں ہے۔ اسی مسرت کی سپردگی میں ہم نے خود کو دے دیا۔ وقفے وقفے سے کوئی غیر معمولی مہیج ہمیں مادی دنیا کی جانب مائل کرتا، جیسا اس صبح بارش کے قدیم مظہراتی سرور نے کیا۔ لیکن ایسے مواقع شاذ ہی پیدا ہوتے۔ تمام لافانی انسان مطلق سکوت میں رہنے کے اہل تھے۔ مجھے ایک شخص یاد ہے جسے میں نے کبھی سیدھے کھڑے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کی چھاتی پر ایک پرندے نے گھونسلہ بنا رکھا تھا۔

یہ عقیدہ، کہ کوئی شے ایسی نہیں ہے جو کسی دوسری شے میں اپنی تلافی کی صورت نہ رکھتی ہو، کئی نتائج کا باعث بنا جن میں سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اگرچہ اس بات کی نظریاتی اہمیت کم ہے، لیکن دسویں صدی کی شروعات یا اختتام کے قریب ہمیں ترغیب ہوئی کہ ہم خود کو کرہ ارض پر ہر سمت بکھیر لیں۔ اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''ایک دریا ایسا ہے جس کے پانیوں میں حیاتِ جاوداں کا رس بہتا ہے۔ سو کسی دوسرے خطے میں ایک اور دریا ایسا ہوگا، جس کا

پانی اس اثر کو رفع کرے''۔ دریاؤں کی تعداد غیر محدود نہیں ہے۔ ایک لافانی مسافر جو دنیا کے سفر پر نکلا ہو، آخر کسی روز ان سب دریاؤں کا پانی چکھ لے گا۔ ہم نے اس دریا کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔

موت (یا اس کی تلمیح) انسانوں کو گراں بہا اور رقت انگیز بناتی ہے۔ اپنی اسی المیاتی کیفیت کی وجہ سے وہ متحرک رہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جو فعل بھی ان سے سرزد ہوتا ہے، وہ ہو سکتا ہے، ان کا آخری فعل ہو۔ کوئی ایسا چہرہ نہیں ہے جو خواب میں دکھائی دینے والے چہروں کی مانند منتشر ہو جانے کے امکان سے تہی ہو۔ فانی انسانوں کی دنیا میں ہر شے بازیافت ناپذیر اور مہلک ہے۔ جبکہ دوسری طرف لافانی انسانوں کا ہر فعل (اور ہر خیال) دیگر افعال یا خیالات کی گونج ہے جو کسی واضح آغاز کے بغیر ماضی میں ہوئے، یا پھر ایسے افعال و خیالات کی معتبر پیش آگہی ہے جو اسے مستقبل میں مسلسل دہرائیں گے۔ کوئی شے ایسی نہیں ہے جو ان گنت آئینوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو۔ کوئی واقعہ کبھی صرف ایک مرتبہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی کوئی شے حتمی طور پر غیر یقینی ہے۔ غم، سنجیدگی، رسم و رواج کی لافانی انسانوں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہومر اور میں تانگیر کے پھاٹکوں سے مختلف راستوں پر ہو لیے۔ میرا خیال ہے، ہم نے ایک دوسرے کو الوداع بھی نہیں کہا۔

(V)

میں نئی بادشاہتوں، نئی سلطنتوں کی سیاحت کرتا پھرا۔ 1066ء کے موسم خزاں میں سٹامپ فورڈ برج پر جنگ میں حصہ لیا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں ہیرولڈ کی فوجوں کے ساتھ تھا جنہیں اپنی منزل کو پانے میں زیادہ عرصہ نہ لگا، یا پھر بد بخت ہیرالڈ ہارڈ ریڈا کی فوجوں کے ساتھ، جو انگریزی سرزمین کو محض چھ فٹ یا اس سے کچھ زیادہ رقبے تک ہی فتح کر پائیں۔

ساتویں صدی ہجری میں بلق کے مضافات میں میں نے مخصوص خطاطی میں، ایسی زبان میں، جسے میں بھول چکا ہوں، ایسے حروف تہجی میں جن سے میں شناسا نہیں رہا، سند باد کی

سات مہمات اور' کانسی کے شہر' کی تاریخ لکھی۔ سمرقند میں ایک جیل کے صحن میں میں نے شطرنج کی ایک بڑی بازی کھیلی۔ میں نے بیکانیر اور بوہیمیا میں علم جوتش کی تعلیم دی۔

میں 1638ء میں کولوزسوار (Kolozsvar) میں تھا اور بعد ازاں لپ زگ میں۔ میں 1714ء میں ابرڈین میں پوپ کی ایلیڈ کی چھ جلدیں خریدیں۔ مجھے یاد ہے میں نے کیسی مسرت سے ان کی ورق گردانی کی۔ 1729ء کے لگ بھگ میں نے فن خطابت کے ایک پروفیسر، جس کا نام غالباً گیام بیٹسٹا تھا، اس نظم کے ماخذ کے متعلق گفتگو کی۔ اسکے دلائل مجھے ناقابل تردید معلوم ہوئے۔ 1921ء میں اکتوبر کی چار تاریخ کو پٹنا جہاز کو، جو مجھے بمبئی لے جارہا تھا، اریٹرین کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا پڑا۔ (یہاں لفظ مسودے میں سے حذف کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بندرگاہ کا نام ہو۔) میں ساحل پر اترا۔ مجھے قدیم صبحوں کی یاد آئی جب میں رومی فوج کا کپتان تھا اور سرخ دریا کے سامنے کھڑا تھا، اور بخار اور جادو اور کاہلی نے میرے سپاہیوں کو ناکارہ بنادیا تھا۔ شہر کے مضافات میں مجھے صاف پانی کا ایک چشمہ دکھائی دیا۔ عادت سے مجبور ہوکر میں نے اس میں سے پانی پیا۔ جب میں ڈھلواں کنارے پر چڑھا تو ایک خاردار جھاڑی نے میرے ہاتھ کی پشت کو چیر دیا جس سے غیر معمولی درد کا احساس ہوا۔ بے اعتقادی کے ساتھ، بولنے سے یکسر قاصر مگر مسرور، میں نے خون کے ست رو قطرے کی پیچیدہ ساخت پر غور کیا۔ ایک بار پھر سے میں فانی تھا۔ میں نے بار بار خود سے کہا کہ ایک بار پھر میں دوسرے انسانوں جیسا تھا۔ اس رات میں دن چڑھے تک سویا رہا۔

ایک سال گزر گیا۔ میں نے ان صفحات کو دوبارہ پڑھا۔ میں تصدیق کرسکتا ہوں کہ ان میں درج معلومات سچی ہیں۔ لیکن اولین ابواب میں اور دیگر ابواب کے چند خاص پیروں میں مجھے کچھ غلط بیانی کا بھی شبہ ہوا۔ ایسا شاید اتفاقی تفصیلات کے بے جا بیان کے سبب ہوا، لکھنے کا ایسا طریقہ کار میں نے شاعروں سے سیکھا تھا۔ ایسا طریقہ کار جو ہر شے کو دروغ سے نجس کردیتا ہے۔ کیوں کہ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کوئی واقعہ تفصیلات سے مالامال ہو لیکن اس کی یاد ان سے تہی ہو۔

میرا یقین ہے کہ میں نے اس کی ایک کہیں زیادہ ذاتی اور داخلی وجہ دریافت کر لی۔ میں اسے ضرور لکھوں گا۔ میری بلا سے چاہے مجھ پر تخیل پرست ہونے کا الزام لگے۔

میری بیان کردہ کہانی غیر حقیقی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں دو مختلف انسانوں کے تجربات آپس میں گڈمڈ ہیں۔ پہلے باب میں ایک گھڑسوار ہے، دریا کا نام معلوم کرنے کا خواہش مند، جو تھیبز کی فصیلوں کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ فلامینس روفس، جو اس شہر کو ’سو دروازوں والا‘ شہر کا نام دے چکا تھا، اسے بتاتا ہے کہ یہ دریا اصل میں ’مصر‘ ہے۔ ان میں سے کوئی بیان اس سے منسوب نہیں ہے بلکہ ہومر سے منسوب ہے، جو ایلیڈ میں واضح طور پر کہتا ہے ’’تھیبز ہیکاٹوم پائیلوس‘‘ اور جو اوڈیسی میں پروٹیس اور یولیسز کی زبانی حتمی انداز میں دریائے نیل کے لیے ’مصر‘ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

دوسرے باب میں رومی باشندہ آبِ حیات پینے کے بعد یونانی زبان میں چند الفاظ کہتا ہے۔ یہ الفاظ بھی ہومر ہی کی طرز نگارش کے آئینہ دار ہیں۔ ان الفاظ کو جہازوں کی معروف فہرست کی آخری سطروں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں چکر دار محل میں وہ ’ایک ندامت جو پچھتاوے جیسی تھی‘ کا ذکر کرتا ہے، تو وہ الفاظ بھی ہومر ہی کے ہیں جس نے اس دہشت کی پیش بینی کی۔ ان بے ضابطگیوں نے مجھے مشوش کیا۔ دیگر جمالیاتی نوعیت کی بے قاعدگیوں نے مجھ پر سچ کو آشکار کیا۔

دوسری نوع کی بے ضابطگیوں کے اشارے آخری بیان میں موجود ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ میں ’سٹامفورڈ برج‘ پر لڑا، کہ میں نے بلق میں سندباد کی سیاحتوں کو رقم کیا اور یہ کہ ابرڈین میں پوپ کی ایلیڈ کا انگریزی ترجمہ خریدا۔ وہاں پڑھا جا سکتا ہے کہ، ’’میں نے بوہیمیا کی طرح بیکانیر میں علم جوتش پڑھایا۔‘‘ ان میں سے کوئی بیان بھی غلط نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انہیں خاص انتخاب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلا تو ایک جنگجو کے حوالے سے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں قاری محسوس کرتا ہے کہ راوی جنگ پر زیادہ توجہ نہیں دیتا بلکہ

انسانی قسمت کی طرف اس کی توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔

اس سے بعد کے بیانات کہیں زیادہ حیران کن ہیں۔ کسی منفی بنیادی تحریک نے مجھے قائل کیا کہ میں یہ سب کچھ قلم بند کروں۔ میں نے ایسا صرف اس لیے کیا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ قابل افسوس ہے۔ ہاں اگر رومن فلامینس روفس راوی ہو تو پھر نہیں۔ لیکن اگر ہومر کی زبانی اسے بیان کیا جائے تو پھر یہ المناک ہوں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ موخرالذکر نے تیرھویں صدی میں سندباد یعنی ایک دوسرے یولیسز کی مہمات کو نقل کیا، اور پھر کئی صدیوں کے بعد ایک شمالی مملکت اور ایک جاہلانہ زبان میں اپنی ایلیڈ کی نئی ہیئتوں کو دریافت کیا۔ جہاں تک بیکانیر والے فقرے کا تعلق ہے، تو اسے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے اسے ایسے صاحب نثر نے لکھا ہے جسے (جہازوں کی فہرست کے مصنف کی مانند) رفیع الشان الفاظ لکھنے کا شوق تھا۔ (ارنسٹو سباٹو کا کہنا ہے کہ ''گیام بیٹسٹا' جس نے نوادرات کے بیوپاری کارٹافیلس سے ایلیڈ کی ہیئت پر بات کی تھی، گیام بیٹسٹا ویکو تھا۔ اسی اطالوی باشندے نے اس دلیل کا دفاع کیا کہ پلوٹو یا اکیلیس کی طرح ہومر ایک علامتی کردار ہے۔)

اختتام قریب ہو تو یادداشت میں شبیہیں باقی نہیں رہتیں صرف لفظ باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ وقت نے ان الفاظ کو الجھا دیا جنہوں نے کبھی میری اُس شخص کے مقدر کے استعاروں سمیت نمائندگی کی، جو کتنی ہی صدیاں میرا ہم سفر رہا۔ میں ہومر رہ چکا ہوں۔ جلد ہی یولیسز کی طرح میں کچھ بھی نہیں رہوں گا۔ جلد ہی میں تمام انسانوں کو محیط ہو جاؤں گا، میں مر جاؤں گا۔

مزید عبارت (1950): گذشتہ اشاعت سے متعلق منظر عام پر آنے والے تبصروں میں سب سے انوکھے تبصرے کا عنوان، جسے سب سے زیادہ شائستہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا، 'بائبل کے انداز میں 'کئی رنگوں کا لبادہ'' (مانچسٹر، 1948ء) ہے۔ یہ ڈاکٹر ناہم کارڈویرو کے انتہائی سرکش قلم کا شاخسانہ ہے اور قریب سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ یونانی منتخب مجموعوں، قدیم لاطینی زبان

کے انتخابات، بن جونسن کی منتخب تحریروں جس نے سینیکا کے چند اقتباسات کی مدد سے اپنے ہم عصروں کو بیان کیا، الیگزینڈر راس کی ''Virgiliuo evangelizans''، جارج مور اور ایلیٹ کی تراکیب اور آخر میں اس روداد کا ذکر کیا ہے جسے قدیم نوادرات کے بیوپاری جوزف کارٹافیلس سے منسوب کیا جاتا ہے۔''

پہلے باب میں وہ پلینی (Historia naturalis, V,8') کی مختصر تحریفات کا ذکر کرتا ہے۔ دوسرے باب میں تھامس ڈی کوئینسی کی 'Writings, III, 439 میں مختصر تحریفات کا بیان ہے،' تیسرے باب میں سفیر' پیرے چانٹ' کے نام دیکارت کے ایک مکتوب میں تحریفات کا ذکر موجود ہے۔ چوتھے باب میں برناڈ شاہ کی 'Back to Methuselab V' سے مختصر تحریفات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ ان تمام بے جا اضافوں یا سرقہ بازیوں سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تمام دستاویز ہی شاید فریب ہے۔

میری رائے میں اس نوع کا نتیجہ نا قابل قبول ہے۔ ''جب اختتام قریب ہو' کارٹا فیلس نے لکھا'' تو یادداشت میں کوئی شبیہہ باقی نہیں رہتی۔ صرف الفاظ رہ جاتے ہیں''۔ الفاظ، الفاظ، اپنی جگہ سے سرکے ہوئے اور حذف کیے ہوئے الفاظ، دوسروں سے منسوب الفاظ، یہ وہ مختصر باقیات تھیں، جو گھنٹوں اور صدیوں کے عمل کے بعد اس کے پاس باقی رہ گئی تھیں۔

# مارٹن فیرو

فوجیں اس شہر سے باہر نکلیں ان کی شان وشوکت مثالی معلوم ہوئی تھی، اور یہ کہ بعد کے دنوں میں وہ واقعی عظیم قرار پائیں، جب رفعت وعظمت نے ان کے قد کو بڑھایا۔ بہت برسوں کے بعد ایک سپاہی واپس آیا اور اپنی زبان میں غیر ملکی لہجے کی آمیزش کے ساتھ اس نے ان واقعات کی روداد سنائی جو اسے ان جگہوں پر پیش آئے تھے جنھیں آئیتوزینگو یا آئے کو چو کہا جاتا تھا۔ یہ واقعات اب یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے یہ کبھی ہوئے ہی نہ ہوں۔

دو آمرانہ حکومتیں یہاں قائم ہوئیں۔ پہلی حکومت کے دور میں چند افراد پلاٹا مارکیٹ میں ایک چھکڑے میں سفید اور زرد آڑو لے کر نمودار ہوئے۔ ایک بچے نے ترپال کا ایک کونا اٹھا کر دیکھا تو اسے توحید پرستوں کے سر دکھائی دیے، خون میں بھیگی ہوئی ان کے داڑھیوں سمیت۔ دوسری حکومت لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے قید اور موت کا استعارہ تھی۔ سب کے لیے وہ بے سکونی، مسلسل تذلیل اور روزمرہ اعمال میں ذلت و رسوائی کا حوالہ تھی۔ یہ سب باتیں اب یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے یہ کبھی تھی ہی نہیں۔

ایک شخص نے، جو بھی الفاظ سے واقف تھا، اپنے خطے کے سبھی پودوں اور پرندوں کا گہری محبت سے مشاہدہ کیا اور انھیں بیان کیا، شاید ہمیشہ کے لیے، اور دھات کے استعاروں کے ذریعے غروب آفتاب کے وقوعات اور چاند کی ہیئتوں کی ہنگامہ خیز روداد لکھی۔ یہ سب باتیں اب یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے یہ کبھی تھی ہی نہیں۔

اس سرزمین میں انسانی نسلیں ایسے عمومی مگر کسی حد تک ابدی تغیرات سے آگاہ تھیں جو فن کا مواد بنتے ہیں۔ یہ سب باتیں بھی اب یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے یہ کبھی تھی ہی نہیں۔

لیکن 1869 کی دہائی میں یا اس کے آس پاس ایک ہوٹل کے کمرے میں ایک شخص نے لڑائی کا خواب دیکھا۔ ایک گاؤچو چرواہا اپنے چاقو کے زور پر ایک سیاہ فام شخص کو اپنے پیروں سے بلند کر دیتا ہے، پھر اسے ہڈیوں کی ایک بوری کی طرح پرے گرا دیتا ہے، اسے درد سے بلکتے اور مرتے دیکھتا ہے، اپنے چاقو کی دھار صاف کرنے کے لیے جھکتا ہے، اپنے گھوڑے کی لگام کھولتا اور اچھل کر یوں آہستگی سے کاٹھی پر سوار ہو جاتا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ فرار ہو رہا تھا۔

یہ بات جیسی ایک بار ہوئی، پھر خود کو دہراتی رہی، لامحدود انداز میں۔ عظیم الشان فوجیں جا چکی ہیں اور جو کچھ باقی بچا ہے، وہ چاقو کی ایک عمومی لڑائی ہے۔ ایک انسان کا خواب سبھی انسانوں کی یادداشت کا حصہ ہوتا ہے۔

# محل کی حکایت

اس دن زرد شہنشاہ نے شاعر کو اپنا محل دکھایا۔ مغرب کی سمت ایک قطار میں موجود اولین بالکونیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے، جو قریب قریب لامحدود دائروی تماشہ گاہ کی سیڑھیوں کی طرح نیچے اترتے چلے جاتے تھے، وہ ایک جنت یا ایک باغ میں پہنچے جس کے آہنی آئینے اور الجھی ہوئی صنوبری جھاڑیوں کی باڑیں ایک بھول بھلیوں کی مانند لگتی تھیں۔ شروع میں بہت خوشی سے انھوں نے خود کو ان میں گم ہو جانے دیا، جیسے کوئی کھیل کھیلنے چلے ہوں، لیکن بعدازاں کچھ اضطراب کے ساتھ کہ اس کے سیدھے راستے معمولی انداز میں موڑ مڑ جاتے لیکن تسلسل کے ساتھ (اور وہ راستے دائروی تھے)۔

آدھی رات کے قریب سیاروں کے مشاہدے اور ایک کچھوے کی بروقت قربانی کے نتیجے میں انھیں اس بظاہر خبیث علاقے سے چھٹکارا حاصل ہوا لیکن گم ہو جانے کے احساس سے پھر بھی نہیں۔ کیوں کہ یہ احساس آخر تک ان کے ساتھ رہا۔

وہ پیش دالانوں، اور صحنوں اور کتب خانوں میں پھرا کیے، اور آبی گھڑی والے ایک ہشت پہلوی کمرے سے گزرے اور پھر ایک صبح ایک مینار میں ایک سنگی انسان کو دریافت کیا جسے بعدازاں انھوں نے ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ صندل سے بنی کشتیوں میں انھوں نے کئی چمک دار دریا عبور کیے یا پھر ایک ہی دریا کو کئی بار پار کیا۔

شاہی خدم و حشم گزرتے تو لوگ ان کے آگے گھٹنوں کے بل جھک جاتے۔ لیکن ایک

دن وہ ایک جزیرے پر پہنچے جہاں ایک فرد ان کے آگے سجدہ ریز نہ ہوا۔ کیوں کہ اس نے پہلے کبھی خدا کے بیٹے کا دیدار نہیں کیا تھا۔ جلاد کو اس کا سر تن سے جدا کرنا پڑا۔

سیاہ گیسوؤں، اور سیاہ رقص اور پیچیدہ سنہری نقابوں کو ان کی آنکھوں نے بے نیازی سے دیکھا۔ حقیقت اور خواب آپس میں مدغم ہو کر گڈمڈ ہو گئے، یا پھر حقیقت، خواب ہی کی مختلف ہیئتوں میں سے ایک تھی۔ یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ زمین باغوں، تالابوں، تعمیراتی ڈھانچوں اور شان دار ہیئتوں کے سوا بھی کچھ تھی۔ ہر سو قدموں کے فاصلے پر مینار ہوا میں رخنے ڈالتے دکھائی دیتے۔ آنکھ کے لیے ان کی رنگت مماثل تھی۔ لیکن ان میں سب سے پہلے مینار کی رنگت زرد تھی اور آخری مینار کی قرمزی۔ اتنے نفیس ان کے درجات تھے اور اتنا طویل ان کا سلسلہ۔

یہ آخری سے پہلے واقعہ ایک مینار کا اختتام ہی تھا کہ شاعر (جو ان عجائبات سے غیر متاثر معلوم ہوتا تھا جنھوں نے باقی سبھوں کو اپنے سحر میں لے لیا تھا) نے ایک مختصر نظم پڑھی جو آج ہمارے لیے اس کے نام کا مستحکم حوالہ ہے، اور جس نے، جیسا کہ عالی شان مؤرخین توثیق کرتے ہیں، شاعر کو ابدیت اور موت عطا کی۔ اس کا متن گم ہو چکا ہے۔ ایسے لوگ ہیں جنھیں یقین ہے کہ یہ ایک ہی مصرعے پر مشتمل تھی جب کہ باقیوں کے خیال میں محض ایک لفظ پر۔

سچ، غیر معمولی سچ یہ ہے کہ نظم میں دیوہیکل محل پنہاں تھا، مکمل اور باریک ترین تفصیلات کے ساتھ، سبھی قابل تعظیم چینی کے ظروف اور ان پر بنے نقش و نگار، اور چاندنی رات کی روشنی اور اس کے سایوں، اور فانی انسانوں اور دیوتاؤں کے عظیم الشان شاہی خانوادوں اور اژدھوں کے ساتھ جو اس میں لامتناہی مدت سے رہائش پذیر تھے۔ سبھی خاموش ہو گئے۔ لیکن شہنشاہ نے پکار کر کہا، ''تم نے میرا محل مجھ سے چرا لیا۔'' اور جلاد کی آہنی تلوار نے شاعر کی زندگی کی ڈور کاٹ ڈالی۔

دوسروں نے یہ کہانی مختلف انداز میں بیان کی۔ دنیا میں کوئی دو اشیا ایک جیسی نہیں ہو سکتی ہیں۔ ان کے مطابق جونہی شاعر نے اپنی نظم سنائی، محل غائب ہو گیا جیسے آخری لفظ کے ادا ہوتے ہی دھویں یا مرغولے کی صورت پردہ خاک سے مٹ گیا۔ ایسی اسطوریات بلاشبہ ادبی

قصوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔شاعر شہنشاہ کا غلام تھااور اسی حالت میں مارا گیا۔اس کی نظم فراموشی کی بھینٹ چڑھ گئی کیوں کہ وہ اسی کی مستحق تھی۔اور اس کے پیروکار ابھی تک اسی لفظ کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور نہ ہی وہ اسے کبھی تلاش کر پائیں گے، جو کائنات کو محیط ہے۔

# مسئلہ

چلیے فرض کیجیے کہ ٹولیڈو میں کسی کو ایک کاغذ ملا جس پر عربی میں کچھ لکھا ہوا تھا اور ماہرین علم قدیم نگارشات نے یقین سے کہا کہ یہ تحریر اسی سیڈ ہیمیٹ بینگلی کی ہے جس سے سروانتیس نے ڈان کیخوتے کا کردار لیا تھا۔ اس عبارت میں ہم پڑھتے ہیں کہ ہیرو، (جو ہم سبھی جانتے ہیں تلوار اور نیزے سے مسلح سپین کی سڑکوں پر گھومتا پھرا، مختلف وجوہات کے تحت دوسروں کو چنوتی دیتا ہوا۔) اپنی بہت سی لڑائیوں میں سے ایک کہانی کے اختتام پر یہ جان لیتا ہے کہ اس کے ہاتھوں ایک شخص مارا گیا تھا۔ اس موقع پر وہ اقتباس ختم ہو جاتا ہے۔ مسئلہ یہ قیاس کرنے یا اندازہ لگانے کا ہے کہ اس پر ڈان کیخوتے کا ردعمل کیا ہوتا؟

جیسا کہ میں سمجھتا ہوں تین ممکنہ صورتیں ہیں۔ پہلی صورت منفی ہے۔ کچھ بھی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا کیوں کہ ڈان کیخوتے کی التباسی دنیا میں موت جادو سے زیادہ غیر معمولی شے نہیں ہے اور کسی ایک انسان کو مارنا ایک ایسے شخص کے لیے پریشانی کا باعث نہیں ہے جو بلاؤں اور جادوگروں کے خلاف برسرپیکار ہو یا ایسا سوچتا ہو کہ ایسا ہی ہے۔

دوسری صورت رقت انگیز ہے۔ ڈان کیخوتے کبھی یہ بات نہیں بھول پایا کہ وہ ایک تخلیق شدہ کردار ہے، جنوں پریوں کی کہانیاں پڑھنے والے الفانسو کیوجینو کا عکس۔ موت کا مشاہدہ کرنا، یہ محسوس کرنا کہ ایک خواب نے اسے قابیل کے گناہ کا ارتکاب کرنے پر مجبور کیا، اسے اپنے خودساختہ پاگل پن سے بیدار کرنا ہے، شاید ہمیشہ کے لیے۔

تیسری صورت شاید سب سے زیادہ معقول ہے۔ایک انسان کو قتل کرنے سے ڈان کیخو تے یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ یہ ہولناک فعل کسی خواب کا شاخسانہ ہے۔ حقیقت حال کی سنگینی اسے اسباب کی ایک متوازی حقیقت کو فرض کرنے پر مجبور کرتی ہے، اور ڈان کیخو تے کبھی اس پاگل پن سے باہر نہیں آئے گا۔

لیکن ایک قیاس اور بھی ہے جو ہسپانوی ذہن (حتیٰ کہ مغربی دنیا کے لیے بھی) اجنبی ہے اور جس کے لیے کہیں زیادہ قدیم، زیادہ پیچیدہ اور زیادہ خستہ حال زمانے کی ضرورت ہے۔ ڈان کیخو تے جواب مزید ڈان کیخو تے نہیں ہے، بلکہ ہندوستانی شاہی سلسلہ کا راج کمار ہے، اپنے دشمن کی نعش کے سامنے کھڑے ہوئے خود بخود یہ جان لیا ہے کہ مارنا اور جنم دینا، الہامی یا جادوئی افعال ہیں جو بھی جانتے ہیں کہ انسانی سطح سے ماورا ہیں۔وہ جانتا ہے کہ موت ایک التباس ہے، جیسے خون میں لتھڑی ہوئی تلوار، جس کا بھار اس کے ہاتھ کو نیچے گراتا ہے، جیسے کہ وہ خود اور اس کی ماضی کی تمام زندگی، اور ان گنت دیوتا اور یہ کائنات۔

# مکالمہ برائے مکالمہ

اے: لافانیت سے متعلق گفتگو میں ہم اتنے منہمک رہے کہ شام اترتی رہی اور روشنی کرنے کا دھیان ہی نہیں رہا۔ اب ہم ایک دوسرے کے چہرے بھی نہیں دیکھ پا رہے۔ بے ساختگی یا نرمی کے ساتھ، جو جذبے سے کہیں زیادہ متاثر کن ہوتی ہے، میسیڈ ونیا فرنینڈیز کی آواز نے پھر سے کہا کہ روح لافانی ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ جسم کی موت ایک یکسر غیر اہم واقعہ ہے اور یہ کہ موت انسان کی زندگی میں ہونے والے انتہائی کم اہم واقعات میں سے ایک ہے۔

میں میسیڈ ونیا کے جیبی چاقو سے کھیل رہا تھا، کبھی اسے کھولتا، کبھی بند کرتا۔ قریب ہی ایک اکارڈین غیر مختتم انداز میں La Coparsita کے سُر بکھیر رہا تھا، یہ معمولی مایوس کن دھن جسے بہت سے لوگ پسند کرتے ہیں کہ غلط ہی انھیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ ایک قدیم دھن ہے۔ میں نے میسیڈ ونیو کو تجویز دی کہ چلو خود کو قتل کر لیتے ہیں تاکہ اس شور کے بغیر اپنی گفتگو جاری رکھ سکیں۔

زی: (ہنستے ہوئے) لیکن مجھے شک ہے کہ آخری لمحے میں تم اپنی بات سے پھر گئے۔

اے: (گہرے اسرار بھرے انداز میں) سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کیا واقعی ہم نے اس رات خودکشی کی تھی یا نہیں۔

# زرد گلاب

نہ اس سہ پہر اور نہ ہی اس سے اگلی کسی سہ پہر کو معروف گیام بٹسٹا میرینو فوت ہوا، کہ جسے (اگر اس کا پسندیدہ استعارہ استعمال کیا جائے تو) شہرت کی متفقہ زبان نے نیا ہومر اور نیا دانتے پکارا۔ لیکن ابھی تک وہ بے آواز واقعہ، جو اس سہ پہر کو رونما ہوا، اصل میں اس کی زندگی میں ہونے والا آخری واقعہ تھا۔

گزرتے برسوں اور عظمت سے آراستہ ماتھے والا شخص منقش پایوں والے کشادہ ہسپانوی بستر مرگ میں لیٹا ہے۔ یہ تصور کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ چند قدموں کے فاصلے پر ایک شفاف چھجا ہے، مغرب کے رخ پر، اور نیچے سنگ مرمر اور لارل کے پھولوں والے پودے اور ایک باغ ہے جس کے مختلف درجے پانی کے ایک مستطیل تالاب میں منعکس ہوتے ہیں۔ ایک پیالے میں ایک عورت نے زرد گلاب رکھا ہے۔ وہ شخص یہ چند ناگزیر مصرعے بڑبڑاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جن سے اب وہ بھی بوریت محسوس کرتا ہے۔

باغ کا ارغوانی رنگ، سبزہ زار کا طمطراق، بہار کا نگینہ، اپریل کی آنکھ۔۔۔۔۔۔

تب وحی کا نزول ہوا۔ میرینو نے گلاب دیکھا جیسا گلاب (حضرت) آدم نے جنت میں دیکھا ہوگا اور اس نے سوچا کہ یہ گلاب خود اپنی ابدیت میں موجود ہے، نہ کہ اس کے الفاظ میں۔ اور یہ کہ ہم ایک گلاب کا ذکر تو کر سکتے یا اس کا حوالہ دے سکتے ہیں لیکن کبھی اسے بیان نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہ ایک کونے میں دراز سنہری سایہ پھیلاتے ہوئے پر افتخار جلدیں، (جیسا کہ اس

نے تخیل میں انھیں دیکھا)، دنیا کا آئینہ نہیں تھیں، بلکہ دنیا میں اضافہ کرتی ہوئی شے تھیں۔

میرینو نے یہ منظر اپنی موت سے پہلے دیکھا اور ہوسکتا ہے ہومر اور دانتے نے بھی ایسا ہی کچھ دیکھا ہو۔

# بورخیس اور میں

یہ وہ دوسرا فرد نہیں ہے جس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔ میں بیونس ایریز میں سے گزرتا ہوں اور ٹھٹھکتا ہوں، کوئی کہہ سکتا ہے، میکانکی انداز میں، داخلے کی جگہ کی محراب اور اس کے اندر دروازے کو دیکھنے کے لیے۔ بورخیس کے بارے میں ڈاک میں خبر وصول کرتا ہوں اور اس کا نام پروفیسروں کی فہرست یا سوانحی ڈکشنری میں دیکھتا ہوں۔

میں ریت والی گھڑی، نقشہ جات، اٹھارھویں صدی کے مخصوص چہروں، الفاظ کی تاریخ، کافی کے ذائقے اور سٹیونسن کی نثر کا دلدادہ ہوں۔ وہ دوسرا بھی انھی دلچسپیوں کا حامل ہے۔لیکن ایک بے کار انداز میں یہ باتیں انھیں ایک اداکار کے اوصاف میں بدل دیتی ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ ہمارا تعلق مخالفانہ ہے۔ میں زندہ ہوں۔ میں خود کو زندہ رکھتا ہوں تاکہ بورخیس اپنا ادب لکھ سکے اور یہ ادب میرا جواز ہے۔

وہ مجھ پر یہ دشواری عائد نہیں کرتا کہ میں تسلیم کروں کہ اس نے چند شائستہ پیراگرافس اکٹھے کر دیے ہیں پھر بھی یہ پیراگرافس مجھے نہیں بچا سکتے شاید اس لیے کہ جو شے اچھی ہے، وہ کسی کی ملکیت نہیں ہے، اس کی بھی نہیں، سوائے زبان اور روایت کے۔ اس معاملے میں میرا مقدر یہ ہے کہ وہ سب کچھ کھو دوں جو کہ میں ہوں، قطعی طور پر، اور مجھ سے متعلق صرف عارضی لمحات ہی اس لائق ہوں گے کہ وہ دوسرے میں باقی رہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے میں مسلسل ہر شے اس کے سپرد کر دیتا ہوں۔ حالاں کہ میں اس کی غلط بیانی اور باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے گمراہ کن

رجحان سے آگاہ ہوں۔

سپینوزا جانتا تھا کہ سبھی اشیا اپنے وجود کے تحفظ کی کوشش کرتی ہیں۔ پتھر چاہتا ہے کہ ہمیشہ ایک پتھر رہے اور ایک شیر ہمیشہ ایک شیر۔ میں بورخیس میں باقی رہوں گا، خود میں نہیں (اگر ایسا ہے کہ میں کوئی فرد ہوں) لیکن اس کی کتابوں کے بجائے دوسری بہت سوں کی کتابوں میں یا ایک گٹار کی بہت شکستہ آواز میں کہیں زیادہ خود کو شناخت کرتا ہوں۔

بہت سال پہلے میں نے کوشش کی تھی کہ مضافات کی اسطوریات سے نکل کر وقت اور لامحدودیت کے کھیلوں میں منتقل کر کے خود کو آزاد کرلوں لیکن یہ کھیلیں اب بورخیس کی کھیلیں ہیں اور مجھے دوسری باتوں کا ادراک کرنا ہوگا۔ اس طرح میری زندگی گزر رہی ہے اور میں ہر شے کھو رہا ہوں۔ ہر شے حالت فراموشی یا دوسرے کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔

میں نہیں جانتا ہم میں سے کون یہ تحریر لکھ رہا ہے۔

# ڈیوچز ریکیوم

اس نے مجھے قتل کر ڈالا
تو کیا پھر بھی میں اس پر بھروسہ کروں۔
جاب13:15

میرا نام اوٹو ڈیٹرچ زرلندے ہے۔ میرے آباؤ اجداد میں سے ایک کرسٹوف زرلندے گھڑ سوار فوج کے حملے میں مارا گیا جو زوندروف کی فتح پر منتج ہوا تھا۔ میرا پرنانا الرچ فارکل 1870 کے اواخر میں مارکینائر کے جنگل میں فرانسیسی نشانے بازوں کے ہاتھوں گولی لگنے سے ہلاک ہوا۔ میرے باپ کپتان ڈیٹرچ زرلندے نے 1914ء میں نامر کے محاصرے اور پھر دو سال بعد دریائے ڈینیوب پار کرتے ہوئے اپنی بہادری کا لوہا منوایا۔ (یہ بہت اہم نکتہ ہے کہ راوی اپنے سب سے ممتاز جدامجد، ماہر الہیات ہبریسٹ جوہنز فورکل (1846-1799) کا ذکر کرنا بھول گیا جس نے ہیگل کی جدلیات کو مسیحیت پر منطبق کیا اور جس کے تورات کے ابواب 'ایپوکریفا' کی متعدد کتابوں کے لفظی تراجم کی ہینگسٹن برگ نے کڑی جانچ کی اور جنھیں تھیلو اور جیسنیس نے سراہا۔ ایڈیٹر کا نوٹ)

جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے ایک دہشت گرد اور قاتل کی حیثیت سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ خصوصی عدالت کا فیصلہ منصفانہ ہے۔ بہت شروع ہی سے میں نے جرم کا

اعتراف کر لیا تھا۔ کل جب عقوبت خانے کا گھنٹہ نو بجائے گا، میں موت کی وادی میں داخل ہو چکا ہوں گا۔ یہ فطری بات ہے کہ اب مجھے آباؤ اجداد یاد آ رہے ہیں۔ میں ان کے سایے کے کس قدر نزدیک ہوں، کسی طور میں ان جیسا بن گیا ہوں۔

مقدمے کے دوران، جو خوش قسمتی سے مختصر دورانیہ کا تھا، میں ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اس موقع پر، خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش، فیصلے کے عمل میں حارج ہونے کے مترادف اور میری بزدلی کا بھی اظہار تصور ہوتی۔ اب صورت حال بدل چکی ہے۔ آج کی رات، جو میری سزا پر عمل درآمد پر منتج ہوگی، میں بلاخوف وخطر بات کر سکتا ہوں۔ مجھے قطعاً خواہش نہیں ہے کہ سزا معاف کی جائے۔ کیوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا لیکن میں چاہوں گا کہ مجھے سمجھا جائے۔ جو لوگ مجھے سننا گوارہ کریں گے، وہ جرمنی کی تاریخ اور دنیا کے مستقبل کا ادراک کر لیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ میری طرح کے کیسز، جواب غیر معمولی اور حیران کن معلوم ہوتے ہیں، جلد ہی عمومی ہو جائیں گے۔ کل میں مر جاؤں گا لیکن میں مستقبل کی نسلوں کا استعارہ ہوں۔

میں 1908ء میں میرین برگ میں پیدا ہوا۔ میرے دو جنون، جواب قصہ پارینہ بن چکے ہیں، لیکن جنھوں نے مجھے کئی ناخوش گوار برسوں کا بار جرات بلکہ مسرت کے ساتھ سہارنے کے اہل بنایا، موسیقی اور مابعد الطبیعات ہیں۔ اپنے سبھی مربیوں کے نام تو یہاں بیان نہیں کر سکتا لیکن دو نام ایسے ہیں جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا، برہمز اور شوپن ہار۔ میں نے اکثر شاعری میں بھی پناہ ڈھونڈی۔ ان دو ناموں میں ایک یکسر جرمنوں جیسے نام ولیم شیکسپیئر کا بھی اضافہ کرنا چاہوں گا۔

بہت پہلے میری دلچسپی الہیات میں بھی رہی۔ لیکن اس حیران کن شعبے (اور عیسائی عقیدے) سے مجھے شوپن ہار نے اپنے سیدھے سادھے دلائل کی مدد سے، اور شیکسپیئر اور برہمز نے اپنی دنیاؤں کے لامحدود تنوع کے ذریعے منحرف کیا۔ میں ایک ایسے گروہ کا تصور کرتا ہوں جو حیرت و استعجاب میں گم، شکر گزاری اور عاجزی کے ساتھ کپکپاتے ہوئے، ان اخلاص مند خالقین

کے کسی شہ پارے کے سحر میں گرفتار ہے۔ وہ یہ جان لے کہ میں بھی انھی کی طرح کبھی اسی سحر کا شکار ہوا تھا، میں ایک مکروہ انسان۔

نٹشے اور سپنگلر میری زندگی میں 1927ء کے قریب وارد ہوئے۔ اٹھارویں صدی کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ کوئی مصنف کسی بات کے لیے اپنے ہم عصروں کے زیر بار احسان نہیں ہونا چاہتا۔ خود کو ایسے ہی ایک اثر سے آزاد کرنے کے لیے، جو مجھے بہت گراں محسوس ہوتا تھا، میں نے ایک مضمون ''Abrechnung mit spendgler'' کے عنوان سے لکھا جس میں یہ وضاحت کی کہ وہ انتہائی غیر مبہم ادبی شاہکار جس کی خصوصیات کو مصنف نے فاؤسٹ کی خوبیوں کے ہم پلہ قرار دیا، وہ گوئٹے کا متفرق ناٹک نہیں، بلکہ ایک نظم 'De rerum natura'' ہے جو بیس صدیاں قبل تخلیق ہوئی۔ (دیگر اقوام سادہ لوحی کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں، اپنے آپ میں رہتے ہوئے، اور اپنے لیے جیتے ہوئے، جیسے معدنیات یا شہاب ثاقب۔ لیکن جرمنی کائناتی آئینے جیسا ہے جس میں سبھی کچھ منعکس ہوتا ہے، دنیا کا اجتماعی شعور بھی۔ گوئٹے اس عالم گیر مذہبی ہم آہنگی کی مثال ہے۔ میں اس کی مذمت نہیں کرتا لیکن مجھے اس میں سپنگلر کے نظریے والا فاؤسٹ جیسا انسان دکھائی نہیں دیتا۔) میں نے تاریخ کے اس فلسفی کی اخلاص مندی، اور اس کی انتہائی جرمن اور عسکری روح کو خراج تحسین پیش کیا۔ 1929ء میں میں نے 'پارٹی' میں شمولیت اختیار کی۔

میں اپنی تربیت کے برسوں کے متعلق کچھ لکھنا چاہوں گا۔ وہ دوسروں کی نسبت میرے لیے کہیں زیادہ کٹھن تھے۔ اگرچہ میں کم ہمت آدمی نہیں ہوں، لیکن تشدد کے ذریعے مجھے پسپا کیا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ہم ایک نئے دور کی دہلیز پر کھڑے تھے، اور یہ کہ یہ دور اسلام اور عیسائیت کے ابتدائی زمانوں کی طرح ایک نئی قسم کے انسان کا متقاضی تھا۔ ذاتی طور پر میرے رفقاء مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ بیکار ہی میں نے خود کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ اس اعلیٰ وارفع مقصد کی خاطر، جس نے ہمیں یہاں اکٹھا کیا، ہمیں اپنی انفرادیت کی نفی کر دینی چاہیے۔

ماہرین الٰہیات کا خیال ہے کہ اگر خدا کی توجہ ایک لحظہ کے لیے بھی اپنے دائیں ہاتھ سے بھٹک جائے جو ان الفاظ کو رقم کر رہا ہے، تو یہ ہاتھ عدم کے منطقے میں داخل ہو جائے گا۔ جیسے کوئی شے بے چمک آگ میں جل کر بھسم ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ بغیر جواز کے کوئی شے موجود نہیں، نہ کوئی پانی کے گلاس کا مزہ لے سکتا، نہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ سکتا ہے۔ البتہ ہر فرد کے لیے یہ جواز مختلف ہوتا ہے۔ میں نے خونین جنگ کا انتظار کیا جس نے ہمارے عقیدے کو ثبوت مہیا کرنا تھا۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں ان جنگوں میں بطور فوجی شامل ہوں۔ کبھی میں خوف زدہ تھا کہ کہیں انگریزی اور روسی بزدلی کی مثال ہمیں گمراہ نہ کر دے۔ لیکن اسے اتفاق کہیے یا تقدیر کا کرشمہ کہ اس نے میرے مستقبل کے بارے میں ایک مختلف فیصلہ کیا۔

1939ء میں یکم مارچ کی رات ٹلسٹ میں گڑبڑ کے آثار پیدا ہوئے جس کی خبر اخبارات میں شائع نہیں ہوئی۔ یہودیوں کی عبادت گاہ کی عقبی گلی میں دو گولیوں نے میری ٹانگ چھلنی کر دی جس کے نتیجے میں اسے قطع کرنا ضروری ہو گیا۔ (کہا گیا تھا کہ زخم بہت سنگین تھا۔ مرتب کا نوٹ) چند دنوں بعد ہماری فوجیں بوہیمیا میں داخل ہوئیں۔ جب نقاروں نے ان کی آمد کا اعلان کیا تو میں ایک خاموش ہسپتال میں لیٹا خود کو شوپن ہار کے فلسفہ میں غرق اور فراموش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جسیم اور نرم و گداز بلی، میری بے ثمر منزل کے استعارے کے طور پر کھڑکی کی دہلیز پر سو رہی تھی۔

میں نے 'Parerga und Paralipomena' کی پہلی جلد میں پڑھا کہ پیدائش کے لمحے سے موت کی ساعت تک انسان پر جو کچھ بیتتا ہے، وہ خود اسی کا متعین کردہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہر کوتاہی ارادی ہوتی ہے، ہر اتفاقی صورت حال، ہر ناکامی ایک پراسرار کامیابی، اور ہر موت ایک خودکشی ہوتی ہے۔ اس خیال سے بڑھ کر ڈھارس اور کس شے سے ملے گی کہ ہم اپنی بدبختیوں کا خود انتخاب کرتے ہیں۔ کہ ذاتی فلسفہ غایات ایک مخفی نظام کا انکشاف کرتا اور انوکھے انداز میں الوہیت سے ہمارے تعلق کو الجھاتا ہے۔

(میں نے بے کار ہی یہ سوال کیا کہ ) کس غیر معلوم ارادے نے اس سہ پہر مجھے مجبور کیا کہ میں ان گولیوں کو قبول کروں اور ٹانگ قطع کراؤں ۔ بے شک جنگ کے خوف سے تو نہیں۔ اتنا میں جانتا ہوں۔ کوئی اس سے بڑی وجہ۔ بالا آخر مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے اسے پا لیا۔ مذہب کے لیے قربان ہو جانا سہل ہے بنسبت صحیح طور پر اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے۔ ایفسس میں جنگلی درندوں سے جنگ اتنی کٹھن نہیں ہے (ہزاروں غیر معلوم شہداء نے ایسا کیا) جتنا عیسیٰ مسیح کا خادم پال بننا۔ پوری زندگی گزارنے کی نسبت محض ایک فیصلہ کن اقدام زیادہ سہل ہوتا ہے۔ جنگ اور عظمت سہل ہوتی ہیں۔ نپولین کی جنگجوانہ مہمات سے کہیں زیادہ دشوار راسکولنیکوف کی مہم تھی۔ 1941ء کی فروری کی سات تاریخ کو مجھے ٹارنوویٹز میں حراست کیمپ کا قائم مقام منتظم مقرر کیا گیا۔

اس عہدے سے وابستہ فرائض کی انجام دہی خوشگوار نہیں تھی۔ لیکن میں نے کوئی خطا غفلت سے نہیں کی۔ بزدل مشکل حالات میں اپنی اصل ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ رحم دل اور متقی انسان، قید خانوں میں اور دوسروں کی اذیت میں اپنی سزا پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلاشبہ نازی ازم ایک اخلاقی تحریک تھی، اخلاقی طور پر دیوالیہ انسانیت کی تطہیر کے لیے تا کہ اسے نیا بنایا جا سکے۔ جنگ میں کپتانوں اور انسانی چیخم دھاڑ کے ہنگام میں ایسی تبدیلی عام بات ہے۔ لیکن ایک آفت زدہ عقوبت خانہ میں معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے، جہاں فریب کن مکار جذبہ ترحم اپنے روایتی گداز کے ساتھ ہمیں ترغیب دیتا ہے۔ ایسے ہی میں نے یہ لفظ 'ترحم' استعمال نہیں کیا۔ زرتشت کے انسان کامل کے نزدیک رحم ایک گناہ کبیرہ ہے۔ (میں اعتراف کرتا ہوں کہ ) خود میں نے ایسا ہی کیا جب انہوں نے ممتاز شاعر ڈیوڈ یروشلم کو بریسلا سے یہاں بھیجا۔

وہ پچاس کے پیٹے میں تھا۔ دنیاوی حوالے سے غریب، راندہ درگاہ، ٹھکرایا ہوا اور ملامت زدہ۔ اس نے اپنے فن کو مسرت کی حمد وثناء کے لیے وقف کیا تھا۔ مجھے یاد ہے البرٹ سورجل نے اپنی کتاب ''Dichtung der Zeit'' میں اس کا موازنہ وٹمین سے کیا تھا۔ یہ موازنہ درست

نہیں تھا۔ وٹمین کائنات کی سطحی، تجریدی اور تقریباً بے نیازانہ انداز میں ستائش کرتا ہے۔ یروشلم محتاط اور یکسر درست محبت کے ساتھ ہر معمولی شے سے حظ حاصل کرتا ہے۔ وہ اعداد و شمار اور فہرستوں کے مغالطے کا شکار نہیں ہوتا۔

میں اس کی عظیم نظم "تسی یانگ، شیروں کا مصور" میں سے اب بھی کئی شش رکنی بحر کے اشعار یاد کر سکتا ہوں۔ یہ نظم شیروں کی کثرت سے دھاری دار اور خاموش اور آڑے ترچھے شیروں کے بوجھ تلے دبی اور الجھی ہوئی ہے۔ نہ ہی میں خود کلامی کے انداز میں لکھی نظم "روزن کرانز فرشتے سے ہم کلام ہوتا ہے" کو کبھی فراموش کر پاؤں گا جس میں سولھویں صدی کے لندن کا ایک بیاج خور بستر مرگ پر اعتراف جرم کے ذریعے بار معصیت سے چھٹکارا پانے کی بے کار کوشش کرتا ہے، کبھی یہ گمان کیے بغیر کہ اس کی زندگی کا مخفی جواز اپنے گاہکوں میں سے ایک گاہک (جسے اس نے بس ایک ہی مرتبہ دیکھا اور پھر اسے فراموش کر دیا) کو شائیلاک کے کردار کا خاکہ بجھانا تھا۔

یاد رہ جانے والی آنکھوں، زردی مائل رنگت اور قریب مکمل سیاہ داڑھی والا ڈیوڈ یروشلم، ہسپانوی یہودیوں کا ایک نمونہ تھا حالاں کہ اس کا تعلق بدنصیب اور قابل نفرت 'اشکنازم' سے تھا۔ میرا رویہ اس کے ساتھ سنگدلانہ تھا۔ نہ جذبہ ترحم اور نہ ہی اس کی عظمت مجھے نرم خوئی پر مائل کر سکی۔ میں اس نکتہ کو ڈیوڈ یروشلم سے ملنے سے کئی سال پہلے ہی پا چکا تھا کہ دنیا کی ہر شے میں ایک ممکنہ جہنم کا تخم موجود ہو سکتا ہے۔ ایک چہرہ، ایک لفظ، ایک قطب نما، سگریٹ کا کوئی اشتہار انسان کو پاگل بنا سکتا ہے، اگر وہ اسے فراموش کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ کیا ایسا شخص پاگل نہیں ہو جائے گا اگر وہ مستقلاً ہنگری کے نقشے کو تصور کرتا رہے؟ میں نے اسی مفروضے کا اپنے کیمپ کے تادیبی قوانین کے ذریعے اطلاق کا فیصلہ کیا۔ اور۔۔۔۔۔ (یہاں یہ ضروری ہے کہ چند سطریں حذف کر دی جائیں۔ مرتب کا نوٹ)

1942ء کے اختتام تک یروشلم اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا۔ 1943ء میں مارچ کی پہلی تاریخ کو اس نے اپنے آپ کو قتل کر لیا۔ (نہ کسی فائل میں اور نہ سورجل کی کتاب ہی میں ہمیں

یروشلم کے نام کا حوالہ ملا۔ نہ ہی اس کا ذکر جرمن ادب کی تاریخوں ہی میں موجود ہے۔ نہ ہی مجھے اس بات پر یقین ہے کہ وہ کوئی فرضی کردار تھا۔ بہت سے یہودی دانشوروں کو اوٹو ڈیٹرچ زرلندے کے حکم پر ٹارنو وٹز میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا جن میں پیانو نواز ایما روزن ویگ بھی شامل تھی۔ ڈیوڈ یروشلم شاید بہت سے افراد کا استعارہ تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ یکم مارچ 1943 کو فوت ہوا۔ راوی ٹلسٹ میں زخمی ہوا۔ مرتب کا نوٹ )

میں نہیں جانتا کہ یروشلم اس بات کو سمجھا بھی تھا کہ نہیں، کہ میرا اس کو تباہ کرنا، میرے اپنے جذبہ رحم کو تباہ کرنے کے مترادف تھا۔ میری نظر میں وہ ایک فرد نہیں تھا، نہ محض ایک یہودی۔ وہ میری روح کے قابل نفرین منطقہ کا استعارہ تھا۔ میں اس کے ساتھ اذیت میں مبتلا رہا۔ اس کے ساتھ ہی مر گیا اور کسی طور اس کے ساتھ کہیں گم ہو گیا۔ اس لیے میں اتنا کٹھور تھا۔

اس دوران ہم جنگ میں فتح کے مسرور ترین دنوں اور راتوں میں مست رہے۔ اس فضا میں، جس میں ہم سانس لے رہے تھے، ایک خاص جذبہ موجود تھا، جو محبت جیسا تھا۔ جیسے اچانک سمندر کہیں قریب ہی ہو، ہمارے دل یوں حیرت اور انبساط سے دھڑکتے ہیں۔ ان برسوں میں ہر شے مختلف تھی حتی کہ ہمارے خوابوں کا ذائقہ بھی۔ (شاید میں کبھی مکمل خوشی نہیں پا سکا لیکن یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ بدبختی کے لیے گمشدہ بہشتوں کی ضرورت ہوتی ہے )

کوئی فرد ایسا نہیں ہے جسے بھرپور زندگی کی خواہش نہ ہو یعنی ان تمام تجربات کی جن سے وہ حظ اٹھا سکے۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے یہ کھٹکا نہ ہو کہ اس کی لامحدود میراث کا کچھ حصہ اس سے چھن جائے گا۔ لیکن یہ درست ہے کہ میری نسل نے تجربے کی انتہاؤں کا حظ اٹھایا، کیوں کہ پہلے اس سے ہمیں عظمت ملی اور پھر شکست۔

1942ء کی اکتوبر یا نومبر میں میرا بھائی فریڈرک مصری صحراؤں میں ایل المین کی دوسری جنگ میں کھیت رہا۔ چند ماہ بعد ایک ہوائی بمباری کے نتیجے میں ہمارا خاندانی مکان تباہ ہو گیا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ ایک دوسری بمباری نے 1943ء کے اختتام پر میری تجربہ گاہ کو مسمار کر دیا۔ وسیع

وعریض براعظموں سے ہراساں، رائج سوئم مر رہا تھا۔ وہ تمام انسانیت سے برسرِ پیکار تھا اور تمام انسانیت اس کے خلاف۔

تب ایک بہت عجیب واقعہ ہوا جس کے بارے میں اب مجھے یقین ہوا کہ میں اسے سمجھ پایا ہوں۔ مجھے خود پر یقین تھا کہ میں اپنے غصے کا جام خالی کرنے کے اہل تھا لیکن اس کی تلچھٹ میں مجھے ایک غیر متوقع ذائقہ ملا، مسرت کا پراسرار، دہشت ناک ذائقہ۔ میں نے اس کی بہت سی وضاحتیں سوچیں لیکن کوئی ایک بھی باعث تشفی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ میں شکست سے خوش تھا کیوں کہ اندر ہی اندر میں اپنے احساس گناہ سے آگاہ تھا۔ صرف سزا ہی مجھے اس احساس سے نجات دلا سکتی ہے۔ تب میں نے سوچا میں اس شکست سے اس لیے بھی خوش تھا کیوں کہ یہ وقوع پذیر ہو چکی تھی کیونکہ یہ ناقابل تنسیخ انداز میں ان تمام وقوعات سے جڑی ہوئی تھی، جو ہو چکے ہیں، جو ہو چکے تھے اور جو ہوں گے، کیوں کہ ان میں سے کسی ایک حقیقی وقوعہ کو برا کہنا یا اس پر تاسف کا اظہار کرنا، کائناتی تنظیم کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ میں ان توضیحات سے خود کو بہلاتا رہا۔ حتیٰ کہ آخر اصل وجہ دریافت ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ہر شخص یا تو ارسطو کے پیروکار کے طور پر پیدا ہوتا ہے یا افلاطون کے۔ یہ بات کچھ یوں ہے جیسے کہا جائے کوئی مجرد دلیل ایسی نہیں ہے جس کی ایک نقل ارسطو یا افلاطون کے مباحث میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ صدیوں اور خطوں میں، نام، چہرے اور لہجے بدل جاتے ہیں لیکن ازلی حریف نہیں بدلتے۔ یوں ہی اقوام عالم کی تاریخ میں بھی ایسے پراسرار تسلسل کے آثار ملتے ہیں۔

آرمینس نے دلدلی علاقے میں وارس کے فوجی دستوں کا قتل عام کیا۔ ان کے نرخرے کاٹتے ہوئے انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ جرمنی کی بادشاہت کا پیش رو تھا۔ بائبل کا مترجم لوتھر یہ گمان نہ کر سکا کہ اس کا مقصد ایسے لوگوں کو آگے بڑھانا تھا جنہوں نے بالآخر بائبل کو ہمیشہ کے لیے تباہ کر دینا تھا۔ کرسٹوف زرلندے 1758ء میں روسیوں کی گولی لگنے سے ہلاک ہوا۔ لیکن

ایک طور سے وہ 1914ء کی فتوحات کے لیے راہ ہموار کر رہا تھا۔ ہٹلر کو یقین تھا کہ وہ ایک قوم کے لیے جنگ لڑ رہا تھا لیکن دراصل وہ سبھی اقوام کے لیے برسرِ پیکار تھا، ان کے لیے بھی جن سے وہ نفرت کرتا تھا اور جن پر اس نے چڑھائی کی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کی 'میں' اس حقیقت سے لاعلم تھی۔ لیکن اس کا خون اور اس کا ارادہ البتہ اس سے باخبر تھے۔ دنیا یہودیت اور یہودیت کے مرض کے باعث جو یسوع مسیح کا مذہب تھا، مری جا رہی تھی۔ ہم نے اسے تشدد اور تلوار کے عقیدے کی تعلیم دی۔

اسی تلوار نے ہمیں ذبح کیا۔ ہماری مثال اس ساحر جیسی ہے جس نے ایک بھول بھلیاں تشکیل دیں اور پھر اسے زندگی کے آخری لمحے تک اس میں بھٹکتے رہنے کی سزا دی گئی۔ یا پھر ڈیوڈ جیسی سزا جو ایک غیر معروف انسان کا فیصلہ کرتے ہوئے اسے موت کی سزا سناتا ہے اور پھر اس پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تم وہی شخص ہو۔

بہت سے بت ایسے ہیں جنھیں تم کو ایک نیا نظام تشکیل دینے کے لیے توڑنا پڑے گا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ جرمنی بھی انھی بتوں میں سے ایک تھا۔ ہم نے اپنی زندگیوں سے بڑھ کر کچھ قربان کیا تھا۔ ہم نے اپنی محبوب قوم کی قسمت کی بھینٹ چڑھائی تھی۔ دوسروں کو ملامت کرنے اور رونے دو۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہماری تقدیر مدوّر اور کامل ہے۔

اب دنیا میں ایک بے کیف دور جاری ہے۔ ہم نے خود ہی اسے متشکل کیا، ہم جو اسی کا شکار بھی ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انگلستان ایک ہتھوڑا اور ہم سندان ہیں۔ جس بات سے فرق پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ، غلامانہ مسیحی بزدلی کے بجائے تشدد کا دور دوراں ہے۔ اگر فتح، ناانصافی اور مسرت جرمنی کے مقدر میں نہیں ہیں تو دوسری قومیں ان سے محروم کیوں رہیں۔ بہشت باقی رہنی چاہیے، بھلے ہی ہمارا مقام جہنم میں کیوں نہ ہو۔ میں آئینے میں خود کو دیکھتا ہوں یہ جاننے کے لیے کہ آخر میں کون ہوں؟ یہ جاننے کے لیے کہ کیسے اگلے چند گھنٹوں میں میرا رویہ کیا ہوگا، جب میں موت کے روبرو ہوں گا؟ میرا جسم، ہوسکتا ہے خوف زدہ ہو لیکن میں نہیں ہوں۔

# خوابوں کے شیر

بچپن میں میں شیر کا پر جوش معتقد تھا۔ تیندوا نہیں، وہ دھبے دار شیر نہیں جو ایمیزون کے گنجھلک جنگلوں اور پیرانا کے آبی پھولوں سے بھرے تیرتے ہوئے جزیروں میں پائے جاتے ہیں، اور پیرانا کے ساتھ نیچے تیرتے رہتے ہیں بلکہ حقیقی ایشیائی دھاری دار شاہی شیر جن سے مقابلہ کی سکت صرف ایسے جنگجو ہی رکھتے ہیں، جو ہاتھی کے ہودے پر سوار ہوں۔ میں اکثر چڑیا گھر میں شیروں کے پنجرے میں سے کسی ایک کے سامنے دیر تک کھڑا رہتا۔ ان شیروں کی شان وشوکت ہی کی بنیاد پر میں ضخیم انسائیکلوپیڈیاز اور قدرتی تاریخ کی کتابوں کے معیار کا اندازہ لگاتا۔ (مجھے وہ تصویریں اب بھی یاد ہیں۔ مجھے، جسے کسی عورت کے ابرو یا مسکراہٹ کو بھی ٹھیک طور سے یاد رکھنا ممکن نہیں ہے۔)

میرا بچپن گزر گیا اور شیروں اور ان کے لیے میرا اشتیاق بھی ماند پڑ گیا لیکن وہ اب بھی میرے خوابوں کے باسی ہیں۔ اس استغراق یا انتشار کی سطح پر بھی وہ ابھی تک باقی ہیں۔ جونہی میں سوتا ہوں، میں کسی خواب کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہوں اور اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ تو ایک خواب ہے۔ تب میں سوچتا ہوں، یہ ایک خواب ہے، میرے ارادے کا ایک خالص انحراف۔ اور چوں کہ تب میری طاقت لامحدود ہوتی ہے، اس لیے میں ایک شیر کو دیکھ پاؤں گا۔ آہ، میری نااہلی، میرے خواب کبھی وہ جنگلی درندہ تخلیق نہیں کر پائے جس کا میں تمنائی ہوں۔

شیر ظاہر تو ہوتا ہے لیکن بھس بھرا ہوا یا بالکل کھوکھلا یا شکل میں نخالص تبدیلیوں کے

ساتھ، یا نا قابل قبول حجم میں، یا بالکل ہی عارضی یا ایک شیر کے بجائے ایک کتا یا پرندے جیسا۔

# پیروں کی انگلیوں کے ناخن

نرم جرابیں دن بھر انھیں سہلاتی ہیں اور چمڑے سے بنے جوتے ان کی حفاظت کرتے ہیں لیکن میری انگلیاں انھیں خاطر میں نہیں لاتیں۔

کسی شے میں انھیں دلچسپی ہے تو بس اس میں کہ سینگوں جیسے مواد سے بنے نیم شفاف اور لچک دار ٹکڑوں جیسے ناخن بڑھتے رہیں، دفاع کے لیے، لیکن کس کے خلاف؟ احمق اور ناقابل اعتماد جیسی کہ بس وہی ہو سکتی ہیں، میرے پیروں کی انگلیاں اس مہین اسلحے کی تیاری میں ان تھک جٹی رہتی ہیں۔ وہ کائنات اور اس کی سرمستیوں سے منہ موڑ لیتی ہیں تاکہ باہر نکلے ہوئے نوک دار سروں کو ہمیشہ باقی رکھ سکیں جنھیں سولنجن کی قینچی سے بار بار ہونے والی غیر متوقع تراش کا سامنا رہتا ہے۔

قبل پیدائش قید کے نوے دنوں کے دوران ہی میری انگلیوں نے خود کو اس غیر معمولی مشغلہ کے لیے مختص کر دیا تھا۔ اور جب میں اس راکھ جیسے رنگ کے گھر میں لیٹا ہوں گا، جو خشک پھولوں اور تعویذوں سے آراستہ ہوگا، یہ تب بھی اپنے کٹھن کام میں جتی ہوں گی، حتی کہ زوال ان کو معتدل کر دے گا۔ انھیں اور میرے چہرے کی داڑھی کو۔

# جواز

میں اپنی آنکھیں بند کرتا اور پرندوں کے ایک پرّے کو دیکھتا ہوں۔ یہ منظر لمحہ بھر باقی رہتا ہے، یا شاید اس سے بھی کم وقت۔ میں نہیں جانتا کہ کتنے پرندے میں نے دیکھے۔ ان کی تعداد متعین تھی یا غیر متعین؟ یہ مسئلہ وجود باری تعالی کے سوال کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اگر خدا موجود ہے تو یہ تعداد متعین ہوگی، کیوں کہ جتنے بھی پرندے میں نے دیکھے، ان کی تعداد کا خدا کو بھی علم ہوگا۔ اگر خدا موجود نہیں ہے تو یہ غیر متعین ہوگی کیوں کہ پھر کوئی بھی انھیں شمار کرنے کی اہلیت نہیں رکھے گا۔ اس صورت میں میں نے (مثال کے طور پر) دس سے کم اور ایک سے زیادہ پرندے دیکھے۔ لیکن نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین یا دو پرندے نہیں۔ میں نے دس سے ایک کے درمیان کی تعداد دیکھی جو نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، وغیرہ نہیں تھی۔ یہ صحیح عدد مجموعی طور پر نا قابل فہم ہے۔ اس لیے خدا موجود ہے۔

(یہ بات کم و بیش سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے جو لکھا وہ کچھ یوں تھا، ''یہ تعداد مجموعی طور پر نا قابل فہم ہے اس لیے خدا موجود ہے۔'' لیکن یہ بورخیس نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے یہ دلیل اس لفظ 'نا قابل فہم' پر قائم ہے (جو غلطی سے بولا گیا۔) لیکن کیسے یہ لفظ اس دلیل کو مضبوط بناتا ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ میں بورخیس سے محبت کرتا ہوں۔)

# اسیر

حونین یا تا پلکوئین میں انھوں نے یہ کہانی سنائی۔

ایک لڑکا انڈینز کے دھاوے میں گم ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس کے والدین بے سود ہی اس کی تلاش کرتے رہے۔ یوں بہت سال بیت گئے اور تب اندرونی علاقوں کا ایک سپاہی قصبے میں آیا اور اس نے بتایا کہ اس نے نیلی آنکھوں والے ایک انڈین کو دیکھا ہے جو ہو سکتا ہے ان کا بیٹا ہو۔ کسی طرح وہ اس انڈین کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے (کہانی میں بہت سے تفصیلات اس موقع پر گم ہیں اور میں نہیں چاہتا وہ کچھ اختراع کرنے کی کوشش کروں جن کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔)

انھوں نے جان لیا کہ وہ اسے پہچان گئے تھے۔ ان ویرانوں اور وحشیانہ زندگی نے اسے یوں بدل ڈالا تھا کہ اپنی مادری زبان کا ایک لفظ بھی اس کے لیے قابل فہم نہیں تھا لیکن اس نے بے نیازی کے ساتھ خاموشی سے انھیں اپنے ساتھ لے جانے دیا۔ وہاں وہ ٹھہر گیا (شاید اس لیے کہ باقی بھی وہیں ٹھہر گئے تھے۔) اس نے دروازے کی طرف دیکھا، تقریباً اسے نہ سمجھتے ہوئے۔ تب اچانک اس نے سر جھکایا، عجیب انداز میں چیخ ماری، ڈیوڑھی اور دو طویل صحنوں میں سے بھاگتا ہوا، وہ باورچی خانے میں گیا۔ اس نے دھویں سے سیاہ ہو چکی ہوئی چولھے کی چمنی میں بلا ہچکچاہٹ ہاتھ ڈالا اور سینگ جیسے دستے والا چاقو نکالا، جو اس نے بچپن میں وہاں چھپایا تھا۔ اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس کے والدین رونے لگے کیوں کہ انھوں نے اپنا گم شدہ

بیٹا پالیا تھا۔

اس کے بعد بھی بہت سے واقعات ہوئے ہوں گے لیکن ایک انڈین ایسی زندگی نہیں گزار سکتا جو دیواروں میں محدود ہو اور اسی لیے ایک دن وہ اپنے ویرانوں کی طرف لوٹ گیا۔ میں جاننا چاہوں گا کہ اس عدم توازن کے لمحوں میں اس نے کیا محسوس کیا ہوگا جب ماضی اور حال باہم مدغم ہو گئے تھے۔ میں جاننا چاہوں گا کہ آیا اس وجدانی لمحات میں گم شدہ بیٹا پھر سے پیدا ہوا اور مر گیا، اور کیا وہ کبھی، کسی بچے یا ایک کتے جتنی ہی یادداشت کے ساتھ، یہ پہچان پایا کہ یہ اس کے والدین اور اس کا گھر تھا۔

# ڈیلیا ایلینا سان مارکو

ہم نے پلازہ ڈیل ونس کے ایک کونے میں ایک دوسرے کوالوداع کہا۔

گلی کی پرلی طرف فٹ پاتھ پر میں مڑا اور واپس دیکھا۔تم بھی مڑی تھی اور الوداع کہتے ہوئے میں نے ہاتھ ہلایا تھا۔

گاڑیوں اور لوگوں کا ایک دریا ہمارے درمیان بہہ رہا تھا۔ایک عام سی سہ پہر کے پانچ بجے تھے۔کیسے میں جان سکتا تھا کہ وہ دریا غم زدہ ایکرون تھا، جسے کوئی دوبارعبور نہیں کر سکتا تھا۔

ہم کبھی دوبارہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے اور ایک برس بعد تم فوت ہوگئی۔اور اب میں تمھاری یاد کو تلاش کرتا ہوں اور اسے دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ سب جھوٹ تھا اور یہ کہ اس معمولی الوداع کے پیچھے غیر محدود فراق پنہاں تھا۔

پچھلی رات کھانے کے بعد میں باہر نہیں گیا اور ان تمام باتوں کو سمجھنے کی خاطر میں اس آخری درس کو پڑھتا رہا جو افلاطون نے اپنے استاد کی زبان سے کہلوایا تھا۔میں نے پڑھا کہ جسم کے مرنے پر روح فرار ہوسکتی ہے۔

اور اب میں نہیں جانتا کہ سچائی بعد کی نجس وضاحت میں موجود ہے یا غیر مشتبہ الوداع میں۔

کیوں کہ اگر روح فنا نہیں ہوتی، تو پھر یہ درست ہے کہ ہم اپنے الوداعی کلمات کو کوئی اہمیت نہ دیں۔

الوداع کہنا فراق سے انکار کے مترادف ہے۔ یہ ایسا کہنے کے مترادف ہے کہ 'آج ہم جدا ہونے کا کھیل کھیلتے ہیں لیکن کل ضرور ملیں گے۔' انسان نے الوداعی کلمات ایجاد کیے کیوں کہ کسی طور وہ جانتا تھا کہ وہ لافانی ہے، چاہے بظاہر وہ بے ثبات اور عارضی ہی کیوں نہ دکھائی دے۔

ڈیلیا ہم پھر ایک روز کسی دریا کے کنارے اسی غیر یقینی مکالمہ کو جاری کریں گے، اور ہم ضرور ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ کیا ہم ایک شہر میں جو ایک میدان میں گم ہو گیا، کبھی بورخیس اور ڈیلیا تھے۔

# سازش

اپنی دہشت کو مکمل کرنے کے لیے سیزر نے اپنے دوستوں کے مضطرب خنجروں کے سامنے بت کے پیر پر دباؤ ڈالتے ہوئے تیز دھاروں اور چہروں کے درمیان مارکوس جونیئس بروٹس کا چہرہ دریافت کیا، اس کا متوسل، غالباً اس کا اپنا بیٹا، اور پھر خود کو بچانے کی کوشش ترک کر دی اور پکارا ''تم بھی، میرے بیٹے۔'' شیکسپیئر اور کیوویڈو نے اس جگر سوز کراہ کو پھر سے زندہ کیا۔

قسمت خود کو دہرانے، بدلنے، مماثل رہنے میں لطف پاتی ہے۔ انیس صدیوں بعد صوبہ بیونس ایریز کے جنوب میں ایک گاؤچو چرواہے پر دوسرے گاؤچو چرواہوں نے حملہ کیا۔ تب نیچے گرتے ہوئے اس نے حملہ کرنے والوں میں اپنے لے پالک بیٹے کو پہچانا اور نرمی سے سرزنش کرتے اور حیران ہوتے ہوئے بولا (ان الفاظ کو سنا جانا چاہیے، نہ کہ پڑھا جانا) 'پیرو چے'۔ وہ مارا جا رہا ہے لیکن نہیں جانتا کہ وہ مر رہا ہے صرف اس لیے تاکہ یہ منظر پھر سے دہرایا جا سکے۔

# تغیرات

میں نے ڈیوڑھی میں ایک جانب اشارہ کرتا ہوا تیر کا نشان دیکھا اور یہ سوچ کر ششدر رہ گیا کہ یہ بے ضرر اشارہ کبھی لوہے کا ہتھیار تھا، نا قابل دفاع، مہلک ہتھیار، جو انسانوں اور شیروں کے جسم میں پیوست ہوا اور جس نے تھرموپولی میں سورج کو اپنے سایے سے گہن زدہ کر دیا اور ہیرلڈ سیگو ڈارسن کو ہمیشہ کے لیے انگلستان کی سرزمین میں چھ فٹ گڑھے میں سلا دیا۔

چند دنوں کے بعد کسی نے مجھے میگیار کے ایک گھڑسوار کی تصویر دکھائی۔ ایک لچھے دار رسہ اس کے گھوڑے کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ رسہ جسے کبھی ہوا میں اچھالا جاتا تھا اور اس نے چراہ گاہوں کی سانڈوں کو نیچے گرالیا تھا، اب اتوار کو گھوڑوں کے آرائشی ساز سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

مغربی قبرستان میں میں نے ایک رونی صلیب دیکھی جو سرخ سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی۔ اس کے بازو دونوں اطراف میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کے گرد ایک دائرہ کھنچا تھا۔ یہ محدود، قطع کی ہوئی صلیب ایک دوسری کھلے بازوؤں والی صلیب کی نمائندگی کرتی تھی جو اصل میں ان سُولیوں کی نمائندہ تھی جن پر ایک دیوتا کو اذیت دی گئی، وہ حقیر مشین جس کی مذمت سموساٹا کے لوسیئن نے کی تھی۔

صلیب، رسہ اور تیر، انسان کے قدیم اوزار، اب محض اشاروں کی حیثیت میں گھٹا دیئے یا سرفراز کیئے گئے تھے۔ میں کیوں ان کی تحسین کروں جب کہ اس زمین پر کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے

فراموشی محو نہیں کر دیتی، یادداشت بدل نہیں دیتی، اور جب کہ کوئی خود نہیں جانتا کہ مستقبل میں وہ کس نوع کے استعارے کی صورت میں باقی رہے گا۔

# مصلوب چہرہ

ڈوئیڈورس سیکولس ایک دیوتا کی کہانی سناتا ہے جسے ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا اور ہر جگہ بکھیر دیا گیا۔ہم میں سے کون انسان ہوگا جس نے کبھی چاندنی رات میں چلتے ہوئے یا اپنے ماضی کے کسی دن کی تاریخ لکھتے ہوئے، یہ محسوس نہیں کیا ہوگا کہ کوئی لامحدود شے ہمیشہ کے لیے اس سے چھن گئی تھی۔

انسانیت ایک چہرہ، ایک ناقابل واپسی چہرہ کھو چکی ہے اور سبھی اس زائر جیسا ہونے کی خواہش کرتے ہیں (جسے انھوں نے خواب میں عرش بریں پر گلاب کے تلے دیکھا تھا) جو روم گیا اور اس نے سینٹ ویرونیکا کا دیدار کیا اور مذہبی جوش میں بڑبڑایا، ''اے خداوند یسوس مسیح، میرے خدا، سچے خدا، تو کیا کچھ ایسا ہی تمہارا چہرہ ہوگا؟''

ایک سڑک کے برابر پتھر کا چہرہ نصب ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے، 'شہر جین کے خدا کے مقدس چہرے کا سچا روپ'۔اگر ہم واقعی جانتے کہ وہ چہرہ کیسا تھا، تو تمام تماثیل کا مرکزی نقطہ ہاتھ میں آجاتا اور ہم جان لیتے کہ کیا ترکھان کا بیٹا واقعی خدا کا بیٹا بھی تھا؟

پال نے اس چہرے کو روشنی کی صورت میں دیکھا جس نے اسے زمین پر پچھاڑ دیا۔ جان نے اسے سورج کے روپ میں دیکھا جب وہ پوری تابانی کے ساتھ چمکتا ہے۔ٹریسا ڈی جیسز نے اسے ایک سے زائد بار دیکھا، خاموش روشنی میں نہایا ہوا، لیکن وہ کبھی پر یقین نہیں ہوسکی کہ اس کی آنکھوں کا رنگ کیا تھا؟

ہم نے یہ نقوش کھود یے، جیسے خفیہ لکھائی میں درج کوئی جادوئی عدد کھودے، جیسے کسی سیر بین میں کوئی تصویر ہمیشہ کے لیے کھو جائے۔ ہم انھیں دیکھ سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے انھیں نہ جان پائیں۔ کسی زمین دوز ریل گاڑی میں ایک یہودی کا چہرہ ہو سکتا ہے یسوع مسیح کا چہرہ ہو۔ شاید وہ ہاتھ جو ٹکٹ والی کھڑکی سے ہمیں بقیہ پیسے تھماتا ہے، ان ہاتھوں کی نقل ہوں جن سے کسی سپاہی نے ایک روز صلیب میں کیل ٹھونکے تھے۔

شاید مصلوب چہرے کے خدوخال ہر آئینے میں سے جھلکتے ہوں۔ شاید جو چہرہ مر جاتا ہے، اسے محو کر دیا جاتا ہے تاکہ خدا ہم سب میں ہو سکے۔

کون جانتا ہے کہ اس رات ہم اسے خوابوں کی بھول بھلیوں میں دیکھ لیں اور کل یہ بھول جائیں کہ ہم نے اسے دیکھا تھا۔

# دیوتاؤں کا قتل

ہمارے خوابوں کے امیجز (کولرج لکھتا ہے) ان حسیات کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا یہ سبب ہوتے ہیں۔ ہم اس لیے خوف زدہ نہیں ہوتے کہ ابوالہول کی دہشت ہم پر طاری ہوتی ہے بلکہ ہم ابوالہول کا خواب اس لیے دیکھتے ہیں تاکہ اس دہشت کو ظاہر کرسکیں جو ہم محسوس کرتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی ہے تو پھر کیسے محض اس کی شکلوں کی سرگزشت، اس شدید حیرت، سرمستی، تنبیہ، خوف اور شادمانی کی ہم تک ترسیل کرسکتی ہے جس سے اس رات کا خواب بُنا ہوا ہوتا ہے؟ میں ایسی ہی روداد بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ شاید یہ حقیقت کہ یہ خواب واحد منظر پر مشتمل تھا، ہوسکتا ہے کہ اس بنیادی دشواری کو ختم یا اس میں تخفیف کردے۔

مقام سکول برائے فلسفہ و ادب تھا۔ وقت شام کے گہرا ہونے کا۔ ہر شے (جیسا کہ عام طور پر خوابوں میں ہوتا ہے) کچھ مختلف تھی۔ انھیں معمولی سا بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے ان کی ہیئت بدل گئی تھی۔ ہم حکام کا انتخاب کررہے تھے۔ میں پیڈرو ہنری کیوز یورینا سے محوِ گفتگو تھا جو بیداری کی حقیقی دنیا میں کئی سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ اچانک مظاہرہ کرنے والوں یا کسی انتشار کے شور نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ باجو کے مقام سے ہمیں انسانی اور حیوانی ملی جلی چیخ و پکار سنائی دی۔ ایک آواز بلند ہوئی، ''یہاں ہیں وہ۔'' اور پھر ''دیوتا، دیوتا۔''

چار یا پانچ افراد ہجوم میں سے ظاہر ہوئے اور مرکزی لیکچر ہال کے ڈائس پر قابض ہوگئے۔ ہر کسی نے پُرنم آنکھوں کے ساتھ تالیاں بجائیں۔ یہ دیوتا تھے، صدیوں کو محیط جلاوطنی سے

لوٹے تھے۔ڈائس پر کھڑے ہوئے اصل سے بڑے دکھائی دیتے دیوتاؤں کے سر پیچھے گرے اور چھاتیاں آگے کو بڑھی ہوئی تھیں، اور وہ نخوت سے ہمارے استقبال کو وصول کر رہے تھے۔ایک دیوتا کے ہاتھ میں ایک شاخ تھی (جو بلاشبہ خوابوں کی سادہ نباتات سے مطابقت رکھتی تھی۔) دوسرے دیوتا نے واضح تاثر کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جو ایک پنجہ تھا۔جانس کے چہروں میں سے ایک نے تھوتھ کی مڑی ہوئی چونچ کو بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔شاید ہماری عقیدت مندی سے حوصلہ پا کر ان میں سے ایک دیوتا جسے، جو مجھے اب یاد نہیں رہا ہے کہ وہ کون تھا، ایک فتح مندانہ انداز میں نا قابل یقین حد تک درشت آواز میں بڑبڑ کرنے لگا جو نصف غراروں اور نصف سیٹیوں کی آواز سے مشابہ تھی۔اس لمحے کے بعد ہر شے بدل گئی۔

اس سب کچھ کا آغاز اس شک سے ہوا (جسے شاید بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا) کہ دیوتا بولنے کے فن سے نابلد تھے۔صدیوں کے زوال اور جلا وطنی کی غیر مہذبانہ زندگی نے ان میں انسانی عنصر کو کمزور کر دیا تھا۔اسلام کا مہتاب اور روم کی صلیب ان مفروروں کے ساتھ دوستانہ نہیں رہی تھی۔بہت تنگ پیشانیاں، زرد دانت، مخلوط یورپی حبشیوں یا چینیوں جیسی مونچھیں اور موٹے حیوانی ہونٹ، اولمپیائی سلسلہ نسب کے زوال کا اشارہ تھے۔

ان کا لباس شائستہ اور ایمان دارانہ غربت کی چغلی نہیں کھاتا تھا بلکہ جرائم پیشہ دنیا کے جوا خانوں اور قحبہ خانوں کی گناہ سے آلودہ تعیش پسندی کا آئینہ دار تھا۔کوٹ کی لوٹ پر ارغوانی رنگ میں بھیگا ہوا ایک پھول لگا تھا اور چست جیکٹ کے نیچے ایک خنجر کا ابھار واضح تھا۔اچانک ہمیں محسوس ہوا کہ وہ اپنا آخری پتہ پھینک رہے تھے کہ وہ بوڑھے درندوں کی طرح چالاک، جاہل اور سفاک تھے۔اور یہ کہ اگر ہم نے خود کو خوف یا رحم کے ہاتھوں گمراہ ہو جانے دیا تو یہ ہمیں آخر کار تباہ کر دیں گے۔ہم نے اپنے بھاری ریوالور نکالے (خواب میں اچانک ریوالور ظاہر ہوئے تھے) اور مسرت کے ساتھ دیوتاؤں کو قتل کیا۔

# دانتے اور تیندوا

صبح کے دھند لکے سے شام کے جھٹ پٹے تک ایک تیندوے کی آنکھیں تیرھویں صدی کے آخری سالوں میں چند چوبی تختوں، چند عمودی آہنی سلاخوں، وقفے وقفے سے بدل جانے والے مردوں اور عورتوں، ایک ننگی دیوار اور شاید خشک پتوں سے بھرے ایک سنگی گڑھے کو دیکھتی رہتی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا، نہ ہی جان سکتا تھا کہ اسے محبت اور درندگی، چیزوں کو چیر پھاڑ دینے کی پر حدت مسرت اور ہرن کی خوشبو میں بھیگی ہوا کی خواہش تھی لیکن کوئی شے اس کے اندر حبس دم کا شکار اور آمادہ بغاوت ہوئی اور خواب میں خدا نے اس سے کلام کیا، ''تم اس زندان میں زندہ رہو گے اور یہیں مر جاؤ گے تا کہ ایک شخص، جسے میں جانتا ہوں، تمھیں ایک سے زائد مرتبہ دیکھے اور کبھی فراموش نہ کرے، اور تمھاری ہیئت اور استعارے کو ایک نظم میں استعمال کرے جس کا کائنات کے نظام میں ایک خاص مقام ہوگا۔ تم قید کی اذیت میں مبتلا ہو لیکن تم اس نظم کو ایک خیال دو گے۔'' خواب میں خدا نے اس جانور کی حیوانیت کو اجال دیا اور وہ جانوران وجوہات کو سمجھ گیا اور اس نے اپنے مقدر کو تسلیم کر لیا لیکن جب وہ جاگا تو اس کے اندر محض ایک مبہم توکّل تھا، اور دلیرانہ بے خبری، کیوں کہ ایک درندے کی سادگی دنیا کے نظام کی پیچیدگی کی متحمل نہیں ہے۔

بہت برسوں کے بعد دانتے راوینا میں بستر مرگ پر لیٹا تھا، کسی بھی دوسرے انسان کی طرح بے جواز اور تنہا۔ ایک خواب میں خدا نے اس پر اس کی زندگی اور فن کا خفیہ مقصد آشکار کیا۔ دانتے نے آخر کار حیرانی کے عالم میں جانا کہ وہ کون اور کیا تھا، اور یوں اس نے اپنی زندگی کی تلخی کو

گوارہ کیا۔ روایت یہ ہے کہ بیدار ہونے پر اس نے محسوس کیا کہ جیسے اسے کوئی لامحدود شے ملی ہو مگر پھر کھو گئی، کوئی ایسی شے جس کی تلافی یا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے بھی وہ کبھی قابل نہیں ہو پائے گا، کیوں کہ انسانوں کی سادگی دنیا کے نظام کی پیچیدگی کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔

# میرے انکل کا گھر

(ایچ پی لووکرافٹ کے نام)

آسٹن میں ٹیکساس یونیورسٹی میں آخری امتحانات سر پر تھے، جب مجھے اطلاع ملی کہ میرے انکل ایڈون آرنٹ براعظم جنوبی امریکہ کے ایک دوردراز علاقے میں شریانوں کے پھیلاؤ کے مرض میں مبتلا ہوکر مر گئے۔ مجھے اس خبر سے صدمہ ہوا جیسا کسی کے مرنے پر کسی کو ہوسکتا ہے۔ یعنی یہ افسوس ناک آگاہی، جواب بے فائدہ تھی، کہ زیادہ لائق محبت ہونے کے لیے کتنی کم محنت درکار ہوتی ہے۔

یونیورسٹی میں میرا مضمون فلسفہ تھا۔ مجھے یاد تھا کہ لوماس کے قریب 'ریڈ ہاؤس' میں میرے انکل نے اصطلاحوں کے چکر میں پڑے بغیر مجھ پر فلسفہ کی خوبصورت پیچیدگیوں کو آشکار کیا تھا۔ کھانے کے بعد پیش کیے جانے والے سنگتروں میں سے ایک دانے کے ذریعے انھوں نے مجھے برکلے کی تصوریت پسندی سے متعارف کرایا۔ ایلیائی تناقضات کی توضیح کے لیے شطرنج کی بساط کافی ہوتی۔ برسوں بعد انہی نے مجھے ہنٹن کے مقالات پڑھنے کو دیے جن میں خلا کی ایک چوتھی جہت کی حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایک جہت جس کے وجدان کے تجربہ کے لیے قاری کی حوصلہ افزائی کی جاتی کہ وہ رنگ دار شش پہلوی اشیا کی مدد سے مختلف پیچیدہ مشقیں کرے۔ مجھے وہ اہرام اور منشور کبھی نہ بھولیں گے جو ہم نے ان کی مطالعہ گاہ کے فرش پر تعمیر کیے تھے۔

میرے انکل ایک انجینئر تھے۔ ریلوے سے ریٹائر ہونے سے پہلے انہوں نے ٹرڈیرا میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا جس نے انھیں بیک وقت تنہائی بھرے حقیقی ویرانے کی سہولت اور بیونس ایریز کی قربت فراہم کی۔ اس گھر کی تعمیر کے لیے وہ اپنے دیرینہ دوست الیگزینڈر رموئر کے سوا بھلا اور کس سے رجوع کرتے۔ وہ بے لچک انسان نوکس کی بے لچک تعلیمات کا پیروکار تھا۔ میرے انکل، اپنے دور کے دیگر سبھی تعلیم یافتہ انسانوں کی طرح، ایک آزاد خیال انسان تھے۔ یا شاید دھریے۔ لیکن انہیں الہیات میں بھی دلچسپی تھی۔ یعنی جس انداز میں وہ ہنٹن کی غیر حقیقی شش پہلوی اشیا اور نوجوان ادیب ایچ جی ویلز کے نپے تلے ڈراؤنے خوابوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔

انہیں کتے پسند تھے۔ ان کے پاس ایک جسیم گلہ بان کتا تھا جس کا نام انہوں نے دور دراز واقع اپنی جائے ولادت لیچ فیلڈ کی یاد میں سیموئل جانسن رکھا تھا۔ ریڈ ہاؤس ایک پہاڑ پر واقع تھا جس کے مغرب میں دلدلی زمین تھی۔

اس کے جنگلے کے گرداگرد نورفوک کے صنوبر کے درختوں کی موجودگی بھی اس پر چھائے ہوئے ہمہ گیر بوجھل پن کو کم نہیں کر پاتی تھی۔ سیدھی چھتوں کے بجائے جہاں کسی حبس والی رات کو بیٹھا جا سکتا ہو، اس گھر میں چپٹی ٹائلوں سے بنی ایک کوہانی چھت تھی اور گھڑی والا چوکور مینار تھا۔ اس طرز تعمیر میں گھر کی دیواریں اور تنگ کھڑکیاں دبی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ بچپن میں بدصورتی کو ایسے ہی تسلیم کرلیا جاتا ہے جیسے انسان ان سبھی ناسازگار اشیا کو قبول کرلیتا ہے جو محض اپنی ہم موجودیت کی وجہ سے 'کائنات' کہلاتی ہیں۔

میں 1921ء میں اپنے آبائی قصبے میں پہنچا۔ قانونی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے گھر کو نیلام کردیا گیا۔ اسے ایک غیر ملکی شخص نے خریدا جس کا نام میکس پریٹوریس تھا اور جس نے اپنے بعد سب سے زیادہ بولی لگانے والے کی نسبت دگنی قیمت ادا کی۔ فروخت کے کاغذات پر دستخط ہونے کے بعد ایک شام وہ دو معاونین کے ساتھ وہاں پہنچا۔ انھوں نے گھر کا تمام فرنیچر، کتابیں اور گھریلو استعمال کی سبھی اشیا ایک غلاظت گاہ میں پھینک دیں جو ملٹری ہائی وے سے زیادہ

دور نہیں تھی۔ (ہنٹن کی کتابوں پر بنے خاکوں اور دنیا کے نقشے والے بڑے گلوب کا سوچ کر آج بھی میں دکھی ہو جاتا ہوں) اگلے روز پریٹوریس مکان کے معمار موئر کے پاس گیا اور اس سے گھر میں چند ترامیم کا ارادہ ظاہر کیا۔ موئر نے سختی سے انکار کر دیا۔ بالآخر بیونس ایریز کے ایک تعمیراتی ادارے نے اس کام کی حامی بھری۔

مقامی ترکھان اس گھر کی آرائش نو پر آمادہ نہ ہوئے۔ گلیو کا ایک شخص ماریانی، البتہ پریٹوریس کے حسب منشاء کام کرنے پر راضی ہو گیا۔ پورے دو ہفتے یہ ترکھان پوری پوری رات بند دروازوں کے اندر کام کرتا رہا۔

ایک رات کسی وقت ریڈ ہاؤس کا نیا رہائشی یہاں منتقل ہوا۔ گھر کی کھڑکیاں کھولنا موقوف کر دی گئی تھیں۔ ان میں سے روشنی کی شعاعیں باہر اندھیرے میں چھن کر آتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک صبح گوالے نے گلہ بان کتے کو مرا ہوا پایا۔ اس کا دھڑ بے سر اور بری طرح ادھڑا ہوا جسم راستے میں پڑا تھا۔ اسی موسم سرما میں نورفوک کے صنوبر کے درختوں کو کاٹ دیا گیا۔ کسی نے پریٹوریس کو دوبارہ وہاں نہیں دیکھا۔ بظاہر وہ اس کے فوراً بعد قصبے سے چلا گیا۔

ان واقعات کی اطلاعات نے، جیسا کہ قاری تصور کر سکتے ہیں، مجھے بے چین رکھا۔ میں جانتا ہوں میرے تجسس کی حس بہت توانا ہے جس نے مختلف طریقوں سے مجھے ایک عورت سے شادی کی طرف راغب کیا جو کلی طور پر مجھ سے مختلف تھی (کلی طور پر اس لیے کہ میں جان سکوں کہ وہ کون تھی اور حقیقت میں کیسی تھی)، اسی نے مجھے لوڈانم استعمال کرنے کی طرف دھکیلا (جس کے قابل ذکر نتائج برآمد نہیں ہوئے)، لامحدود ترکیبی اعداد کو دریافت کرنے اور وہ ہولناک مہم شروع کرنے کی ترغیب دی جس کا ذکر میں آئندہ کروں گا۔ ناگزیر طور پر میں نے اس معاملے کی چھان بین کا تہیہ کیا۔

اس کام کا آغاز الیگزینڈر موئر ہی سے ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یاد تھا کہ وہ بندوق کے گز جیسی سیدھی قامت کا گہری رنگت والا آدمی تھا جس کی لاغری اس کی سابقہ تنومندی کو چھپا نہیں پاتی

تھی۔ اب وقت نے اس کی کمر کو دہرا کر دیا تھا اور اس کی سیاہ داڑھی سفید ہو چکی تھی۔ اس نے ٹیمپر لی میں اپنے گھر کے دروازے پر مجھے خوش آمدید کہا جو متوقع طور پر میرے انکل کے گھر جیسا ہی تھا کیونکہ دونوں گھروں کا نقشہ عمدہ شاعر مگر برے معمار ولیم مورس کے ٹھوس اصولوں کے مطابق تھا۔

ہماری گفتگو غیر دوستانہ تھی۔ سکاٹ لینڈ کی پہچان ایک کانٹے دار پودایوں ہی تو نہیں ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ سیلون کی تیز چائے اور چوکور کیک (جسے میرے میزبان نے دو حصوں میں کاٹ کر ان پر مکھن لگا دیا تھا جیسے میں کوئی ننھا بچہ تھا) کی قاشوں سے بھری سمجھداری سے تیار کی گئی پلیٹ اپنے دیرینہ دوست کے بھتیجے کے اعزاز میں دی گئی ایک کفایت شعارانہ کالوینی ضیافت ہی تھی۔ میرے انکل کے ساتھ الہیاتی موضوعات پر اس کی بحثیں شطرنج کی ایک طویل بازی کی مانند ہوتیں تھیں جو دونوں کھلاڑیوں سے اشتراکی معاونت کی متقاضی ہوتی ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ مجھے گفتگو کو اپنے موضوع پر لانے کا موقع نہ ملا۔ ہماری گفتگو کے درمیان ایک غیر آرام دہ وقفہ آیا۔ تب موئر گویا ہوا "نوجوان ایڈوین یا ریاست ہائے متحدہ امریکہ پر بات کرنے کے لیے، جس میں مجھے بہت کم دلچسپی ہے، تم نے یہاں آنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ جس بات نے تمھاری راتوں کی نیند چھین لی ہے وہ ریڈ ہاؤس کی فروخت اور اسے خریدنے والے عجیب شخص کے متعلق ہے۔ ہاں، اسی بات نے میری نیندیں بھی چھین لی تھیں۔ سچ تو یہ ہے یہ سارا معاملہ میرے لیے ناقابل یقین ہے۔ لیکن میں تمھیں وہ کچھ بتانے کی کوشش کروں گا، جو بتا پاؤں گا۔ قصہ زیادہ طویل نہیں ہے۔"

کچھ توقف کے بعد وہ کسی عجلت کے بغیر بولا "ایڈوین کی وفات سے پہلے علاقے کے رئیس بلدیہ نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ علاقے کا پادری بھی وہاں موجود تھا۔ وہ مجھ سے کیتھولک گرجا گھر کا نقشہ تیار کرانا چاہتے تھے۔ اس کام کا اچھا معاوضہ دینے کا بھی مجھے یقین دلایا گیا۔ میں نے وہیں جواب دیا۔ صاف انکار کیا اور انھیں بتایا کہ میں خدائے بزرگ و برتر کا ادنی ملازم

ہوں۔ میں بتوں کی عبادت کے لیے قربان گاہیں تعمیر کرنے کے گناہ کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔'' پھر وہ خاموش ہو گیا۔

''کیا بس اتنا ہی۔'' میں نے قیاس کیا۔

''نہیں۔ وہ یہودیوں کا کتا، پریٹوریس، چاہتا تھا کہ میں اپنی بنائی ہوئی عمارت کو تباہ کر دوں، یعنی وہ گھر جو میں نے خود تعمیر کیا۔ پھر اس کی جگہ ایک بڑی بھدی عمارت تعمیر کروں۔ نفرت کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔'' اس نے یہ الفاظ گہرے تفکر کے ساتھ کہے اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

باہر گلی کا موڑ مڑتے ہوئے ڈینئیل آئیبرہ سے میری مڈبھیڑ ہوگئی۔ ہماری آپس میں بس اتنی ہی واقفیت تھی جتنی چھوٹے دیہاتوں میں لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس نے تجویز دی کہ اکٹھے واپس چلتے ہیں۔ مجھے دغابازوں اور اس قبیل کے لوگوں سے میل ملاقات کا تجربہ نہیں تھا، اور خدشہ تھا کہ کم و بیش تشدد اور سچی جھوٹی غلاظت سے پُر کہانیاں سننی پڑیں گی۔ تاہم میں نے اس کی دعوت قبول کر لی اور کہا کہ چلو چلتے ہیں۔ رات بھیگ چکی تھی۔ جب آئیبرا نے چند بلاکس کے فاصلے پر پہاڑی پر ریڈ ہاؤس کی جھلک دیکھی تو ایک بغلی گلی میں ہو لیا۔ میں نے اس سے استفسار کیا تو اس کا جواب میری توقع کے برعکس تھا۔

''میں ڈان فیلپ کا دست راست ہوں'' وہ بولا، ''کوئی یہ نہیں کہہ سکتا میں کبھی کسی بات سے پیچھے ہٹا ہوں۔ آپ کو شاید وہ شخص یریگوئٹی یاد ہو گا کہ جو میرلو سے یہاں مجھے ملنے آیا تھا اور پھر اس کا کیا حشر ہوا۔ جب وہ مجھ سے ملا؟ تو سنئے۔ چند راتیں پہلے میں ایک بڑی تقریب سے واپس آ رہا تھا۔ اس مکان سے کوئی سو گز کے فاصلے پر میں نے کوئی شے دیکھی۔ میرا گھوڑا گڑبڑا کر اگلی ٹانگوں کو اٹھائے پچھلی ٹانگوں پر اچھل پڑا۔ اگر میں اسے نہ سنبھالتا اور اسے اس تنگ گلی میں نہ لے جاتا تو شاید آج میں یہاں تمہیں یہ روداد سنانے کے لیے زندہ نہ بچتا۔ جو شے میں نے دیکھی۔'' اس نے اپنا سر ہلایا۔ پھر برہمی سے لعنت بھیجی۔

''اس رات میں سو نہ سکا۔ صبح کے قریب میں نے خواب میں پیرانیسی کے طرز کے نقش

ونگار دیکھے جیسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے یا شاید دیکھے ہوں اور بھول چکا ہوں، بھول بھلیوں کی طرز کے نقش ونگار۔ یہ پتھر کی بیضوی عمارت تھی جس کے گرداگرد صنوبر اور سرو کے درختوں کے کنج تھے لیکن اس کی دیواریں درختوں سے زیادہ بلند تھیں۔ اس میں نہ دروازے تھے، نہ کھڑکیاں۔ تنگ عمودی درزوں کی لامختتم قطار تھی۔ میں مکبر شیشے سے مینوٹار کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار میں نے اسے دیکھا۔ یہ عفریتوں کا عفریت تھا۔ ایک بھینس کی نسبت ایک سانڈ سے اس کی صورت زیادہ ملتی تھی۔ اس کا انسانی جسم فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا سویا ہُوا ہوا اور محو خواب ہو۔ لیکن کیسا خواب اور کس کا؟''

اس شام میں ریڈ ہاؤس کے قریب سے گزرا۔ جنگلے کا پھاٹک مقفل تھا اور اس کی چند سلاخیں مڑی ہوئی تھیں۔ جہاں کبھی باغ تھا' وہاں جھاڑ جھنکاڑ اگ آیا تھا۔ سیدھے ہاتھ پر ایک کھوکھلی خندق تھی جس کے کنارے بھر چکے تھے۔

اصل میں اب بھی ایک اقدام ایسا تھا جو میں کر سکتا تھا لیکن بہت دنوں تک اسے کرنے سے احتراز کرتا رہا، اس لیے نہیں کہ مجھے یہ یکسر بے فائدہ معلوم ہوا بلکہ اس خدشے کے تحت کہ کہیں یہ مجھے کسی ناگزیر، مطلق صورت حال میں نہ پھنسا دے گا۔

آخر کار کسی خاص امید کے بغیر میں گلیو گیا۔ ترکھان مار یانی جوان برسوں میں ایک فربہ اور سرخ رو اطالوی بن چکا تھا، ایک خوش اخلاق، منکسر المزاج انسان تھا۔ میں نے اسے اپنا تعارفی کارڈ دیا جسے اس نے بہت اہتمام سے جوش کے ساتھ باآواز بلند پڑھا۔ 'پی۔ایچ۔ ڈی' کے الفاظ پڑھتے ہوئے اس کی آواز میں عقیدت مندانہ لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ میں نے بتایا کہ میں اس فرنیچر کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو اس نے ٹورڈیرا کے گھر کے لیے، جو پہلے میرے انکل کی ملکیت تھا، تیار کیا تھا۔ وہ مسلسل بولتا رہا۔ میں اسکے بہت سے (واضح طور پر ہاتھوں کی حرکات کے ساتھ ادا کیے جانے والے) الفاظ کو یہاں بیان کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ ''اس کا مطمح نظر گاہک کے مطالبات کو پورا کرنا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ

کیسے ہی عجیب ہوں، ۔'' اور یہ بھی کہا کہ پھر اس نے ان کے مطابق ہی کام کیا۔

مختلف ڈبوں میں کھنگالنے کے بعد اس نے چند کاغذ نکالے جن کا میں سر پیر بھی نہ سمجھ سکا۔ ان پر معماتی 'شخصیت' پریٹوریس' کے دستخط تھے۔ (بلاشبہ ماریانی مجھے غلطی سے وکیل سمجھ بیٹھا تھا۔) مجھے الوداع کہتے ہوئے اس نے رازداری سے بتایا کہ اگر اسے دنیا بھر کی دولت کا لالچ دیا جائے، پھر بھی وہ کبھی ٹورڈیرا میں قدم نہیں رکھے گا، اس گھر میں تو بالکل نہیں۔ پھر وہ کہنے لگا کہ گاہک تو خدائی مہمان ہوتا ہے۔ لیکن اس کی عاجزانہ رائے میں جناب پریٹوریس صحیح الذہن انسان نہیں تھے۔ پھر یہ تصور کرتے ہوئے کہ میں اس کی بات سمجھ گیا تھا، اس نے انگلی سے پیشانی پر تھپتھپایا۔ پھر جیسے ندامت محسوس کرتے ہوئے کہ وہ کچھ زیادہ ہی کہہ گیا تھا، وہ خاموش ہو گیا۔ میں اس سے مزید کوئی بات معلوم نہ کر سکا۔

میں نے اپنی ناکامی کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا لیکن کسی بات کی پیشین گوئی کرنا اور بات ہے، اور اس کا سامنا کرنا دوسری۔ بار بار میں نے خود سے کہا کہ وقت، گزرا ہوا کل، آج، مستقبل، ابدیت، ایک حقیقی معمہ ہیں۔ ان گہرے تفکرات سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اپنی شام کو شوپن ہار اور رائس کے مطالعے کے لیے وقف کرنے کے بعد میں ابھی تک راتوں کو ریڈ ہاؤس کے آس پاس، گرد آلودہ سڑکوں پر مٹرگشت کرتا۔ کبھی مجھے پہاڑی پر بہت سفید روشنی دکھائی دیتی۔ کبھی لگتا ہے کراہنے کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ سلسلہ جنوری کی انیس تاریخ تک جاری رہا۔

یہ دن بیونس ایریز کے ان دنوں میں سے ایک تھا جب انسان گرمی سے شدید جھنجھلاہٹ اور اہانت ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ اسے حقیقی بے مائگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ رات گیارہ بجے کے قریب شدید طوفان شروع ہوا۔ پہلے جنوبی ہوائیں چلنی شروع ہوئیں اور پھر بارش کی بوچھاڑ، لہریں اور تیز دھارے اترے۔ میں اندھیرے میں ڈر گیا، اور کسی درخت کے سایے کی تلاش میں بھاگا۔ بجلی کے کوندے کی تیز روشنی میں میں نے دیکھا کہ اسی گھر کے جنگلے سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ہوں۔ نہیں جانتا کہ آیا کسی خوف یا امید کے تحت میں نے پھاٹک کو دھکا

دیا۔ وہ غیر متوقع طور پر کھل گیا۔ طوفان کے زور سے گرتا پڑتا میں اندر داخل ہوا۔ آسمان اور زمین مجھے برابر دھکیل رہے تھے۔ گھر کا صدر دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ بارش کا چھینٹا میرے چہرے سے ٹکرایا اور میں اندر گھس گیا۔

اندر فرش کی اینٹیں ادھڑی ہوئی تھیں۔ میرے پیر بھدے پن سے جگہ جگہ اگی گھاس پر پڑ رہے تھے۔ سارے میں میٹھی اور رقے آور بو پھیلی تھی۔ بائیں یا دائیں، میں صحیح طور پر نہیں جانتا کس طرف میں پتھر کی بنی ایک ڈھلوانی سطح سے ٹھوکر کھا گیا۔ فوراً ہی خود کو پیروں پر کھڑا کیا۔ بے اختیار ہی میرا ہاتھ روشنی جلانے کے لیے بٹن کی تلاش میں بڑھا۔

میری یادداشت میں موجود طعام گاہ اور کتب خانہ اب (درمیانی دیوار منہدم ہو جانے کی وجہ سے) ایک بڑے تباہ حال کمرے کی صورت اختیار کر گیا تھا، یہاں وہاں بکھرے مختصر فرنیچر کے ساتھ۔ میں اس منظر کی مرقع کشی کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ وہاں تیز سفید روشنی کے باوجود مجھے یقین نہیں ہے کہ میں نے واقعی وہاں کچھ دیکھا۔ مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنے دیجئے۔ کسی شے کو دیکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے وہ سمجھ میں آ جائے۔ ایک آرام کرسی انسانی جسم، اس کے جوڑوں اور اعضا سے مشابہہ ہے۔ قینچی قطع کے عمل سے مماثل ہے۔ ایک لیمپ یا ایک کار کے متعلق کیا قیاس کیا جا سکتا ہے؟ ایک وحشی انسان مبلغ کی انجیل مقدس کو نہیں سمجھ سکتا۔ ایک مسافر کبھی بحری جہاز کے ساز و سامان کو ویسے نہیں دیکھ سکتا جیسے وہ ملاح کو دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم واقعی دنیا کو دیکھ پائیں تو شاید اسے سمجھ سکیں۔

بے معنی اشکال میں سے، جو اس رات مجھے دکھائی دیں، کوئی ایک بھی کسی انسانی ساخت یا کسی قابل فہم استعمال سے موافق نہیں تھی۔ ان سے مجھے ناگواری اور دہشت محسوس ہوئی۔ ایک کونے میں ایک عمودی سیڑھی دکھائی دی جو بالائی منزل کو جاتی تھی۔ چوڑے آہنی زینے ، جو دس سے زیادہ نہ ہوں گے، بے باقاعدہ وقفوں سے جڑے تھے۔ یہ سیڑھی، جو ہاتھوں اور پیروں سے مشابہہ تھی، مجھے قابل فہم معلوم ہوئی اور کسی حد تک تسکین کا احساس ہوا۔ میں نے بتی

بجھا دی اور کچھ دیر تاریکی میں انتظار کیا۔ کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ لیکن وہاں بہت سی ناقابل فہم اشیاء کی موجودگی نے مجھے بے چین کیا۔ آخر میں نے فیصلہ آگے بڑھنے کا کیا۔

اوپر کی منزل میں خوف سے کپکپاتے میرے ہاتھ پھر سے بتی جلانے کو پھیلے۔ جس دہشت نے زیریں منزل میں مجھے مغلوب کیے رکھا تھا، وہ اوپر کی منزل میں بھی در آئی۔ وہاں بہت سی چیزیں موجود تھیں یا پھر آپس میں گندھی ہوئی تھیں۔ مجھے U کی شکل کا ایک لمبا آپریشن کا میز یاد آتا ہے، خاصا اونچا، دونوں کناروں پر دائروی آغاز کے ساتھ۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کہیں بستر نہ ہو، گھر کے مکین کے استعمال میں آنے والا، جس کی دیو پیکر ہیئت مبہم طور پر اس شے سے ظاہر ہو رہی تھی، جیسے کسی جانور یا دیوتا کی ہیئت اس کے سایے سے متشکل ہو رہی ہو۔

میں نے لوقا کی کسی تحریر میں کئی سال پہلے یہ لفظ پڑھا اور پھر اسے بھول گیا تھا، لیکن اچانک میرے ہونٹوں پر یہ لفظ ''Amphisbaena'' ابھر آیا جو اس شے کا (جسے میرا ذہن کبھی پوری طرح سے سمجھ نہیں پایا) حوالہ بن گیا جسے میں نے بعد میں دیکھا۔ مجھے آئینوں کی 'V' جیسی شکل بھی یاد ہے جو اوپر سایوں میں گم ہو رہے تھے۔

اس گھر کا مکین کیسا ہوگا؟ اس سیارے پر جو اس کے لیے بھی اتنا ہی ہولناک ہوگا، جتنا یہ ہمارے لیے ہے، وہ کیا تلاش کر رہا تھا؟ آسمان یا وقت کے کن خفیہ خطوں سے، اور کس قدیم اور ناقابل پیمائش جھٹ پٹے سے نکل کر وہ شخص اس قیمتی رات اور جنوبی امریکہ کے اس قصبے میں آیا تھا؟

میں نے محسوس کیا کہ اس انتشار میں میں بن بلائے، زبردستی گھس آیا تھا۔ باہر بارش تھم چکی تھی۔ میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ دو بج چکے تھے۔ میں نے بتی یونہی جلتی رہنے دی اور احتیاط کے ساتھ نیچے اترنے لگا۔ جس راستے سے اوپر آیا تھا، اسی سے نیچے اترنا ناممکن نہیں تھا، یعنی مالک مکان کے آنے سے پہلے نیچے اتر جانا۔ میں نے قیاس کیا کہ اس نے صدر دروازہ اور پھاٹک بند نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ یہ کیسے کیا جائے۔

میرے پیر آخری سے پہلی سیڑھی پر ہی تھے جب مجھے موڑ پر کسی شے کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی بھاری بھرکم اور سست رو اور بہت بڑی شے۔ تجسس نے میرے خوف پر غلبہ پایا اور میں نے آنکھیں بند نہ کیں۔

# 'تمیں' کا مسلک

اصل مسودہ لیڈن یونیورسٹی کے کتب خانے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ لاطینی زبان میں ہے۔لیکن اس میں یونانی محاوروں کی آمیزش سے اس مفروضے کو تقویت ملتی ہے کہ اسے یونانی زبان سے ترجمہ کیا گیا۔'لیس گانگ' کے مطابق اسے چوتھی صدی عیسوی میں لکھا گیا۔اپنی کتاب 'انحطاط وزوال' کے پندرھویں باب کے ایک حاشیہ میں گبن نے اس کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔ اس کا گمنام مصنف لکھتا ہے:

''۔۔۔۔۔یہ مسلک کبھی زیادہ نہیں پھیلا۔لیکن اس کے معتقدین بلا شبہ تعداد میں نہایت کم ہیں۔ان کی تعداد کو آگ اور تلوار سے گھٹایا گیا۔وہ سڑک کے کنارے یا کھنڈرات میں، جو جنگوں نے ان کے لیے تیار کیے،سو جاتے ہیں کیوں کہ انھیں قیام گاہیں تعمیر کرنے کی ممانعت ہے۔وہ اکثر بالکل برہنہ حالت میں رہتے ہیں۔ جو باتیں میں یہاں بیان کررہا ہوں،وہ سبھی کے علم میں ہیں۔ میرا مقصد ان تمام باتوں کو یہاں ضبطِ تحریر میں لانا ہے جو اس مسلک کے عقائد اور رسوم ورواج کو دریافت کرنے کے عمل کے دوران مجھے معلوم ہوئیں۔ میں نے اس مسلک کے مذہبی رہنماؤں سے طویل مشاورتیں کیں۔لیکن میں انہیں اپنے عقیدے کی طرف مائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

اس مسلک سے متعلق پہلی اہم شے جس میں مجھے دلچسپی محسوس ہوئی، مُردوں کے بارے میں ان کے عقائد کا تنوع ہے۔ مسلک کے پیروکاروں میں نرے ان پڑھ بھی یہ مانتے ہیں

کہ انھیں ان لوگوں کی ارواح دفن کریں گی جوان سے پہلے یہ زندگی چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ دیگر افراد جوعقیدے سے اتنے جڑے ہوئے نہیں ہیں، کہتے ہیں کہ عیسیٰ مسیح کی یہ فہمائش ''مُردوں کو اپنے مردے دفنانے دو'' تجہیز وتکفین سے متعلق ہماری رسومات کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کی مذمت کرتی ہے۔

اس ہدایت کی کہ جو کچھ کسی کے پاس ہے اسے بیچ دو اور غرباء میں خیرات کر دو، مسلک کے سبھی پیروکار تعمیل کرتے ہیں۔ جو کچھ کسی کو ملتا ہے، وہ اسے دوسروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ جب کہ وصول کرنے والے اس شے کو مزید آگے بانٹ دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے افلاس اور برہنگی کی کافی توجیہ پیش کرتی ہے جب کہ یہ کیفیت انھیں فردوس عدن کے آدم کی بہشت میں صورت حال سے قریب تر کر دیتی ہے۔

بڑے جوش سے وہ یہ الفاظ دہراتے ہیں، ''کووں پر غور کرو۔ نہ وہ زمین میں تخم ریزی کرتے ہیں، نہ پودوں کی صورت نمو پاتے ہیں۔ نہ وہ گودام بناتے ہیں اور نہ غلہ خانے۔ آسمانی باپ ان کو خوراک دیتا ہے۔ ان پرندوں سے تم کتنے بہتر ہو؟'' یہ متن بچت کرنے کی ممانعت کرتا ہے کیوں کہ ''اگر خدا زمین کو گھاس کا لباس عطا کرتا ہے، جو آج میدان ہے، کل اسے بھٹی میں جھونک دیا جائے گا۔ تو کتنا زیادہ وہ تمھیں ملبوس کرے گا، تم جو کمزور عقیدے کے حامل ہو؟ فکر مت کرو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ یا کیا نوش کریں گے، نہ ہی کبھی ذہن میں شک کو گھر کرنے دو؟''

یہ عقیدہ کہ ''جس شخص نے کسی عورت کو بری نظر سے دیکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے چھونے سے پہلے ہی دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا ہوتا ہے'' عصمت وعفت کے حوالے سے ایک نہایت واضح تاکید ہے۔ پھر بھی مسلک کے ایسے پیروکاروں کی تعداد کم نہیں ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں چوں کہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے عورت کو نظر بد انداز سے نہ دیکھا ہو، اس لیے ہم سبھی زنا کاری کے مرتکب ہیں۔ اور چوں کہ بدی کی خواہش، اس کے ارتکاب سے کم سنگین گناہ نہیں ہے، اس لیے نیک باز انسان جہنم کی آگ کا خطرہ مول لیے بغیر خود کو انتہائی بے لگام شہوت کی سپردگی میں دے سکتا ہے۔ یہ مسلک عبادت گاہوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کے

مبلغین کسی پہاڑ، یا دیوار پر چڑھ کر یا بعض اوقات ساحل پر کھڑی کشتی پر تبلیغ کرتے ہیں۔

اس مسلک کے نام کے آغاز سے متعلق مسلسل قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ ایسے ہی ایک قیاس کے مطابق یہ نام ان پیروکاروں کی تعداد کا غماز ہے جواب باقی رہ گئی ہے۔ یہ بات مضحک لیکن پیشین گوئی کا عنصر لیے ہوئے ہے کیوں کہ اس کے کج روعقائد کو آخر ایک دن معدوم ہو کر رہنا ہے۔

ایک اور قیاس اس نام کو کشتی نوح کی اونچائی سے ماخوذ قرار دیتا ہے جو تیس ہاتھ اونچی ہے۔ ایک اور قیاس فلک شناسی کو غلط انداز میں پیش کرتے ہوئے دعوی کرتا ہے کہ یہ نام قمری مہینے میں شامل راتوں کی تعداد پر مبنی ہے۔ ایک قیاس اسے عیسی مسیح کے بپتسمہ لینے پر مبنی قرار دیتا ہے۔ ایک قیاس کے مطابق اسے (حضرت) آدم کی عمر سے اخذ کیا گیا جب وہ سرخ مٹی سے اٹھائے گئے۔ یہ بھی قیاسات ایک جیسے غلط ہیں۔ اتنی ہی غیر معتبر ان تیس دیوتاؤں یا مسندوں کی فہرست ہے جس میں ایک کا نام ابراکس ہے جسے مرغے کے سر، انسانی بازو اور دھڑ اور ایک سانپ کی لپٹی ہوئی دم کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔

میں سچ سے آگاہ ہوں لیکن اس کی وکالت نہیں کروں گا۔ میرے نزدیک فطرت نے اسے لفظ کا گراں مایہ تحفہ مرحمت نہیں فرمایا۔ چلئے دوسرے، جو مجھ سے زیادہ مطمئن ہوں، اس لفظ کے ذریعے مسلک کے اراکین کو بچالیں۔ لفظ یا آگ کے ذریعے۔

خود کو قتل کرنے سے بہتر ہے کہ انسان مارا جائے۔ میں خود کو قابل نفرت بدعت کے بیان تک ہی محدود رکھوں گا۔

'لفظ' کی تجسیم ہوئی تا کہ وہ دوسرے انسانوں کی مانند ہی ایک انسان کا روپ دھار لے، تا کہ انسان اسے صلیب پر ٹانگ سکیں اور اس کے ذریعے نجات پائیں۔ اس کی پیدائش چنیدہ افراد میں شامل ایک عورت کے بطن سے ہوئی، اس لیے نہیں کہ وہ محبت کی انجیل کا پرچار کر سکے، بلکہ اس لیے بھی کہ وہ شہادت حاصل کر سکے۔

یہ ضروری تھا کہ واقعات اپنی ہیئت میں نا قابل فراموش ہوں۔تلوار کے وار یا زہر سے بھرا پیالہ پینے سے ہونے والی ایک انسان کی ہلاکت اتنی اثر انگیز نہیں ہوتی کہ وہ انسانیت کے تخیل پر وقت کے اختتام تک کوئی چرکہ لگائے۔ خدائے بزرگ و برتر کی منشا تھی کہ واقعات دل سوز انداز میں رونما ہوں۔یہی توضیح ہے،عشائے ربانی کی،یسوع مسیح کے ان الفاظ کی جن میں رومنوں کے لیے بھی بخشیش کی فراخی کی پیشین گوئی کی گئی تھی،اپنے حواریوں میں سے ایک کے لیے بار بار کیے جانے والے اشارے کی،روٹی اور شراب مرحمت کیے جانے کی، پیٹر کے وعدوں کی، گتسمین کے باغ میں خاموش عبادت شب کی،بارہ حواریوں کی خوابیدگی کی،خدا کے بیٹے کی انسانی دعا کی،اس کے پسینے جیسے خون کی،تلواروں، بے وفائی کے بوسے، پائیلیٹ،جس نے اس سے ہاتھ دھو لیے، تازیانہ زنی، طعن و تشنیع، کانٹوں کے تاج، ارغوانی قبا اور سرکنڈوں کے عصا،شہد والے سرکہ، پہاڑی کی چوٹی پر ایستادہ صلیب، صالح چور سے کیے گیے وعدے، کپکپاتی زمین اور زمین پر اتر آنے والی تاریکی کی۔

الہامی رحم،جس کی کتنی ہی عنایات کا میں شکر گزار ہوں،کے باعث میں اس قابل ہوا کہ اس مسلک کے نام کی اصل اور مخفی وجہ معلوم کر پاؤں۔ کیری اوتھ میں،جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں اس مسلک کا ظہور ہوا، ایک مجلس منحرفین 'چاندی کے تیس سکے' کے نام سے موجود ہے۔ یہ اس کا ابتدائی نام تھا۔اور اسی سے ہمیں کلیدی سراغ ملتا ہے۔ یسوع کو سولی پر چڑھانے کے المیہ ناٹک میں (اور میں یہ بات تمام تر تقدس اور احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں ) کچھ اداکار دانستہ اور کچھ نادانستہ طور پر شامل تھے،سبھی ضروری،سبھی ناگزیر۔

نادانستہ طور پر شامل اداکار وہ پادری تھے جنہوں نے چاندی کے سکے دیئے۔ نادانستہ اداکار وہ ہجوم بھی تھا جس نے 'باراباس' کا انتخاب کیا۔ نادانستہ اداکار یہودا کا حاکم تھا۔ وہ رومی بھی تھے جنھوں نے صلیب نصب کی جس پر یسوع مسیح کو سولی پر چڑھایا گیا۔جنہوں نے میخیں ٹھونکیں اور قرعہ اندازی کی۔

دانستہ اداکار البتہ دو ہی تھے۔ یہودا اور نجات دہندہ۔ یہودا نے چاندی کے تیس سکے پھینکے جو ہماری روحوں کی نجات کی قیمت تھے اور فوراً ہی خود کو سولی پر چڑھوالیا۔ تب وہ تینتیس سال کا تھا، یسوع مسیح کی عمر کا۔ مسلک کے لیے دونوں ہی ایک سے قابل تعظیم ہیں اور وہ دونوں کو بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ قصوروار کوئی ایک شخص نہیں تھا۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو، شعوری یا غیر شعوری طور پر، سب سے دانا ہستی کے منصوبے کا ایک حصہ نہیں بنتا۔ سبھی انسان اس کی عظمت کا حصہ ہیں۔

میرے ہاتھوں نے لکھنے سے معذرت کرلی جب میں نے مزید تنفر کو تحریر کرنا چاہا۔ مسلک کو آغاز کرنے والے ایک خاص عمر کو پہنچ کر تضحیک کا نشانہ بنائے گئے اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر انھیں صلیب پر لٹکایا گیا تاکہ اپنے آقاؤں کی مثال کی تتبع کی جائے۔ پانچویں امر ربی کے مجرمانہ انحراف کی ایسی ہی سفاکی کے ساتھ مذمت کرنی چاہیے جس کے انسانی اور الہامی قوانین متقاضی ہیں۔ تم پر آسمانی پھٹکار ہو، ملائکہ کی حقارت برسے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

مسودے کا اختتام دریافت نہیں کیا جاسکا۔

# ایک غدار اور ایک سورما کی کہانی

''یوں افلاطونی سال
غلط اور درست کے نئے معیارات اگلتا ہے
اور پرانے معیارات نگل جاتا ہے۔
تمام انسان رقاص ہیں اور ان کے قدم
ایک گھڑیال کی وحشیانہ ٹھن ٹھن پر تھرکتے ہیں''
(ڈبلیو۔بی۔ییٹس۔''مینار'')

(عالیشان سرّی داستانیں ایجاد کرنے اور انہیں سجانے سنوارنے والے) چیسٹرٹن اور (لمحہ تخلیق سے ماقبل موجود توازن کے دریافت کنندہ) محلاتی مشیر لائبنیز کے بدنام اثر تلے اپنی بے کار سہ پہروں میں میں نے اس کہانی کے پلاٹ کا تصور کیا جسے میں شاید کسی روز لکھ پاؤں اور جو مجھے ابھی سے باجواز معلوم ہوتا ہے۔اس کے لیے تفصیلات، تصیحات اور معمولی ترامیم کی ضرورت ہے۔اس کہانی کی چند پرتیں ایسی ہیں جو ہنوز مجھ پر نہیں کھلیں۔آج تین جنوری 1944ء کو مجھے یہ اس طور سمجھ میں آئی ہے:

یہ واقعہ ایک جبر زدہ مگر ایک سرکش ملک میں رونما ہوتا ہے۔جیسے پولینڈ، آئرلینڈ، وینیٹن جمہوریہ، کوئی جنوبی امریکی یا بالکن ریاست۔۔۔۔۔۔یا پھر یہ واقعہ ہو چکا ہے۔اگرچہ راوی میرا

ہم عصر ہی ہے لیکن اس کی بیان کردہ کہانی انیسویں صدی کے آغاز یا وسط میں کہیں وقوع پذیر ہوئی، فرض کیجئے، راوی کی سہولت کی خاطر 1824 میں ۔اور فرض کرلیجئے کہ آئرلینڈ میں ۔راوی کا نام ''ریان'' ہے۔نوجوان، سورماؤں جیسا، خوب صورت، مقتول فرگس کلپیٹرک کا پڑپوتا ہے۔جس کی قبر کی پراسرار طور پر بے حرمتی کی گئی، جس کا نام ہیوگو اور براؤننگ کی شاعری کو چمک عطا کرتا ہے، اور جس کا مجسمہ سرخ دلدلوں کے وسط میں ایک بھورے رنگ کے پہاڑ کی چوٹی پر فروکش ہے۔

کلپیٹرک ایک باغی تھا، باغیوں کے گروہ کا ایک خفیہ اور باوقار کپتان۔(حضرت) موسیٰ کی طرح جنھوں نے موب کی سرزمین سے موعودہ زمین کی جھلک دیکھی لیکن اس تک پہنچ نہیں سکے، کلپیٹرک بھی اس فتح مند بغاوت سے پیشتر ہی مارا گیا جس کی اس نے پیش بندی کی اور خواب دیکھا تھا۔اس کی موت کی اولین صد سالہ برسی قریب ہے۔اس جرم سے جڑے واقعات معماتی ہیں۔

اس سورما کی سوانح حیات لکھنے پر مامور ریان دریافت کرتا ہے کہ یہ معمہ پولیس کی سادہ تفتیش کی حدود سے پرے تک پھیلا ہوا ہے۔کلپیٹرک کا قتل ایک ناٹک گاہ میں ہوا۔ برطانوی پولیس کبھی قاتل کا سراغ نہیں لگا سکی۔مورخین کا خیال ہے کہ یہ ناکامی پولیس کی نیک نامی کو داغ دار نہیں کرتی کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ پولیس ہی نے اسے قتل ہوجانے دیا ہو۔اس معمہ کے دیگر پہلو ریان کو الجھا دیتے ہیں۔ بہت سی باتیں دائروی نوعیت کی ہیں۔وہ دورافتادہ خطوں اور دورافتادہ ادوار کے واقعات کو باہم ملاتی یا دہراتی معلوم ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر کوئی اس بات سے بے خبر نہیں ہے کہ ہیرو کی لاش کا معائنہ کرنے والے افسران کو ایک سربہ مہر خط ملا تھا جس میں ہیرو کو اس رات ناٹک گھر جانے میں مضمر خدشے سے قبل از وقت آگاہ کیا گیا تھا۔ جولیس سیزر کو بھی، اس مقام کی طرف جاتے ہوئے، جہاں اس کے دوستوں کے خنجر اس کے منتظر تھے، ایک رقعہ وصول ہوا تھا جسے اس نے کبھی نہیں پڑھا۔ایک رقعہ جس میں غداری کا پردہ فاش کیا گیا تھا اور ان ناموں کو افشا کیا گیا جو غدار تھے۔ سیزر کی بیوی،

کالپرینا نے خوابوں میں ایک مینار دیکھا تھا جس کو منہدم کرنے کا فرمان مجلس اکابرین نے ہی جاری کیا تھا۔

کلپیٹرک کی موت سے قبل کلگارون کے دائروی مینار کے جل کر بھسم ہونے سے متعلق غلط اور گمنام افواہیں ملک بھر میں گردش کرنے لگی تھیں۔ایک واقعہ جسے ایک پیش آگاہی سمجھا جا سکتا تھا کیوں کہ کلپیٹرک کلگارون میں پیدا ہوا تھا۔سیزر کے قصے اور آئرش باغی کی کہانیوں میں یہ (اور دیگر) متوازی مماثلتیں ریان کو وقت کی ایک خفیہ ہیئت، دہرائے جانے والے عوامل کے ایک ڈھانچہ کی موجودگی کو قیاس کرنے پر مائل کرتی ہیں۔

اس کی سوچ عشری تاریخ کی طرف متوجہ ہوتی ہے جسے کونڈورسٹ نے تصور کیا تھا۔یہ ان صوریات کو فرض کرتی ہے جنہیں ہیگل، سپنگلر اور وائیسو نے تجویز کیا تھا، اور ہیسوئڈ کے نظریہ انسان کو تصور کرتی ہے جو سونے سے لوہے میں ڈھل گیا۔وہ ارواح کے تناسخ کے عقیدے کے متعلق غور کرتا ہے، ایک تصور جس نے کلٹی زبان کے ادب کو دہشت سے مملو کیا اور جسے خود سیزر نے برطانوی قومی انجمن کے عہدیداروں سے منسوب کیا۔وہ اس خیال پر غور کرتا ہے کہ کہ فرگس کلپیٹرک ہونے سے پیشتر، فرگس کلپیٹرک جولیس سیزر تھا۔

ان دائروی بھول بھلیوں سے وہ چند نئے حقائق کی دریافت کے ذریعے نجات حاصل کرتا ہے۔ایک دریافت جو اسے ایک دوسری زیادہ لاینحل اور غیر متجانس بھول بھلیوں میں غرق کر دیتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص الفاظ، جنہیں ایک گداگر نے فرگس کلپیٹرک سے اس کی موت کے روز کہے، شیکسپیئر اپنے المیہ ناٹک ''میکبتھ'' میں پہلے سے لکھ چکا تھا۔یہ خیال کہ تاریخ تاریخ ہی کی نقل ہوتی ہے، اپنے طور پر بہت زیادہ حیران کن تھا۔لیکن تاریخ کا ادب کی نقل کرنا، بالکل ہی ناقابل فہم تھا۔

ریان مزید تحقیق کرتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ 1814ء میں کلپیٹرک کے رفقاء میں سے عمر رسیدہ ترین شخص جیمز الیگزینڈر نولان نے شیکسپیئر کے اہم ناٹکوں کا گائیلک زبان میں ترجمہ

کیا تھا۔ ان میں سے ایک جولیس سیزر بھی تھا۔ اسے آرکائیو میں سویڈش زبان کے ''Festspiele'' پر نولان کے ایک مضمون کا مسودہ بھی ملتا ہے۔ ناٹک میں ادھر اُدھر چل پھر کر اداکاری کرنے کی تکنیک کے لیے ہزارہا اداکاروں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں تاریخی واقعات کو انہی شہروں اور انھی پہاڑوں پر دہرایا جاتا ہے جہاں وہ حقیقتاً رونما ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک دوسری غیر مطبوعہ دستاویز سے اس پر منکشف ہوتا ہے کہ موت سے چند روز قبل کلپیٹرک نے اپنے سرداروں کے آخری اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایک غدار کی موت کے پروانے پر دستخط کیے تھے جس کا نام کھاتوں میں سے حذف کر دیا گیا۔ یہ فرمان کلپیٹرک کی روایتی رحمدلانہ فطرت سے میل نہیں کھاتا۔ ریان اس معاملے کی تفتیش کرتا ہے ( کہ اس کی تفتیش کتاب کے بیانیہ میں موجود خلاؤں میں سے ایک ہے۔ ) اور اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کلپیٹرک کو ایک تھیٹر میں قتل کیا گیا۔ لیکن تمام شہر نے بھی ایک ناٹک گاہ کا کردار ادا کیا اور اداکار فوجی دستے پر مشتمل تھے، اور وہ ناٹک جس میں سب سے قابل ذکر بات اس کی موت کا واقعہ تھی، کئی دن اور کئی راتیں جاری رہا۔

واقعہ کچھ یوں ہوا تھا:

1842ء میں اگست کی دو تاریخ کو باغی اکٹھے ہوئے۔ ملک میں بغاوت کے لیے حالات سازگار تھے۔ لیکن ہر بار کسی طور یہ کوشش ناکام ثابت ہو جاتی تھی۔ داخلی حلقے میں کوئی غدار موجود تھا۔ فرگس کلپیٹرک نے غدار کا سراغ لگانے کی ذمہ داری جیمز نولان کو سونپی۔ نولان نے اپنی ذمہ داری نبھائی۔ اس نے اجلاس میں اعلان کیا کہ غدار خود کلپیٹرک تھا۔ اس نے اپنے الزام کی صداقت کو ناقابل تردید شواہد سے ثابت کیا۔ اجلاس میں موجود باغیوں نے اپنے رہنما کے لیے موت کی سزا تجویز کی۔ اس نے خود اپنی موت کے پروانے پر دستخط کیے لیکن یہ درخواست کی کہ اس سزا سے اس کے ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔

جبھی نولان کو یہ عجیب منصوبہ سوجھا۔ آئرلینڈ کلپیٹرک کی پرستش کرتا تھا۔ اس کی وفاداری پر

معمولی سا شبہ بغاوت کے مقصد کو غارت کر سکتا تھا۔ نولان نے ایک منصوبہ تجویز کیا کہ غدار کی موت کو ملک کی آزادی کے لیے ایک ہتھیار بنایا جائے۔ اس نے تجویز کیا کہ مجرم کا قتل ایک غیر معلوم قاتل کے ہاتھوں خاص طور پر پیدا کردہ ڈرامائی حالات میں ہونا چاہیے۔ یہ حالات عوام کے تخیل میں ثبت ہو جائیں گے اور بغاوت کے عمل کو مہمیز دیں گے۔ کلپیٹرک نے اس منصوبے میں ان کا ساتھ دینے کا عہد کیا جس سے اسے کفارے کا ایک موقع ملے گا اور جس کا انجام اس کی موت کی صورت میں ہوگا۔

نولان کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ اس کثیر المقاصد قتل کے لیے تمام حالات خود سے پیدا کرے۔ اسے ایک دشمن انگریز ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر سے پلاٹ سرقہ کرنا پڑا اور اس نے میکبتھ اور جولیس سیزر سے منظر چرائے۔ اس عوامی اور خفیہ سازش کا نفاذ متعدد دنوں کو محیط تھا۔ مجرم ڈبلن میں داخل ہوا، اس نے مذاکرات کیے، کام کی اداکاری کی، عبادت کی، سرزنش کی، رقت انگیز جملے ادا کیے۔ جب کہ ان میں سے ہر فعل جس نے ہیرو کی عظمت کو بڑھانا تھا، نولان نے ہی پہلے سے متعین کیا تھا۔ سینکڑوں اداکاروں نے ہیرو کی معاونت کی۔ سٹیج پر ان میں سے چند ایک کا کردار پیچیدہ تھا جبکہ باقی کا سرسری۔ جو حرکات انہوں نے کیں اور جو باتیں کہیں، آئرلینڈ کی تاریخ کی کتب اور اس ملک کی پرجوش یادداشت میں باقی رہنی تھیں۔

کلپیٹرک نے، جو انتہائی احتیاط سے وضع کی گئی اپنی قسمت سے تقریباً سرمستی میں سرشار تھا، کہ جس نے بالآخر اس کے جرم کی تلافی کرنا اور اس کی زندگی کو ختم کرنا تھا، ایک سے زائد موقعوں پر فی البدیہ الفاظ اور افعال سے منصف کے مسودے میں اضافے کیے۔ یہ کثیر التعداد اداکاروں والا ناٹک 1824ء کی اگست کی چھ تاریخ کو احاطہ زمان میں ظہور پذیر ہوا جب (لنکن کے لیے پیش آگہی کے ساتھ) ماتمی پردوں سے ڈھکے ناٹک گھر کے باکس میں، ایک انتہائی متوقع گولی غدار کی چھاتی چیر گئی۔ دو زخموں سے خون کے فوری اخراج کے باعث کلپیٹرک بمشکل وہ چند الفاظ کہہ پایا جو اس نے بولنے تھے۔

نولان کے ناٹک میں جو حصے شیکسپیئر سے نقل کیے گئے ہیں، ڈرامائی عنصر سے قریباً عاری ہیں۔ ریان کو شک تھا کہ مصنف نے ان میں تحریف کی تھی تا کہ مستقبل میں شاید کوئی ان کی مدد سے حقیقت کو پا لے۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ خود بھی نولان کے منصوبے ہی کے ایک حصہ کی تکمیل کر رہا تھا۔ طویل اور شدید غور و فکر کے بعد اس نے اپنی دریافت کو اخفاء رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک کتاب شائع کی جسے ہیرو کی عظمت سے منسوب کیا۔ شاید اس واقعہ کی بھی پہلے سے پیشین گوئی کی جا چکی تھی۔

# دوسرا آدمی

یہ واقعہ فروری 1969 میں بوسٹن کے شمال میں کیمبرج میں ہوا۔ تب میں نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا کیوں کہ تب میرا بنیادی مقصد اس بات کو ذہن سے محو کرنا تھا۔ کیوں کہ خطرہ تھا کہ میں کہیں حواس ہی نہ کھو بیٹھوں۔ اب 1972 میں محسوس ہوا کہ اگر اب لکھوں تو لوگ اسے ایک کہانی کے طور پر ہی پڑھیں گے اور میں بھی اس قابل ہوں گا کہ اسے اسی طور دیکھ سکوں۔

میں جانتا ہوں، یہ واقعہ ہوا تو مجھ پر اس کے اثرات کتنے ہولناک تھے، جو اس کے بعد کی بے نیند راتوں میں شدید ترین ہوئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسے سننے والا بھی ایسے ہی کسی احساس کی زد میں آئے گا۔

اس روز صبح دس بجے کا وقت ہوگا۔ میں دریائے چارلس کے کنارے فرحت بھرے انداز میں بنچ پر بیٹھا تھا۔

میرے دائیں طرف کوئی پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک بلند عمارت موجود تھی جس کا نام مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ بھورے پانی پر برف کے بڑے قتلے تیر رہے تھے۔ ناگزیر طور پر دریا سے مجھے وقت کا خیال آیا۔ ہیراقلیتس کی بیان کردہ قدیم شبیہ۔ میں اس رات خوب سویا تھا اور گزشتہ شام کو میں نے جو لیکچر دیا تھا، میرے خیال میں اس میں طلبا نے دلچسپی لی تھی۔

وہاں آس پاس کوئی نفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ معاً مجھے لگا (ماہرین نفسیات کے مطابق ایسی کیفیت شدید تھکاوٹ کا شاخسانہ ہوتی ہے) کہ یہ لمحہ مجھ پر پہلے بھی گزر چکا ہے۔ کوئی میرے

بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اکیلا رہنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایک دم سے اٹھ کر چلے جانے سے کسی پر میرے مردم بے زار ہونے کا برا تاثر پڑے۔ دوسرا شخص سیٹی بجا رہا تھا۔ بس تبھی مجھے ان ذہنی دھچکوں میں سے پہلا دھچکہ لگا جو وہ خاص صبح مجھے پیش کرنے والی تھی۔

وہ سیٹی کے ذریعے جو دھن بجا رہا یا بجانے کی کوشش کر رہا تھا، ( کہ مجھ سے کبھی کوئی دھن یاد نہیں ہو پائی ) وہ ارجنٹائن کے معروف ایلئس ریگولیز کے میلونگا گیت 'La Tapera' کی تھی۔ اس گیت سے مجھے بیونس ایریز میں ایک گھر کے آنگن کی یاد آئی جو بہت پہلے مسدود ہو چکا تھا اور الویرو میلیئن لیفینز کی یاد تازہ ہوئی جو کئی سال پہلے فوت ہوا تھا۔ پھر اس گیت کے الفاظ میرے ذہن میں گونجے۔ یہ ڈیسیما شاعری کے الفاظ تھے جن سے یہ گیت شروع ہوتا۔ آواز الوارو کی نہیں تھی بلکہ اس کی نقل کی گئی تھی۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اسے پہچان لیا۔

میں اس آدمی طرف مڑتے ہوئے بولا ''تمھارا تعلق یوراگوئے سے تو نہیں ہے یا ارجنٹائن سے۔''

''ارجنٹائن۔ لیکن میں 1914ء سے جنیوا میں ہوں۔'' اس کا جواب تھا۔

تا دیر خاموشی چھائی رہی۔ تب میں نے دوسرا سوال کیا ''گلی کے پار سترہ مالاگنو میں، روسی آرتھوڈوکس چرچ کے پاس۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر'' میں نے مستقل مزاجی سے سوال کیا، ''تمھارا نام خورخے لوئیس بورخیس ہے۔ میرا نام بھی خورخے لوئیس بورخیس ہے۔ یہ 1969 ہے، کیمبرج شہر۔''

''نہیں''، اس نے معمولی بے اعتنائی سے، میری جیسی ہی آواز میں کہا۔ ''میں یہاں جنیوا میں 'رہون' دریا سے چند قدم کے فاصلے پر ایک بنچ پر بیٹھا ہوں۔''

لمحہ بھر توقف کے بعد وہ بولا ''یہ عجیب ہے کہ ہم ایک دوسرے جیسے لگتے ہیں۔ لیکن آپ عمر رسیدہ ہیں۔ آپکے بال بھی سفید ہیں۔''

''میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں''، میں نے جواب دیا۔''میں تمھیں وہ باتیں بتاؤں گا جو ایک اجنبی نہیں جان سکتا۔ ہمارے گھر میں 'ماتے' پینے کا ایک چاندی کا پیالہ ہے جس کے پیندے میں سانپ بنے ہوئے ہیں۔ اسے ہمارے پردادا نے پیرو سے خریدا تھا۔ چاندی کا ہی ایک منہ دھونے کا تسلا بھی ہے جوان کے گھوڑے کی زین کے ساتھ ٹنگا رہتا تھا۔ تمھارے کمرے کی الماری میں کتابوں کی دو قطاریں ہیں۔ لین کی ترجمہ کردہ 'الف لیلہ و لیلہ' کی تین جلدیں پڑی ہیں جنھیں لین 'عرب کی راتوں کی تفریح' کہتا تھا۔ ابواب کے درمیان سٹیل کے نقش کھدے ہیں اور عمدہ کاغذ پر حواشی درج ہیں۔ کوئچرات کی لاطینی زبان کی لغت اور ٹیسی ٹس کی کتاب 'جرمانیا' لاطینی زبان میں اور گورڈن کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ، گیئر کا چھپا ہوا 'کیخوتے'، ریورا اندارتے' کی کتاب 'Tablas de Sangre'، جس پر مصنف کے دستخط ہیں، کارلائل کی 'Sartor Resartus'، ایمیل کی سوانح عمری، اور دوسری کتابوں کے پیچھے چھپی ہوئی پیپر بیک کتاب بالکن کے باشندوں کی جنسی رسوم پر۔ نہ ہی مجھے پلازہ ڈوبورگ کی دوسری منزل کے اپارٹمنٹ میں وہ سہ پہر کبھی بھول سکتی ہے۔''

''ڈوفورگ'' اس نے میری اصلاح کی۔

''ہاں، ڈوفورگ۔'' میں نے کہا،''کیا اتنی معلومات کافی ہیں؟''

''نہیں'' اس نے جواب دیا،''آپ کی ان باتوں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اگر میں آپ کو خواب میں دیکھ رہا ہوں تو پھر یہ قدرتی بات ہے کہ آپ کو ان تمام باتوں کا علم ہوگا جو مجھے معلوم ہیں۔ آپ کی طویل صفحوں والی فہرست بالکل ناکارہ ہے۔''

اس کے اعتراض میں دم تھا۔ میں نے جواب دیا''اگر یہ صبح، اور ہماری یہ ملاقات دونوں کسی خواب کا حصہ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم میں سے ہر کوئی سوچ رہا ہوگا کہ وہ اکیلا ہی یہ خواب دیکھ رہا ہے۔ شاید ہم خواب دیکھنا موقوف کر دیں، شاید نہ کریں۔ اس دوران ہماری واضح ذمہ داری یہ ہے کہ اسے قبول کر لیں جیسے ہم دنیا کو، اس میں اپنی پیدائش، اور اس حقیقت کو

تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور یہ کہ ہم سانس لیتے ہیں۔''

''لیکن اگر یہ خواب ختم ہو جائے تو۔۔'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

اسے اور خود اپنے آپ کو بھی مطمئن کرنے کے لیے میں نے اپنے لہجے میں اعتماد کی رمق پیدا کی جس سے میں کوسوں دور تھا۔

''میرا خواب'' میں نے اسے بتایا، ''ستر سال پرانا ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں، جب کوئی بیدار ہوتا ہے تو جس شخص سے وہ ملتا ہے، وہ خود ہی ہوتا ہے۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے، سوائے اس کے کہ ہم دو ہیں۔

کیا تم میرے ماضی کے بارے میں جاننا نہیں چاہو گے جو دراصل اب تمھارا منتظر مستقبل بھی ہے۔''

اس نے کچھ کہے بغیر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے قدرے ہچکچاہٹ سے اپنی بات جاری رکھی ''ماں ٹھیک ٹھاک ہے۔ بیونس ایریز میں چارکس اور میپو کے پاس خوش و خرم رہتی ہے۔ لیکن میرا باپ تیس ایک برس پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اسے دل کی بیماری تھی۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ جب اس نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے داہنے ہاتھ پر رکھا، تو یہ جیسے کسی دیو کا ہاتھ تھا جو ایک بچے کے ہاتھ پر گرا ہو۔ اسے موت کا بے صبری سے انتظار رہا، کسی حرف شکایت کے بغیر۔ ہماری دادی بھی اسی گھر میں فوت ہوئی۔ مرنے سے کئی روز پہلے اس نے ہم سب کو اکٹھا کیا اور بولی ''میں ایک بوڑھی، بہت بوڑھی عورت ہوں، آہستگی سے مر رہی ہوں۔ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جو ایسی عمومی، معمولی بات پر جیسی کہ یہ ہے، شور مچائے۔''

تمہاری بہن نورا کی شادی ہوئی اور اس نے دو بچوں کو جنما۔ تمہارے گھر سب کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔ والد صاحب ویسے ہی مذہب کے خلاف چٹکلے سناتے ہیں۔ کل رات وہ بولے کہ یسوع مسیح جنوبی امریکہ کے کاؤبوائے 'گاؤچو' کی مانند تھے جو کبھی کوئی وعدہ نہیں کرتے

اس لیے انھوں نے تمثیلی کہانیوں کی صورت میں تبلیغ کی۔"

لمحہ بھر کے لیے اس نے کچھ سوچا اور بولا "اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم کتنی کتابیں لکھو گے۔ لیکن اتنا علم ہے کہ وہ کافی ہوں گی۔ تم نظمیں لکھو گے جس سے تمھیں ایسا تلذذ ملے گا جسے دوسرے صحیح طور پر محسوس نہیں کر پائیں گے، اور تخیلاتی کہانیاں لکھو گے۔ تم ایک استاد بنو گے، اپنے باپ اور خاندان کے کئی دوسرے افراد کی طرح۔"

مجھے خوشی تھی کہ اس نے مجھ سے کتابوں کی کامیابی اور ناکامی کی بابت استفسار نہیں کیا۔ میں نے اپنا لہجہ بدلا "جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے تو وہی پرانے دشمن پھر سے بھڑ گئے۔ فرانس نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ انگلستان اور امریکہ نے جرمن آمر 'ہٹلر' کے خلاف جنگ لڑی، واٹرلو کی دائروی جنگ۔ بیونس ایریز نے 1946ء میں ایک اور 'روساس' کو جنم دیا جو اس سے پہلے کے ہمارے 'روساز' سے ملتا جلتا تھا۔ 1955 میں قرطبہ کی حکومت نے ہماری اعانت کی جیسے پہلے اینتر ے ریوس نے کی تھی۔ اب حالات بدتر ہیں۔ روس دنیا پر غلبہ حاصل کر رہا ہے۔ امریکہ 'جمہوریت' کے توہم کی وجہ سے لڑکھڑاہٹ کا شکار اور ایک سلطنت بن جانے کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ خود ہمارا ملک ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ دقیانوسی ہوتا جا رہا ہے، کہیں زیادہ دقیانوسی اور زیادہ خودستائش۔ جیسے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہوں۔ مجھے حیرت نہیں ہوگی، اگر ہمارے مدرسوں میں لاطینی کی بجائے گورانی زبان پڑھائی جانے لگے۔"

مجھے احساس ہوا کہ وہ بمشکل مجھے سن پا رہا تھا۔ ایک غیر ممکن، مگر حقیقت میں رونما ہو جانے والی صورت حال کی دہشت اس پر غالب تھی، اور اس کے حوصلے پست تھے۔ میں جو کبھی باپ نہیں بنا، اس بے چارے نوجوان لڑکے کے لیے محبت کی لہر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا، جو مجھے میرے اپنے سگے بیٹے سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ہاتھ میں ایک کتاب پکڑ رکھی تھی۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہا تھا۔

"'آسیب زدہ' یا جیسا میرے خیال میں زیادہ بہتر نام ہے "شیاطین" دوستوئیفسکی

کا۔'' اس نے کسی طرح کی رعونت کے بغیر جواب دیا۔

''اب مجھے یہ ناول صاف یاد نہیں ہے۔ کیا واقعی یہ اچھا ہے؟'' الفاظ میری زبان کی نوک پر تھے جب یہ احساس ہوا کہ یہ سوال گستاخانہ تھا۔

وہ بناوٹی لہجے میں بولا ''وہ عظیم روسی ادیب کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت سلاوک قوم کی نفسیات کو زیادہ گہرائی میں جانتا تھا۔''

مجھے یہ خطیبانہ اعلان اس بات کا ثبوت معلوم ہوا کہ وہ اپنا اعتماد بحال کر چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ دوستوئیفسکی کی کون سی دوسری تحریریں وہ پڑھ چکا تھا۔ اس نے دو تین کا ذکر کیا جن میں ایک ناول بھی شامل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کیا ان ناولوں کو پڑھتے ہوئے وہ کرداروں کو اتنی آسانی سے شناخت کر لیتا ہے جیسا جوزف کانرڈ کے ناولوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ اور کیا وہ دوستوئیفسکی کی سبھی تحریریں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے؟

''سچ تو یہ ہے کہ نہیں۔'' اس نے کچھ تعجب سے کہا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ خود آج کل کیا لکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ نظموں کی ایک کتاب ترتیب دے رہا تھا جسے وہ ''سرخ مناجات'' کا نام دے گا۔ اس کے لیے 'سرخ دھنیں' یا 'سرخ گیت' کے عنوانات بھی زیر غور تھے۔

''کیوں نہیں'' میں نے کہا ''اس کے لیے مستند حوالے دیئے جا سکتے ہیں۔ روبن ڈاریو کی نیلی شاعری اور رورلین کے خاکستری گیت۔''

میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنی بات کی وضاحت کی کہ یہ کتاب انسانی بھائی چارے کا ایک گیت ہوگی۔ آج کا شاعر اپنے دور کے حالات سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ میں نے اس بارے میں کچھ دیر سوچا اور پھر پوچھا کہ کیا واقعی وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ہر زندہ شخص کے ساتھ بھائی چارے کے رشتے میں جڑا ہوا تھا۔ جیسے ہر تابوت بردار، جیسے ہر ڈاکیہ، ہر سمندری غوطہ خور، اور ہر وہ شخص جو گلی کے جفت نمبروں والے گھروں میں رہتا ہے، وہ

سب جن کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی (یہ فہرست یونہی بڑھائی جاسکتی ہے)۔اس نے جواب دیا کہ اس کی کتاب محروم اور راندہ درگاہ طبقے سے متعلق ہے۔

''یہ محروم اور راندہ درگاہ طبقے،''میں نے کہا،'' ایک تجرید کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔صرف افراد موجود ہیں۔یعنی اگر یہ مانا جائے کہ کوئی واقعی موجود ہے تو۔کسی یونانی کا قول ہے کہ''کل کا انسان، آج کا انسان نہیں ہے۔''ہم دونوں کا،جنیوا یا کیمبرج میں اس بنچ پر ہونا،اس بات کا ثبوت ہے۔''

سوائے تاریخ کے درشت صفحات کے، یادگار واقعات، شاندار الفاظ کے بغیر ہی یاد رکھے جاتے ہیں۔موت نزدیک ہو تو انسان اس کنندہ عبارت کو بھی یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی جھلک اس نے اپنے بچپن میں دیکھی ہو۔جنگ میں جانے والے سپاہی کیچڑ یا اپنے سارجنٹ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ہم دونوں کی صورتحال انوکھی ہے،اور سچ تو یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ہم نے ناگزیر طور پر ادب پر گفتگو کی۔مجھے شک ہے کہ میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جو میں رسمی طور پر صحافیوں کو بتاتا ہوں۔میری دوسری ذات متخیلہ ہے، تخلیق پسند، نئی علامتوں کی دریافت کی متلاشی۔میں خود بھی ان علامتوں پر یقین رکھتا ہوں جو قریبی اور وسیع پیمانے پر تسلیم شدہ مشابہتوں سے موافق ہیں،اور جنھیں ہمارا تخیل پہلے ہی تسلیم کر چکا ہے۔ بڑھاپا اور موت، خواب اور زندگی' سیل وقت اور سیل آب۔میں نے نوجوان کو اس رائے سے آگاہ کیا جسے وہ خود ہی برسوں بعد ایک کتاب میں بیان کرنے والا تھا۔لیکن وہ مجھے سن ہی نہیں رہا تھا۔

معاً وہ بولا،''اگر واقعی آپ میرا مستقبل ہیں، تو پھر آپ کیسے یہ بھول گئے کہ آپ 1918ء میں ایک بوڑھے سے ملے تھے، جس نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ بھی بورخیس ہے۔''

میں نے اس مشکل سوال پر پہلے غور نہیں کیا تھا۔''شاید اس لیے کہ یہ واقعہ اتنا عجیب تھا کہ میں نے اسے فراموش کرنے کی کوشش کی ہو۔''میں نے تفکر کے ساتھ جواب دیا۔

لڑکے نے قدرے جھینپتے ہوئے سوال کیا،''آپ کا حافظہ کیسا ہے؟''

مجھے احساس تھا کہ ایک لڑکے کے لیے جو ابھی بیس برس کا بھی نہ ہوا ہو، ستر سے زائد برس کا بوڑھا عملی طور پر ایک لاش تھا۔

''یہ اکثر نسیان سے ملتی جلتی بات ہوتی ہے''۔ میں نے کہا، ''لیکن پھر بھی ان باتوں کو ضرور یاد کر لیتا ہوں جنھیں یاد کرنا چاہوں۔ میں اینگلو سیکسن ادب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور اپنی جماعت میں کسی سے پیچھے نہیں ہوں۔''

تب تک ہماری گفتگو اتنی طویل ہو چکی تھی کہ وہ خواب میں ہونے والی گفتگو نہیں لگتی تھی۔ اچانک مجھے ایک خیال سوجھا۔

''میں ابھی اسی لمحے یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ تم مجھے خواب میں نہیں دیکھ رہے ہو''۔ میں بولا، ''اس مصرعہ کو سنو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، تم نے اسے پہلے کبھی نہیں سنا۔''

تب آہستگی سے میں نے یہ معروف مصرعہ پڑھا۔'' L' Hydreunivers
''tordant son corps caille d'astres''

مجھے اس کے چہرے پر خوف زدگی کا تاثر محسوس ہوا۔ اس نے دھیمی آواز میں مزہ لیتے ہوئے مصرعے کے ہر چمک دار لفظ کو دہرایا۔

''ہاں، یہ سچ ہے'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ''میں ایسا مصرعہ کبھی نہیں لکھ سکتا۔''

وکٹر ہیوگو نے ہم دونوں کو ملا دیا تھا۔

مجھے اب یاد ہے اس سے کچھ ہی دیر پہلے اس نے پر جوش انداز میں وٹمین کی مختصر نظم پڑھی تھی جس میں شاعر ساحل سمندر پر گزاری ایک رات کا ذکر کرتا ہے۔ ایک رات جس میں وٹ مین واقعی بہت مسرور تھا۔

''وٹمین نے اس لیے یہ گیت گایا'' میں نے رائے دی ''کیوں کہ وہ ایسی رات کا خواہش مند تھا۔ مگر یہ رات کبھی رونما نہیں ہوئی۔ یہ نظم عظمت کے درجہ کو چھوتی ہے، اگر ہم اسے ایک شاعر کی خواہش کے طور پر پڑھیں نہ کہ حقیقی واقعہ کی روداد کے طور پر۔''

اس نے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھا۔

''آپ اسے نہیں جانتے'' اس نے جوش سے کہا۔

''وٹ مین جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔''

نصف صدی اپنا نشان چھوڑے بغیر نہیں گزری تھی۔ ہماری گفتگو کے پس منظر میں، مختلف نوع کے مطالعہ اور متنوع مزاجوں کے حامل دو افراد کی گفتگو جاری تھی، کہ مجھے لگا ہم کوئی مشترک بات تلاش ہی نہیں کر سکتے۔ ہم اتنے مختلف تھے کہ ایک جیسے ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو دھوکہ دے ہی نہیں سکتے تھے اور اس سے ہمارا مکالمہ دشوار ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا مضحک خاکہ تھے۔ یہ کیفیت اتنی غیر فطری تھی کہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

ایک دوسرے کو نصیحت کرنا بے کار تھا، نہ حجت کرنا ہی سود مند۔ کیوں کہ لڑکے کا ناگزیر مقدر وہ شخص بننا ہے جو کہ میں ہوں۔ اچانک مجھے کولرج کی نظم یاد آئی۔ ایک شخص خواب دیکھتا ہے کہ وہ جنت میں ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ ثبوت کے طور پر اسے ایک پھول دیا جائے گا۔ بیدار ہونے پر اسے پھول پڑا ملتا ہے۔ مجھے اس سے ملتے جلتے طریقے کا خیال سوجھا۔

''سنو'' میں نے کہا، ''تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟''

''ہاں'' اس نے جواب دیا، ''بیس فرانک کے لگ بھگ۔ میں نے سائمن کو آج رات کروکوڈائل میں کھانے پر مدعو کیا ہے''۔

''سائمن سے کہنا کہ وہ 'کاروگ' میں طب کی پریکٹس کرے گا۔ خوب نام کمائے گا۔ اب مجھے اپنے سکوں میں سے کوئی ایک دو''۔

اس نے تین نقرئی اور کئی دوسرے چھوٹے سکے جیب میں سے نکالے۔ ان میں سے ایک سکہ نقرئی سکہ میری طرف بڑھایا۔ وہ میری بات نہیں سمجھا تھا۔ بری طرح سے بنائے گئے امریکی ڈالروں میں سے، جو اپنی مختلف مالیت کے باوجود ایک ہی حجم کے تھے، میں نے اسے ایک نوٹ دیا۔ اس نے اشتیاق سے اس کا معائنہ کیا۔

''ناممکن'' اس نے قدرے بلند آواز میں کہا، ''اس پر 1964ء لکھا ہے۔ (کئی مہینوں بعد کسی نے مجھے بتایا کہ بنک نوٹوں پر سن نہیں لکھا ہوتا۔)

''یہ سب کچھ، ایک معجزہ ہی ہے۔'' وہ اتنا ہی کہہ پایا ''اور معجزے خوف پیدا کرتے ہیں۔ جس نے مردہ کوڑھی شخص لیزارس کا دوبارہ زندہ ہونا دیکھا تھا، وہ ضرور دہشت زدہ ہوا ہوگا۔''

ہم معمولی سا بھی نہیں بدلے۔ میں نے سوچا۔ ہمیشہ حوالہ کسی کتاب کا دیں گے۔ اس نے بل کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور سکے واپس اپنی جیب میں ڈالے۔

مجھے وہ سکہ، جو اس نے مجھے دیا تھا، دریا میں پھینک دینے کی خواہش ہوئی۔ دریا میں غائب ہوتی ہوئی سکے کی نقرئی قوس میری کہانی کو ایک واضح امیج دیتی۔ لیکن قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ اگر کوئی ماورائے عقل واقعہ دوبارہ ہو، تو یہ دہشت ناک نہیں رہتا۔ میں نے تجویز کیا کہ ہم اگلے دن پھر سے ملیں گے، اسی بنچ پر، جو دو وقتوں میں اور دو جگہوں پر واقع ہے۔ وہ فوراً متفق ہوگیا۔ پھر اپنی گھڑی کو دیکھے بغیر بولا کہ، اسے دیر ہو رہی تھی، اسے جانا ہوگا۔ ہم دونوں ہی جھوٹ بول رہے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کے جھوٹ سے آگاہ تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ کوئی مجھے لینے آرہا تھا۔

''آپ کو لینے۔؟'' وہ بولا۔

''ہاں جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو اپنی بصارت تقریباً مکمل طور پر کھو دو گے۔ پھر تم زرد رنگ کو دیکھ سکو گے اور روشنی اور سایے۔ لیکن فکر مت کرو۔ بتدریج بڑھتا اندھاپن کوئی عذاب نہیں ہے۔ یہ گرمیوں کے آہستگی سے پھیلتے اندھیرے کی طرح ہوتا ہے۔''

ایک دوسرے کو چھوئے بغیر ہم رخصت ہوگئے۔ اگلے روز میں وہاں بنچ پر نہ گیا۔ وہ بھی غالباً وہاں نہ آیا ہوگا۔ اس ملاقات پر، جس سے متعلق میں نے کسی کو نہیں بتایا، میں نے بہت غور و خوض کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں۔ ملاقات حقیقی تھی لیکن وہ

دوسرا شخص مجھ سے خواب میں مخاطب تھا۔ اسی لیے وہ مجھے فراموش کر بیٹھا۔ میں نے واقعتاً بیداری کی حالت میں اس سے مکالمہ کیا تھا۔ اسی لیے اس کی یاد مجھے بے چین کیے دیتی ہے۔

دوسرے شخص نے مجھے خواب میں دیکھا لیکن خواب میں مجھے واضح طور پر نہیں دیکھا۔ میں اب محسوس کرتا ہوں کہ اس نے اس ڈالر بل پر ناممکن تاریخ پڑھ لی تھی۔

------------------------------

# پیراسیلسس کا گلاب

ڈی کوئینسی، تحریریں، XIII، 345‘

اپنی تجربہ گاہ میں جس کے لیے تہہ خانہ کے دو کمرے مختص کیے گئے تھے، پیراسیلسس نے خدا سے دعا مانگی، اپنے غیر معین خدا سے، کسی بھی خدا سے، کہ اسے شاگرد کی نعمت سے بہرہ یاب کرے۔ رات اتر رہی تھی۔ آتش دان میں جلتی آگ کمرے میں بے قاعدہ سایے بھر رہی تھی۔ روشنی پیدا کرنے میں آہنی لالٹین کو بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ پیراسیلسس دن بھر کی تھکان کے ساتھ غائب الدماغ ہو چلا تھا اور عبادت اسے بھولی ہوئی تھی۔ رات دھندلی ہوتی حاضر دماغی اور آتش دان کو ہڑپ کر رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ نیند کے خمار میں وہ اٹھا، مختصر چکردار زینے پر چڑھا، اور دوہرے پٹوں والے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔

ایک اجنبی اندر داخل ہوا۔ وہ بھی تھکا ماندہ معلوم ہوتا تھا۔ پیراسیلسس نے ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شخص وہاں بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر ان میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

تب آقا نے خاموشی کا سحر توڑا۔ ”مجھے مغرب کے چہرے اور مشرق کے چہرے یاد ہیں۔“ وہ خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ بولا، ”لیکن آپ کا چہرہ یاد نہیں آتا۔ آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میرے نام کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔“ دوسرا شخص گویا ہوا، ” آپ کے گھر تک آنے کے لیے مجھے تین دنوں اور تین راتوں کا سفر کرنا پڑا ہے۔ متمنی ہوں کہ اپنی شاگردی میں قبول

فرمایئے۔ جو بھی میری ملکیت تھی، وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے لایا ہوں۔''

اس نے ایک بٹوہ آگے بڑھایا اور اس میں موجود سامان میز پر الٹ دیا۔ بہت سے سکے تھے اور وہ سونے کے تھے۔ ایسا اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے کیا۔ پیرا سیلسس نے اپنی پیٹھ لالٹین کی طرف کرلی۔ وہ پھر سے مڑا تو دیکھا کہ اس شخص کے بائیں ہاتھ میں گلاب تھا۔ گلاب کو دیکھ کر اس کی طبیعت مکدر ہوئی۔

وہ کچھ پیچھے جھکا، اپنی انگلیوں کی پوروں کو آپس میں جوڑا اور بولا، ''تم سمجھتے ہو کہ میں ایسا پتھر بنانے پر قادر ہوں جو ہر شے کو سونے میں تبدیل کرسکتا ہے۔ اسی لیے تم سونا لائے ہو۔ لیکن مجھے سونے کی جستجو نہیں ہے اور اگر یہ سونا ہی ہے جس میں تمھیں دلچسپی ہے تو پھر تم کبھی میرے شاگرد نہیں بن سکتے۔''

''سونے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' دوسرے شخص نے جواب دیا، ''یہ سکے محض میری خواہش کے اشارے ہیں کہ میں آپ کے کام کا حصہ بن جاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ فن سکھائیں۔ میں آپ کے ساتھ اس راستے پر سفر کرنا چاہتا ہوں جو اس 'پتھر' تک جاتا ہے۔''

''یہ راستہ ہی وہ پتھر ہے۔ یہ نقطہ انقطاع ہی وہ پتھر ہے۔ اگر یہ الفاظ تم سمجھ نہیں پا رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ابھی سمجھنا شروع ہی نہیں کیا۔ ہر قدم جو تم اٹھاتے ہو، وہ تمھیں اس مقصد کی طرف لے جاتا ہے جس کی تمھیں جستجو ہے۔'' پیرا سیلسس نے یہ الفاظ آہستگی سے ادا کیے۔ دوسرے شخص نے اسے شبہے کی نظر سے دیکھا۔

''لیکن'' وہ بولا، جب کہ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا، ''تو پھر کیا کوئی مقصد نہیں ہے؟''

پیرا سیلسس ہنسا۔

''میرے بدگو جو تعداد میں بہت زیادہ ہیں، گو حماقت میں بھی کچھ کم نہیں، کہتے ہیں کہ کوئی مقصد نہیں ہے اور مجھ پر فریب کاری کا الزام تھوپتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ وہ غلطی پر ہیں،

حالاں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ میں ہی کسی فریب کا شکار ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک راستہ موجود ہے۔"

دونوں خاموش ہو گئے اور تب دوسرا شخص گویا ہوا، "میں آپ کے ساتھ اس راستے پر چلنے کے لیے تیار ہوں، چاہے یہ سفر برسوں پر محیط ہو۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں صحرا کو عبور کروں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ چاہے دور ہی سے سہی، میں اس موعودہ سرزمین کا نظارہ کرلوں چاہے ستارے مجھے اس تک پہنچنے سے روکیں۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ سفر کے آغاز سے پہلے میں کوئی ثبوت حاصل کرلوں۔"

"کب؟" پیراسیلسس نے ناگواری سے کہا۔

"اسی وقت" شاگرد فیصلہ کن انداز میں بولا۔

انھوں نے اپنی گفتگو لاطینی زبان میں شروع کی تھی لیکن اب وہ جرمن زبان میں بات کررہے تھے۔

نوجوان نے گلاب کو فضا میں بلند کیا۔ "آپ کی وجہ شہرت یہ ہے" وہ بولا، "کہ آپ اپنے فن کے جادو سے گلاب کو جلا کر خاکستر اور اسے پھر سے پیدا کرسکتے ہیں۔ میں اس غیر معمولی وصف کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے بس یہی چاہتا ہوں اور اس کے بدلے میں اپنی پوری زندگی آپ کی بھینٹ کردوں گا۔"

"تم ضعیف الاعتقاد ہو۔" آقا نے کہا، "مجھے ضعیف الاعتقادی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے عقیدے کی ضرورت ہے۔"

دوسرے شخص نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"صرف اس لیے کہ میں ضعیف الاعتقاد نہیں ہوں، میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں گلاب کا خاتمہ اور اس کی پیدائش نو۔"

"تم ضعیف الاعتقاد ہو۔" اس نے دہرایا، "تم نے کیا کہا کہ میں اسے تباہ کرسکتا

ہوں؟''

''ہر شخص اسے تباہ کرنے کی شکتی رکھتا ہے۔'' شاگرد نے کہا۔

''تم غلط کہتے ہیں۔'' آقا نے جواب دیا، ''کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ کسی شے کو نیستی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ جنت میں پہلا آدم ایک پھول کو تباہ کرنے کی اہلیت کا حامل تھا، گھاس کی ایک پتی کو ہی سہی۔''

''ہم کسی جنت کے مکین نہیں ہیں۔'' نوجوان نے کھردرے انداز میں کہا، ''اس تحت قمری دنیا میں تمام اشیا فانی ہیں۔''

پیرا سیلسس اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

''اگر جنت میں نہیں تو پھر ہم کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا، ''کیا تمھیں یقین ہے کہ خدا اس اہل ہے کہ کوئی ایسی جگہ تخلیق کر سکے جو جنت نہ ہو؟ کیا تمھیں یقین ہے کہ زوال، اس کے علاوہ کسی بات کا اشارہ ہے کہ ہم یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ہم جنت میں ہیں؟''

''ایک گلاب کو جلایا جا سکتا ہے۔'' شاگرد نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔

''یہاں ابھی تک کچھ آگ باقی ہے۔'' پیرا سیلسس نے آتش دان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''اگر تم اس گلاب کو شعلوں کی نذر کر دو تو یقین کر لو گے کہ یہ جل چکا ہے اور یہ کہ اس کی راکھ حقیقی ہے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ گلاب لافانی ہے، اور یہ کہ صرف اس کی ظاہری حالت ہی تبدیل ہوتی ہے۔ میرے ایک لفظ پر ہی تم اسے پھر سے دیکھ پاؤ گے۔''

''ایک لفظ؟'' شاگرد نے الجھتے ہوئے پوچھا، ''آتش دان سرد ہو چکا ہے، اور کانچ کے کیف پر گرد کی تہہ چڑھ چکی ہے۔ اسے پھر سے پیدا کرنے کے لیے تم کیا کرو گے؟''

پیرا سیلسس نے آنکھوں میں بھری اداسی کے ساتھ اسے دیکھا۔

''آتش دان سرد ہے۔'' اس نے تائید میں سر ہلایا، ''اور کیف گرد سے اٹ چکے ہیں۔ اپنے طویل سفر کے اس حصے میں دوسری طرح کے آلات میرے زیر استعمال رہتے ہیں۔''

''میں یہ پوچھنے کی جرات نہیں کروں گا کہ کیسے آلات۔'' دوسرے شخص نے عاجزانہ انداز میں یا زیرکی کے ساتھ کہا۔

''میں اس آلے کی بات کر رہا ہوں جسے خدا نے آسمانوں اور زمین، اور دکھائی نہ دینے والی جنت کو تخلیق کرنے کے لیے استعمال کیا جس میں ہم موجود ہیں۔ لیکن جسے بنیادی گناہ نے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا۔ میں 'لفظ' کی بات کر رہا ہوں جس سے آگاہی ہمیں کبالہ کے علم کے ذریعے ہوئی۔''

''میں آپ سے پوچھتا ہوں،'' شاگرد سرد مہری سے گویا ہوا، ''کیا آپ اتنی مہربانی فرمائیں گے کہ مجھے اس گلاب کے غائب ہونے اور پھر سے پیدا ہونے کا مظاہرہ دکھائیں۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ آپ یہ کام قرنبیق کی مدد سے کریں یا 'لفظ' کی مدد سے۔''

پیراسیلسس نے کچھ دیر اسے بغور جانچا اور پھر بولا، ''اگر میں وہ کر لوں جو تم مجھ سے چاہتے ہو تو کہو گے کہ یہ ایسی ظاہری کیفیت ہے جو میرے جادو نے تمھاری آنکھوں کے سامنے پیدا کی۔ یہ معجزہ بھی تم میں وہ یقین پیدا نہیں کر پائے گا جس کی تمھیں خواہش ہے۔ تو پھر گلاب کو ایک طرف رہنے دو۔''

نوجوان نے شک بھرے انداز میں اسے دیکھنا جاری رکھا۔ پیراسیلسس نے اپنی آواز بلند کی۔ ''اور تم ہوتے کون ہو کہ ایک آقا کے گھر میں داخل ہو جاؤ اور اس سے معجزہ کرنے کا تقاضہ کرو؟ ایسے تحفے کا اہل ہونے کا دعویٰ آخر کس بھرتے پر؟''

دوسرے شخص نے کانپتے ہوئے جواب دیا، ''میں جانتا ہوں کہ میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ یہ سب کچھ تو میں ان برسوں کے عوض کہہ رہا ہوں جو میں آپ کی زیر نگرانی مطالعہ کرنے میں صرف کروں گا۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں راکھ اور پھر اس میں سے گلاب کا ظہور ہوتے دیکھ سکوں۔ اس سے زیادہ کا میں مطالبہ نہیں کروں گا۔ میں اپنی آنکھوں کی گواہی پر یقین کر لوں گا۔''

اس نے مجسم اور قرمزی رنگ کے گلاب کو جھپٹ لیا جسے پیرا سیلسس نے میز پر رکھ چھوڑا تھا اور اسے آتش دان کے شعلوں کی طرف اچھالا۔ اس کے رنگ غائب ہو گئے، اور جو کچھ باقی بچا وہ محض راکھ کی ننھی ڈھیری تھی۔ ایک غیر متعین لمحے کے لیے اس نے الفاظ کی آمد کا انتظار کیا اور معجزے کا بھی۔ پیرا سیلسس ساکت بیٹھا رہا۔ اس نے عجیب سادگی کے ساتھ کہا، "بیسل میں تمام معالج اور تمام دوا ساز کہتے ہیں کہ میں فریبی ہوں۔ شاید وہ درست کہتے ہوں۔ یہاں راکھ ہے، جو کبھی گلاب تھی۔ اور یہ اب مزید گلاب نہیں رہی۔"

نوجوان پشیمان تھا۔ پیرا سیلسس ایک عطائی تھا یا محض ایک صاحب کشف، جب کہ وہ ایک مداخلت کار، اس کے دروازے سے گزر کر ہی اندر آیا اور اس سے مصر ہوا کہ وہ اعتراف کرے کہ اس کے جادوئی علوم جعلی تھے۔

وہ آقا کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور بولا، "میں نے جو کچھ بھی کیا، وہ ناقابل معافی ہے۔ مجھ میں اس عقیدے کی کمی ہے جس کی خدا ہر ماننے والے سے مانگ کرتا ہے۔ تو پھر مجھے راکھ دیکھتے رہنے کی اجازت دیجیے۔ میں دوبارہ واپس آؤں گا جب زیادہ مضبوط ہو جاؤں گا اور میں آپ کا شاگرد بن جاؤں گا اور اس 'راستے' کے اختتام پر گلاب کا نظارہ کروں گا۔"

وہ حقیقی جذبے کے ساتھ بولا لیکن یہ جذبہ اصل میں ترحم کا جذبہ تھا جو وہ اپنے عمر رسیدہ آقا کے لیے محسوس کر رہا تھا۔ اتنا قابل احترام، جس پر میں نے سخت تنقید کی، اتنا معروف اور اس لیے اتنا کھوکھلا۔ وہ کون تھا، جوہنز گرسباخ، جس نے اپنے گناہ گار ہاتھوں سے یہ دریافت کیا تھا کہ نقاب کے پیچھے کچھ نہیں تھا۔

سونے کے سکے وہاں چھوڑ دینے کا مطلب غریب کو خیرات دینے کے مترادف ہوگا۔ واپس جاتے ہوئے اس نے انھیں پھر سے اٹھا لیا۔ پیرا سیلسس زینے کے سرے تک اس کے ساتھ آیا اور بولا اس گھر میں اسے ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔ دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں گے۔

پیراسیلسس پھر سے تنہا ہوگیا۔ لالٹین بجھانے اور اپنی شکستہ کرسی کی طرف لوٹنے سے پہلے، اس نے مٹھی بھر نفیس راکھ کو ہتھیلی میں سے مقعر میں ڈالا اور ایک لفظ سرگوشی میں بولا۔ گلاب پھر سے ظاہر ہوگیا۔